بہنوں کا اپنا ماہنامہ
نومبر 2018
شعاع

پہلی شعاع	رضیہ جمیل	10
حمد	ڈاکٹر بلال جعفری	11
نعت	سرمد مظاہری	11
نبی ﷺ کی باتیں	ادارہ	12

انٹرویو

سائرہ رضا سے ملاقات	شاہین رشید	17
دستک	شاہین رشید	250
جب تجھ سے ناتا	ف،ح	32

ناول

شام کی حویلی میں	رخسانہ نگار عدنان	34
شہرزاد	صائمہ اکرم	202

مکمل ناول

اس برس برسنے دو	حیا بخاری	114
کڑی دھوپ	فرح بھٹو	82
پھول منڈی	فرزانہ کھرل	174

ناولٹ

مبتلائے ملال کر	مدیحہ سعید	152
اجالا سویرا	حمیرا عروش	222

افسانے

یارِ دل دار	افشین نعیم	60
گمشدہ محبت	میمونہ صدف	68
زہرِ طلب	نوشین فیاض	109
نظرِ بد	عندلیب زہرا	76
بیٹری اور زنجیر	حبیبہ انجم	148

غزلیں

غزل	احمد مشتاق	240
غزل	احسان دانش	241
غزل	کرن حنا	240
نظم	وقار احمد امر	241

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلے کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	25
مسکراہٹیں	ادارہ	242
آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	248
باتوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	244
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	247
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	255
موسم کے پکوان	خالدہ جیلانی	257
خوبصورت بنئے	ادارہ	258

نومبر 2018
جلد 33 شمارہ 3
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

Visit https://www.caretofun.net/ for more novels and digests

رخسانہ جیلانی

شعاع نومبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

خواب کتنے ہی دلکش کیوں نہ ہوں، جب سفاک حقیقتیں سامنے آتی ہیں تو ان کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ عظمت کے دعوے کرنا بہت آسان ہے لیکن حقیقی عظمت صرف ان ہی کو ملتی ہے جو اہلیت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ جو محنت، کوشش اور جہد مسلسل پر یقین رکھتے ہیں۔ کسی بھی چیز پر تنقید بہت سہل ہے کسی کی خامیوں اور کمی کی نشان دہی بہت آسان کام ہے لیکن اس کو سنوارنا، اس کمی، خامی کو دور کرنا نہ آسان ہے اور نہ ہی فوری طور پر ممکن ہو سکتا ہے۔

فریب کارانہ بازی گری اور محض لفاظی سے حالات کی پردہ پوشی ممکن نہیں۔ بھوکے پیٹ کو الفاظ کی کرشمہ سازی سے نہیں بہلایا جا سکتا۔ تپتی دھوپ میں جلتے کھلے آسمان تلے اپنے وطن میں بے زمین لوگوں کے لیے قانونی جواز کوئی معنی نہیں رکھتے خواہ وہ کتنے ہی جائز کیوں نہ ہوں۔

تبدیلی قدرت کا اٹل قانون ہے۔ ہر لمحہ، ہر آن دنیا آگے بڑھ رہی ہے لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ ستر سال گزر جانے کے باوجود ہمارے حالات نہیں بدل سکے ہیں۔ آگے بڑھنا تو در کنار، ہم تو جہاں تھے وہاں بھی نہیں ہیں۔ بے یقینی، بے اعتمادی اور انتشار کا عمل بڑھتا جا رہا ہے۔

اس صورت حال میں جو چیز سب سے زیادہ مایوس کن ہے وہ یہ ہے کہ اہل اقتدار کو نہ ان ہمہ جہت بحرانوں کا شعور ہے اور نہ ہی اب تک کوئی واضح حکمت عملی سامنے آئی ہے۔ توجہ طلب امور بے شمار ہیں لیکن کار بے کار پر ساری توجہ صرف کی جا رہی ہے۔ کار بے کار پر توجہ مبذول کرانے کی یہ مشقت وقتی طور پر کامیاب ہو سکتی ہے لیکن اس کے دیرپا اثرات ممکن نہیں۔ جلد یا بدیر حالات کو بدلنے کے لیے سنجیدہ کوشش کرنا ہوگی۔

موجودہ حالات میں بہتر یہی ہے کہ حقیقت کو تسلیم کریں۔ سچ سوچیں، سچ بولیں اور سچ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں۔

اس شمارے میں،

- حیا بخاری کا مکمل ناول۔ اس برس رہنے دو،
- فرح بھٹو کا مکمل ناول۔ کڑی دھوپ کی مسافت،
- فرزانہ کھرل کا مکمل ناول۔ پھول منڈی،
- مدیحہ سعید اور حمیرا عروش کے ناولٹ،
- رخسانہ نگار عدنان اور صائمہ اکرم کے ناول،
- میمونہ صدف، انشین نعیم، عندلیب زہرا، نوشین فیاض اور حبیبہ انجم کے افسانے،
- باصلاحیت ڈراما نگار، ناول نگار سائرہ رضا سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین کے تجربات،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

تو ہے فہم بشر سے وراء الورا
کوئی تیری حقیقت کو پا نہ سکے

تیرے دست تصرف میں ارض و سما
تیرے لکھے کو کوئی مٹا نہ سکے

تیرے نور سے روشن ہیں شمس و قمر
ترے حسن کا پرتو ہے شام و سحر

ترے محتاج ہیں سارے جن و بشر
تیرے آگے کوئی سر اٹھا نہ سکے

جس کو ٹھکرائے اس کو ملے نہ پناہ
تو جو پکڑے تو کوئی بچا نہ سکے

ذرے ذرے سے تیری قدرت عیاں
کوئی پردہ بھی جس کو چھپا نہ سکے

ڈاکٹر ہلال جعفری

اللہ رے یہ حسن سفر کیسا لگے گا
معراج کی منزل پہ بشر کیسا لگے گا

یوں نخل عقیدت کا ثمر کیسا لگے گا
سجدوں سے میرے آپ کا در کیسا لگے گا

اک صاحب اسریٰ کے تصور میں شب غم
گرتا ہوا دامن پہ گہر کیسا لگے گا

جب لوٹ کے آؤں گا مدینے کے سفر سے
میں کیسا لگوں گا مرا گھر کیسا لگے گا

بیمار الم آپ کا اے جان مسیحا
جب ہو گی شب غم کی سحر کیسا لگے گا

جس ہاتھ سے لکھوں گا محمد کا قصیدہ
اس ہاتھ میں جبریل کا پر کیسا لگے گا

سرمد منظاہری

ادارہ

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں

فخر کرنے اور ظلم وزیادتی کے ارتکاب سے ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”تم اپنی بابت پاکیزگی کا مت دعویٰ کرو، تم میں سے جو پرہیز گار ہیں ان کو وہ خوب جانتا ہے۔“ (سورۃ نجم۔۳۲)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بے شک ملامت کے لائق وہ لوگ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ (الشوریٰ ۴۲)

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے میری طرف اس بات کی وحی فرمائی ہے کہ تم عاجزی اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور نہ کوئی کسی دوسرے کے مقابلے میں فخر کرے۔“ (مسلم)

فائدہ: اللہ نے کسی کو مال ودولت اور جاہ ومنصب یا حسن وجمال یا علم وفضل عطا کیا ہو تو یہ اس پر اللہ کا احسان ہے، اس کو اللہ کے حکم کے مطابق تواضع اور عاجزی اختیار کرکے اللہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان نعمتوں سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہیے نہ کہ فخر وغرور کا اظہار کرکے اللہ کی ناشکری اور لوگوں پر ظلم وزیادتی کا ارتکاب کرے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب کوئی آدمی یہ کہے کہ لوگ تباہ ہوگئے تو وہ ان میں سب سے زیادہ تباہ ہونے والا ہے۔“ (مسلم)

امام نووی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: لیکن یہ کہنا کہ لوگ تباہ ہوگئے، اس شخص کے لیے منع ہے جو اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھے، لوگوں کو حقیر گردانے اور ان پر اپنے آپ کو برتر خیال کرے، یہ حرام ہے، لیکن جو شخص یہ اس لیے کہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں میں دین داری کم ہوگئی ہے اور اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے (دینی غیرت کی وجہ سے) یہ الفاظ اس کی زبان پر آجائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

مسلمانوں کے آپس میں تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھنے کے حرام ہونے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”مومن تو بھائی بھائی ہیں، چنانچہ اپنے دو (لڑے ہوئے) بھائیوں میں صلح کرادو۔“ (الحجرات ۱۰)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”گناہ اور زیادتی (کے کاموں) میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔“ (المائدہ۔۲)

فائدہ آیات:

لڑائی اور ترک تعلق، مقتضائے اخوت کے خلاف ہے، اس لیے مسلمانوں کو باہم لڑے ہوئے مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ مومنانہ اخوت برقرار رہے۔ بغیر کسی سبب شرعی کے بول چال بند رکھنا بھی گناہ اور زیادتی ہے، اس لیے اس کی حوصلہ افزائی بھی گناہ پر تعاون ہے جس سے مسلمانوں کو روک دیا گیا ہے۔ بلکہ ایسے موقعوں پر ضروری ہے کہ صلح کرادی جائے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تم ایک دوسرے سے تعلق منقطع نہ کرو، نہ ایک دوسرے سے منہ موڑو (پیٹھ دکھاؤ) نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو، نہ آپس میں حسد کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھے۔“ (بخاری ومسلم)

فائدہ:

حدیث میں مذکور تمام باتیں ممنوع ہیں، اس لیے کہ یہ سب اخوت کے منافی ہیں، جب کہ مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اخوت اسلامیہ کو برقرار رکھیں۔

حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین راتوں سے زیادہ تعلق منقطع رکھے۔ دونوں کا آمنا سامنا ہو تو یہ اس سے اور وہ اس سے منہ پھیر لے۔ اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔“ (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل:

1۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لیے اس میں فطری امور ومعاملات کی مناسب حد تک رعایت رکھی گئی ہے۔ جب دو مسلمانوں میں کسی وجہ سے لڑائی جھگڑا ہو جائے تو طبیعت میں انقباض وتکدر کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے جس کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے سے بولنا اور تعلق قائم رکھنا پسند نہیں کرتے۔ شریعت نے اس فطری انقباض کو تسلیم کیا اور تین دن تک بول چال بند رکھنے کی اجازت دے دی لیکن زیادہ ... تعلق ... بغض وعداوت کا باعث بنتا ہے جس سے معاشرتی فساد میں اضافہ، رشتے داریوں میں مستقل رخنہ اور دوستانہ تعلقات میں شدید خلل پیدا ہوتا ہے، اس لیے عارضی تلخی وکشیدگی کو تین دن سے زیادہ برقرار رکھنے سے روک دیا گیا۔

2۔ سلام میں پہل کرنے کی فضیلت بیان کرکے دوبارہ تعلقات استوار کرنے کا ایک آسان طریقہ بھی تجویز فرمادیا، کیونکہ سلام سے محبت میں اضافہ اور بات چیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”ہر سوموار اور جمعرات کو (بارگاہ الٰہی میں) اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کے گناہ معاف فرمادیتا ہے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو سوائے اس شخص کے کہ اس کے اور اس کے بھائی کے درمیان دشمنی اور کینہ ہو تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ان دونوں کو چھوڑ دو، یہاں تک کہ یہ صلح کرلیں۔“ (مسلم)

فائدہ:

بغیر کسی سبب شرعی کے آپس میں دشمنی رکھنا مغفرت الٰہی سے محرومی کا باعث ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا۔

”شیطان یقیناً اس بات سے مایوس ہوگیا ہے کہ نمازی جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں گے، مگر ان کے درمیان فساد ڈالنے میں (وہ کامیاب رہے گا۔“) (مسلم)

فوائد ومسائل:

1۔ یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ہے کہ نبی ﷺ کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی کہ مسلمان آپس میں لڑیں گے، جھگڑیں گے اور باہم تعلقات منقطع کرلیں گے اور یہ کام شیطان کی شرارت، اس کی انگیخت اور وسوسہ اندازی کی وجہ سے ہوگا۔

2۔ نمازیوں سے مراد مسلمان ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے تعلق منقطع رکھے۔ چنانچہ جو شخص تین دن سے اوپر تعلق منقطع کیے رکھے گا اور اسی حالت میں اسے موت آگئی تو وہ جہنم میں جائے گا۔“ (اسے ابوداؤد نے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو بخاری کی شرط پر ہے۔)

فائدہ:

جہنم میں یہ دخول بطور سزا کے ہوگا۔ سزا بھگتنے کے بعد اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا کیونکہ ہمیشہ جہنم میں رہنا صرف کافروں کے لیے ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلمان جو چاہے کرلے، وہ بطور سزا بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ ایسا سمجھنا غلط ہے۔

حضرت ابوخراش حدرد بن ابی حدرد اسلمی اور بعض کے نزدیک سلمی، صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ”جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی سے ایک سال تک تعلق منقطع رکھے گا تو اس کا یہ عمل، اس کا خون بہانے کے برابر ہے۔“ (اسے ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ ترک تعلق بھی ایک طرح سے معنوی قتل ہے، جس سے دوسرے مسلمان کو سخت ذہنی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اسے قتل کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

2۔ بول چال یا ترک تعلق صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو، مثلاً: کوئی شخص بدعتی ہے، یا کھلم کھلا فسق و فجور کا ارتکاب کرتا ہو، سمجھانے کے باوجود وہ اپنی بدعت یا فسق و فجور سے باز نہ آئے تو ایسے شخص سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بول چال بند کر دینا اور تعلق منقطع کر لینا جائز بلکہ مستحب ہے تاکہ اسے عبرت و نصیحت ہو اور اس طرح شاید وہ باز آجائے۔ لیکن محض دنیوی رنجشوں کی وجہ سے تین دن سے زیادہ تعلق منقطع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مومن سے تین دن سے اوپر تعلق منقطع کیے رکھے۔ چنانچہ اگر اسی حالت میں تین دن گزر جائیں تو چاہیے کہ اس سے ملاقات کر کے اسے سلام کرے، اگر اس نے سلام کا جواب دے دیا تو دونوں ثواب میں شریک ہوگئے اور اگر اس نے (کشیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے) سلام کا جواب نہ دیا تو وہ گناہ گار رہا اور سلام کرنے والا ترک تعلق کے گناہ سے نکل گیا۔“ (اسے امام ابوداؤد نے حسن سند سے روایت کیا ہے، نیز انہوں نے فرمایا: اگر ترک تعلق اللہ کے لیے ہو تو پھر اس میں کوئی گناہ نہیں۔)

تیسرے آدمی کی اجازت کے بغیر دو آدمیوں کا باہم سرگوشی کرنا منع ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”سرگوشی کرنا تو شیطان کی طرف سے ہے۔“ (المجادلہ۔ ۱۰)

فائدہ آیات:

چند افراد ایک ساتھ ہوں یا ہم سفر ہوں، ایسے مقام اور موقع پر دوسروں کو چھوڑ کر، صرف دو آدمیوں کا باہم رازدارانہ انداز میں گفتگو کرنا نجویٰ (سرگوشی) ہے جس کی ممانعت ہے، کیونکہ اس سے دوسروں کی دل آزاری ہوتی ہے یا وہ بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب تین آدمی ہوں تو تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں۔“ (بخاری و مسلم)

اسے ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے کہ اور اس میں ابوصالح (راوی) نے یہ زیادہ بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا۔ ”اگر چار آدمی ہوں تو؟“ انہوں نے جواب دیا: ”اس میں تیرے لیے کوئی حرج نہیں۔“

اور اسے امام مالک نے مؤطا میں عبداللہ بن دینار سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ”میں اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خالد بن عقبہ کے اس مکان کے پاس تھے جو بازار میں ہے۔ چنانچہ ایک آدمی آیا جو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سرگوشی کرنا چاہتا تھا۔ اور حضرت ابن عمر کے ساتھ میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ حضرت ابن عمر نے ایک دوسرے آدمی کو بلایا، یہاں تک کہ ہم چار آدمی ہوگئے تو انہوں نے مجھ سے اور اس تیسرے آدمی سے، جس کو انہوں نے بلایا تھا فرمایا: تھوڑا پیچھے ہٹ جاؤ، اس لیے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ”ایک کو چھوڑ کر دو آدمی باہم سرگوشی نہ کریں۔“

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں بعض آداب مجلس کا بیان ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک چوتھے آدمی کو اس لیے بلایا تاکہ آپ اس شخص کی بات سن لیں جو آپ سے علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ آپ نے دو آدمیوں کو تھوڑا پیچھے کر دیا تاکہ سرگوشی کرنے والے کی کوئی بات وہ نہ سن سکیں۔

2۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ آدمیوں کی موجودگی میں دو آدمی آپس میں سرگوشی کر سکتے ہیں، البتہ چار آدمی ہوں تو تین سرگوشی کریں اور چوتھے کو الگ رکھیں، یہ ممنوع ہے، علاوہ ازیں یہ ممانعت جائز باتوں میں ہے۔ ورنہ شرکی باتوں میں تو سرے سے سرگوشی کی اجازت ہی نہیں ہے، چاہے تیسرا آدمی نہ بھی ہو۔

قرآن کریم میں ہے: ”اے ایمان والو جب تم آپس میں سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی کے کاموں اور رسول کی نافرمانی میں سرگوشی نہ کرو!“ (المجادلۃ: 958)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب تم تین آدمی ہو تو تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی سرگوشی نہ کریں، یہاں تک کہ تم لوگوں میں مل جل جاؤ، اس لیے کہ ایسا کرنا اس (تیسرے آدمی) کو غمگین کر دے گا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں ممنوعہ سرگوشی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے ایک مومن کو تکلیف ہوتی ہے اور مومن کو ایذا پہنچانا سخت گناہ ہے۔ اس بنا پر یہ سرگوشی حرام کے درجے میں ممنوع ہے۔ البتہ جب تینوں افراد لوگوں میں مل جل جائیں تو پھر دو شخص آپس میں جس طرح چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔

بغیر شرعی عذر کے یا حد ادب سے زیادہ غلام، جانور، بیوی اور اولاد کو سزا دینا ممنوع ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اور ماں باپ، رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتے دار (یا قریب کے) پڑوسی، دور کے پڑوسی، ہم نشین، ساتھی اور مسافر کے ساتھ حسن سلوک کرو اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے غلام ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔“ (نساء ۳۶)

فائدہ آیت:

ان تمام قسم کے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم ہے جس کا مطلب ہے کہ کسی کے ساتھ بھی ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے جو حسن سلوک کے منافی ہو اور بغیر کسی شرعی عُذر کے کسی کو سزا دینا یا ادب سکھانے کے لیے مارنے کی ضرورت پیش آجائے تو ضرورت سے زیادہ مارنا بھی اس لیے ممنوع ہے کہ یہ حسن سلوک کے منافی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ اس نے اسے قید کر دیا تھا حتیٰ کہ وہ مر گئی، چنانچہ وہ اس کی وجہ سے جہنم میں گئی۔ نہ اس نے اسے کھلایا پلایا جب کہ اس نے اسے قید کر رکھا تھا اور نہ اسے اس نے چھوڑا کہ وہ خود زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ حیوانات کے ساتھ بھی نرمی، حسن سلوک ضروری ہے، سنگ دلی کا مظاہرہ حرام ہے۔

2۔ جانوروں کو قید کر کے پنجرے وغیرہ میں رکھنا جائز ہے، بشرطیکہ ان کی خوراک اور دیگر ضروریات کا خیال رکھا جائے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مراد ہے کہ ان کا گزر قریش کے چند نوجوانوں کے پاس سے ہوا جو ایک پرندے کو نشانہ بنائے اسے تیر مار رہے تھے اور پرندے کے مالک سے یہ طے کیا تھا کہ ہر چوک جانے والا تیر اس کا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا تو منتشر ہو گئے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: ایسا کام کس نے کیا ہے؟ اللہ اس پر لعنت کرے جس نے ایسا کام کیا ہے۔ بے شک رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو کسی جان دار چیز کو نشانہ بنائے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: کسی جان دار چیز کو تختۂ مشق بنا کر اسے تیروں وغیرہ کا نشانہ بنانا کبیرہ گناہ ہے، اس کا مرتکب ملعون ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (قتل یا نشانے کے لیے) جانوروں کو باندھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

اس کا مطلب ہے کہ قتل کرنے کے لیے اسے قید کر دیا جائے۔

فائدہ:

باندھ کر یا قید کر کے مارنے کا مطلب ہے کہ اسے باندھ کر پھر تیروں یا گولیوں وغیرہ سے اسے نشانہ بنایا جائے حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جانور کو قابو کر کے اس کے گلے پر تیز چھری پھیری جائے تا کہ اسے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

حضرت ابو علی سوید بن مقرن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میں مقرن کے ساتھ بیٹوں میں سے ساتواں تھا (ہم سات بھائی تھے) ہماری ایک ہی کنیز تھی۔ اسے ہمارے سب سے چھوٹے بھائی نے طمانچہ مارا تو ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم اسے آزاد کر دیں۔ (مسلم)

ایک اور روایت میں ہے: میں اپنے بھائیوں کا ساتواں تھا۔

فائدہ:

مملوک (غلام اور نوکر چاکر) کو بلا وجہ مارنا پیٹنا اور اس پر زیادتی کرنا سخت جرم ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے۔ یا پھر کسی دوسرے طریقے سے اسے راضی کیا جائے، ورنہ عنداللہ زیادتی کرنے والا مجرم ہوگا۔ یہ ساتوں بھائی صحابی اور مہاجر تھے۔

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہا تھا کہ میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی:

''خبردار، اے ابو مسعود!'' مگر میں غصے کی حالت میں ہونے کی وجہ سے آواز کو نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ جب وہ (آواز دینے والا) میرے قریب ہوا تو دیکھا کہ وہ تو رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے:

''خبردار! اے ابو مسعود! اللہ تعالیٰ تجھ پر اس سے کہیں زیادہ قادر ہے جتنا تو اس غلام پر ہے۔'' میں نے کہا: ''اس کے بعد میں کبھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا۔''

ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار

سائرہ رضا سے ملاقات

شاہین رشید

جس طرح تین گھنٹے کی فلم کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی تیاری میں کتنے ماہ و سال لگے، اسی طرح ایک رائٹر کتنی جدوجہد کے بعد اپنا مقام بنا سکا، ہمیں نہیں معلوم ہوتا۔ بے شک لکھنے کی صلاحیت خداداد ہوتی ہے مگر اپنی صلاحیتوں کو لوگوں سے منوانا بہت مشکل کام ہے۔

''سائرہ رضا'' آج کی مقبول افسانہ و ناول نگار اور ڈرامہ رائٹر ہیں۔ مگر انہیں آپ کے دلوں میں گھر کرنے میں کتنا وقت لگا، یہ جانیں گے ان سے باتیں کر کے......

''کیا حال ہیں سائرہ؟''

''جی اللہ کا شکر ہے۔''

''ماشاء اللہ...... اللہ تعالیٰ نے بڑا نام اور بڑی عزت دی ہے۔ یہ سب کچھ کتنے سالوں کی جدوجہد کا ''ثمر'' ہے؟''

''لکھنے کا عمل تو کم عمری سے ہی جاری ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ ثمر بھی ساتھ ساتھ ملتا ہی رہا۔ ہر کام کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔''

''بالکل...... بہت سی باتیں ہوں گی، لیکن پہلا بنیادی سوال کہ آپ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیں؟''

''بنیادی طور پر ہمارا پنجابی بیک گراؤنڈ ہے۔ میرے والد کا تعلق سیالکوٹ کے گاؤں شکر گڑھ سے ہے۔ والد بہت کم عمری میں یتیم ہو گئے تھے تو پھر ان کا خاندان کراچی آ گیا۔ اسی طرح والدہ بھی کم عمری میں یتیم ہو گئی تھیں اور جب میرے ماموں کو پنجاب یونیورسٹی میں جاب مل گئی تو ان کا خاندان لاہور شفٹ ہو گیا اور جب میرے والد سے شادی ہوئی تو وہ کراچی آ گئیں۔ میں بھی کراچی میں ہی پیدا ہوئی مجھے کراچی سے بہت پیار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں گندگی بہت ہے اور میں کہتی ہوں کہ ''اگر یہ شہر میری ہتھیلیوں میں سما سکتا تو میں اسے ''چوم چاٹ'' کے صاف کر دیتی۔ کیونکہ مجھے یہ بہت پیارا ہے......

خیر......

میری امی گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتی تھیں اور والد ٹیکسٹائل ڈیزائنر تھے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ میں بڑی ہوں، پھر محمد تیمور رضا، محمد احمد رضا اور چھوٹی بہن حمیرا رضا۔ ہماری فیملی میں سب پڑھے لکھے اور ملازمت پیشہ لوگ تھے۔ ننھیال میں سب کا رجحان تعلیم کی طرف تھا جب کہ ددھیال میں سب کا رجحان بزنس کی طرف تھا۔ لیکن پڑھائی سب کی پہلی ترجیح ہوتی تھی۔

ہاں ادب اور شاعری سے لگاؤ صرف مجھے ہی تھا۔ میں نے گریجویشن سرسید گرلز کالج سے کیا اور پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کی ڈگری کراچی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ میرا سسرال وہاڑی میں ہے اور وہاں اکثر میرا جانا آنا لگا رہتا ہے۔''

''بچپن کیسا گزرا؟''

''بہت اچھا اور بھرپور بچپن گزرا۔ شرارتی تو میں نہیں تھی لیکن اس زمانے میں جتنے بھی کھیل کھیلے جاتے تھے، وہ سب میں نے کھیلے۔ دوستوں کے گھر جانے کی بہت شوقین تھی۔ دوپہر کو جب امی اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر آرام کرنے کے لیے لیٹتی تھیں تو میں اپنی چھت پر جا کر بہت مہارت کے ساتھ پڑوسیوں کی چھت پر چھلانگ مار کر اپنی دوستوں کے یہاں چلی جاتی تھی اور شام چھ سات بجے گھر آ جاتی تھی۔

امی ابھی بھی یاد کرتی ہیں تو کہتی ہیں کہ مجھے پتا

ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ کب گئی اور کب گھر آئی اور بھی پتا بھی چل جاتا اور امی ڈھونڈتی ہوئی میری دوست کے گھر آئیں تو میری دوست کہہ دیتی کہ وہ تو کب کی چلی گئی ہے اور میں بیڈ کے نیچے چھپ جایا کرتی تھی۔

بھائیوں سے بڑے اچھے تعلقات رہے۔ میرا ایک بھائی مجھ سے صرف ”تین سو پینسٹھ“ دن چھوٹا ہے تو ہماری بہت دوستی تھی اور ہماری شکلیں بھی ایک جیسی تھیں اور میں اس کی شرارتوں میں اس کے ساتھ ساتھ ہوتی تھی اور کہتی تھی کہ اگر مجھے اپنے ساتھ نہیں ملایا تو شکایت لگا دوں گی اور مینڈک کے بچے جنہیں ہم مچھلیاں سمجھتے تھے، جب لینے جاتے تھے تو میں بھائیوں کو کہتی کہ میں اپنا جالی کا دوپٹہ تب دوں گی جب آپ مجھے ساتھ لے جائیں گے کیونکہ پانی میں جالی کا دوپٹہ ڈالتے تھے تو مینڈک کے بچے آجاتے تھے جال سمجھ کر۔

پیر توڑنے بھائیوں کے ساتھ جاتی تھی۔ تیمور بھائی نے مجھے سائیکل چلانا سکھائی اور بس پھر سائیکل میرے پاس ہی رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ اکثر پچھتاتا تھا کہ اسے کیوں سکھادی۔

گڑیوں سے کھیلنا، ان کا جہیز بنانا، ان کی شادی کرنے کا بہت شوق تھا۔ ہمارے آج کے بچوں کا بچپن اتنا بھرپور نہیں گزرتا جتنا ہمارا گزرا تھا۔ آٹھ سال سے لے کر بارہ سال کی عمر تک ان کھیلوں میں اور شرارتوں میں میری ذات کے حوالے سے بھی مجھ میں ایک چینج آنا شروع ہو گیا تھا اور وہ چینج یہ تھا کہ مجھے نونہال اور بچوں کی چار آنے اور آٹھ آنے والی کہانیاں خرید کر پڑھنے کا شوق ہوا اور چونکہ امی اسکول ٹیچر تھیں اور انہیں بھی رسائل پڑھنے کا بہت شوق تھا تو ہمارے گھر میں سسپنس، جاسوسی، عمران، سرگزشت، سب رنگ اور اردو ڈائجسٹ آیا کرتے تھے۔ خواتین اور پاکیزہ تو لازمی آتے تھے۔ اخبار جہاں بھی ریگولر آتا تھا اور میں بھی اخبار جہاں خاص طور پر ضرور پڑھا کرتی تھی۔“

”لکھنے کا عمل کب سے شروع ہوا اور کیسے احساس ہوا کہ آپ بھی کچھ لکھ سکتی ہوں؟“

”میں اخبار جہاں میں بچوں کا صفحہ بہت شوق سے پڑھتی تھی، ایک دن میں نے سوچا کہ میں جب بچوں کے تین صفحے پڑھتی ہوں تو مجھے ”تین عورتیں تین کہانیاں“ بھی پڑھ لینی چاہئیں۔ پھر اس میگزین میں کچھ ناولز بھی شائع ہوتے تھے، میں نے وہ بھی پڑھنے شروع کر دیے اور جب میں شاید چوتھی کلاس میں تھی تو اخبار جہاں میں ”خالی گھر“ کے عنوان سے ایک کہانی شائع ہوئی تھی، اسے بھی میں پڑھتی تھی اور بڑی خوف زدہ بھی رہتی تھی۔

میں نے اپنی دوستوں سے جب کہانیوں کے بارے میں یا جو کچھ میں پڑھتی تھی اس کے بارے میں ڈسکس کرتی تو محسوس کرتی تھی کہ انہیں ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن مجھے تو پڑھنے کا ایک چسکا سا لگ گیا تھا اور یہ دنیا میری ذاتی دنیا سے بالکل الگ تھی۔ عمران سیریز بھی بہت پڑھیں۔

ایک دن یوں ہی خیال آیا کہ کہانی تو میں بھی لکھ سکتی ہوں اور میں نے لکھی۔ اخبار جہاں میں بھیجی اور وہ شائع بھی ہو گئی۔ ”بچی خوشی“ کے عنوان سے...... پھر کچھ اور کہانیاں بھیجیں اور وہ بھی شائع ہوئیں۔ اخبار جہاں سے بڑا پیارا رشتہ بن چکا تھا اور میں اس میں جو چیزیں لکھ کر بھیجتی تھی وہ شائع ہو جاتی تھیں۔ بچپن سے نکلی تو خواتین ڈائجسٹ کو ہاتھ میں لیا اور جب میں خواتین میں شائع تحریریں پڑھتی تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ تو میں بھی لکھ سکتی ہوں۔

خیر...... جب میں شاید دسویں کلاس کی طالبہ تھی تو خواتین ڈائجسٹ میں ”ہما بخاری“ کا ناول ”ماہی ماہی کوک دی“ ختم ہوا تھا تو انہوں نے لکھا کہ رائٹر نے تو اپنے ناول کا اختتام کر دیا ہے لیکن اگر آپ (قارئین) اس اختتام سے مطمئن نہیں ہیں تو بتائیے کہ اس کا کیا اختتام ہونا چاہیے۔ اگرچہ میں اس کے اینڈ سے مطمئن تو تھی مگر پھر بھی میں نے اپنی مرضی کا اینڈ لکھ کر بھیج دیا۔ اب پتا نہیں وہ اینڈ انہوں نے پڑھا یا نہیں مگر مجھے اندازہ ہوا کہ میں لکھ سکتی ہوں۔ پڑھائی کی اگلی منزل کالج تھی۔ کالج میں آئی تو کرن والوں کو دو تین کہانیاں لکھ کر بھیجیں، جو پتا نہیں کہاں گئیں۔ خواتین ڈائجسٹ میں ”نامے ہمارے نام“ میں خط لکھتی رہتی تھی اور اپنی رائے کا اظہار کرتی رہتی تھی۔ پھر ہمارے کالج میں مقابلۂ افسانہ نگاری ہوا۔ میں نے افسانہ لکھ کے بھیجا اور اسے پہلا انعام ملا اور اس مقابلے کے جج ”جاذب قریشی“ اور ”سحر انصاری“ تھے۔ اس ہمت افزائی پر مجھ میں مزید حوصلہ آیا اور میں نے خواتین ڈائجسٹ میں فون کیا اور وہاں میری بات واصفہ صابری جنہیں اب واصفہ سہیل کے نام سے جانتے ہیں، سے بات کی اور (میری ٹون ایسی تھی کہ میرے افسانے نے فرسٹ پرائز لیا تو آپ کیا چیز ہیں) بتایا تو واصفہ نے بڑے پیار سے بات کی اور کہا کہ افسانہ بھیج دیں۔ میں نے افسانہ بھیجا جو کہ شائع بھی ہو گیا۔

پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد ایک اور کہانی لکھی، وہ بھی شائع ہو گئی اور یوں میں اپنے کالج میں رائٹر مشہور ہو گئی۔ بس پھر کالج کے چار سالوں میں میں نے بہت لکھا، کچھ کہانیاں چھپ جاتی تھیں، کچھ گم ہو جاتی تھیں۔ کچھ کو میں پوسٹ کرنا بھول جاتی تھی۔ کم تو میری کہانیاں بہت ہوئی تھیں، پھر جب میں بی اے میں آئی تو میری ماں نے ”میرا رشتہ“ طے کر دیا۔ ماسٹرز کرنے کے لیے مجھے تھوڑا ٹائم دے دیا گیا۔ لکھنے کا عمل بھی جاری تھا مگر اب لکھنے میں گیپ آنے لگا کیونکہ پڑھائی کی طرف بھی دھیان تھا اور شادی کی طرف بھی۔

ایک دن حیدری مارکیٹ سے میں اپنا لہنگا خرید کر دکان سے باہر آئی تو ایک شاپ پر مجھے ”کرن“ نظر آیا۔ میں رکی۔ کرن اٹھایا اور فہرست دیکھی تو میرا افسانہ چھپا ہوا تھا، جو شاید میں نے ایک سال قبل بھیجا ہو گا۔ میں نے امی سے فرمائش کر کے وہ میگزین خریدا۔ ”سوچ دریچہ“ میری کہانی کا عنوان تھا۔

پھر شادی ہو گئی، کچھ ہی عرصے کے بعد لکھنے کا شوق دوبارہ اجاگر ہوا مگر اب میں کہانیاں بھیجتی تو وہ شائع نہیں ہوتی تھیں۔ اس دوران پھر بیٹی صاحبہ بھی دنیا میں تشریف لے آئیں۔ ذمہ داریاں بڑھیں تو لکھنے کا شوق نہیں بلکہ رجحان کم ہو گیا۔

دلچسپ بات یہ کہ میری چیزیں شائع ہوتی تھیں مگر مجھے انفارم نہیں کیا جاتا تھا اور میگزین میں باقاعدگی سے خریدتی نہیں تھی۔

پھر چند سال پہلے والا اتفاق پھر ہوا کہ میں بک اسٹال پر کھڑی تھی، ”کرن“ پر نظر پڑی، اٹھا کر دیکھا تو معلوم یہ ہوا کہ میں اس میں میرا وہ ناول چھپا ہوا ہے جو میں نے اپنی شادی سے پہلے لکھا تھا۔ دیکھ کر بہت اچھا لگا اور لکھنے کی آگ جو اب تقریباً بجھ چکی تھی، اس کی چنگاری نے ایک شعلہ سا بھڑکا دیا اور میں نے سوچ لیا کہ اب مجھے دوبارہ لکھنا ہے۔

اب یہ تھا کہ کچھ شائع ہو جاتا تھا، کچھ نہیں۔ یقین کریں کہ میں نے اپنا آپ منوانے کے لیے بہت ٹف ٹائم گزارا۔ میری خواہش ہوتی تھی کہ خواتین اور کرن میں میری تحریریں باقاعدگی سے شائع ہوں، مگر مجھے کوئی بہت اچھا رسپانس نہیں ملتا تھا جب کہ دیگر ڈائجسٹ میں، میں جو کچھ بھیجتی تھی وہ بہت خوشی خوشی شائع کر دیتے تھے۔

اس دوران ایک بڑی عجیب بات ہوئی کہ خواتین اور کرن میں کچھ نئی لڑکیوں نے بھی لکھنا شروع کیا۔ وہ اچھا لکھتی تھیں مگر ان کی تحریروں میں کچھ ایسے ٹیکنیکل فالٹ ہوتے تھے کہ جن کو پڑھ کر میں بہت کڑھتی تھی کہ ان کی کہانیاں چھپ رہی ہیں، میری کہانیاں تو ان سے بھی اچھی ہیں، وہ کیوں نہیں چھپتیں۔

میں نے ایک بہت اچھا ناول لکھا اور کرن میں بھیج دیا۔ مگر وہ شائع نہیں ہوا، میں نے آفس فون کیا اور ناول کا پوچھا تو جواب ملا کہ وہ ناول شائع نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ نے پیروں فقیروں پر لکھا ہے۔

میں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ مجھے میرا ناول واپس بھیج دیں، کہا گیا ٹھیک ہے بھیج دیں گے۔

ان دنوں کچھ لکھنے کے حوالے سے اور کچھ ذاتی زندگی کے حوالے سے بہت ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ چنانچہ ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ میں آج آفس جاؤں گی اور خود بات کروں گی اور میں اپنی بیٹیوں کے ساتھ جو کہ بہت چھوٹی تھیں، انہیں اور اپنی کہانیوں کے مسودے لے کر "کرن" کے آفس پہنچ گئی اور پوچھا کہ "پیروں فقیروں" کے حوالے سے جو کہانی میں نے لکھی تھی وہ کیوں نہیں شائع کی۔ تو جواب اس طرح دیا گیا کہ پیروں فقیروں کی کہانیاں ہم شائع نہیں کرتے تو میں نے ان معروف رائٹر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کا ٹاپک بھی یہی تھا، ان کی کہانی آپ نے شائع کردی اور میرے لیے آپ اس طرح کی بات کر رہی ہیں، تو جواب آیا کہ "آپ اپنے آپ کو ان سے ملا رہی ہیں؟ وہ تو بہت منجھی ہوئی رائٹر ہیں، وہ تو لکھ سکتی ہیں۔" یہ جملہ میرے لیے ایسا ہی تھا جیسے کسی نے مجھے پتھر مار دیا ہو۔

خیر میں نے اپنی ایک کہانی کا پوچھا تو جواب آیا وہ تو بہت "ولگر" کہانی ہے۔ میرے لیے یہ دوسرا پتھر تھا، جب کہ میں تو بہت مہذب ہو کر لکھتی ہوں اور میری کہانی کو ولگر کہہ دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ میری کہانیاں مجھے واپس کردیں' کچھ انہوں نے کردیں، کچھ بعد میں کرنے کو کہا کہ ابھی مل نہیں رہیں۔ میں کرن کے دفتر سے نکل کر خواتین کے آفس میں آگئی اور اس وقت میرا چہرہ شرمندگی سے، غصے اور ہر طرح کے احساسات کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا بلکہ تپ رہا تھا۔

امتل مجھے بچیوں کے ساتھ دیکھ کر حیران ہوئیں کہ یہ کون خاتون آگئی ہیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو امتل نے کہا کہ آپ کا نام کچھ سنا سنا سا لگ رہا ہے۔ میں نے کہا نام پر مت جائیے آپ میری یہ کہانیاں دیکھیں جو میں سولہ سال کی عمر سے لکھ رہی ہوں۔ امتل نے وہ شائع شدہ کہانیاں دیکھیں، پھر میں نے مسودے دکھائے اور کہا کہ مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ پھر وہ کہانیاں بھی دکھائیں جو دیگر ڈائجسٹ میں شائع ہو چکی ہیں، اس کے بعد میں نے دوسرا شاپر کھولا اور وہ کہانیاں دکھائیں جو مختلف رائٹرز نے لکھی تھیں اور میری دانست میں غلطیاں کی تھیں، ان کو میں نے انڈر لائن کیا ہوا تھا۔

میں نے امتل سے کہا کہ یہ رائٹرز اتنے بڑے بڑے "بھنڈ" کر رہی ہیں مگر پھر بھی ان کی کہانیاں چھپ رہی ہیں، جب کہ میں نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی مگر پھر بھی شائع نہیں ہو رہی۔ میں بہت غصے میں تھی اور یہ سوچ کر گئی تھی کہ آج مجھے سب کو ٹھیک کر دینا ہے۔ امتل نے بڑے تحمل سے میری باتیں سنیں اور بہت حیران ہوئیں حیران وہ اس لیے تھیں کہ انہیں ان ساری باتوں کا پتا ہی نہیں تھا۔

امتل نے میرے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا کہ جو ہوا سو ہوا۔ عید آرہی ہے، آپ عید کے حوالے سے ہمیں کچھ لکھ کے دیں۔ میں گھر تو آگئی اور سوچ رہی تھی کہ اتنا کچھ بول کے آئی ہوں، اب مجھے ثابت بھی کرنا ہے کہ میں سچ تھی چنانچہ میں نے کہانی لکھی جو کہ شائع ہو گئی۔ پھر ایک کہانی لکھی "وڈے دی چیز" پھر "اڈی والی جوتی" "تیری محبت" لکھی جو کہ سب شائع ہوئیں۔ پھر "سرسوں کے پھول" اور یہ شاید میرے کیریئر کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ پھر میں نے "مسترد" لکھا جو آج کل گھمنڈ کے نام سے اے پلس سے سیریل کی شکل میں آرہا ہے۔

پھر میں نے ایک کہانی لکھی جو کہ دو تین اقساط کی ہو سکتی تھی میں نے امتل کو فون کیا اور بتایا تو امتل نے کہا کہ تم قسط وار کہانی لکھنے کے بجائے مجھے "سولو ناول" لکھ کے دو۔ میں نے "دل موم کا دیا" لکھ کر دے دیا۔ یہ بہت زیادہ پسند کیا گیا — قارئین کے ساتھ ساتھ مصنفین نے بھی تعریف کی اور اللہ کا شکر ہے کہ میں اس کے بعد بھی آگے ہی بڑھی ہوں، پیچھے نہیں آئی۔

کہتی ہیں کہ سائرہ! تم نے بہت اچھا کیا کہ آفس آگئیں۔ اگر تم نہیں آتیں تو شاید ہمیں تمہاری جیسی رائٹر بھی نہ ملتی۔"

"ٹی وی تک رسائی کیسے ہوئی؟"

"مجھے یہ کسی نے نہیں کہا کہ آؤ تمہیں چینل تک لے کر چلتے ہیں۔ یہ بڑی منافقانہ فیلڈ ہے اور یہاں سب ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے ہیں۔ جب میرا ناول "دل موم کا دیا" شائع ہوا تو مجھے کسی چینل سے جو پہلی کال آئی وہ رامس تنویر کی تھی جو کہ "سکس سگما" میں ہوتے تھے۔ انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ ہم اس پر ڈراما بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے ڈراما لکھنا نہیں آتا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ لکھ لیں گی۔ اتفاق دیکھیں کہ رامس وہاں سے چلے گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

کالز آتی رہتی تھیں چینلز سے بھی اور پروڈکشن ہاؤسز سے بھی۔ مگر میں بہت محتاط رویہ رکھتی تھی۔ پھر جب "اب کر میری رفو گری" ناول لکھا تو مجھے بہت لوگوں نے کال کی اور جب ہماری میٹنگ ہوئی اس سلسلے میں تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں میٹنگ میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے میرا ناول پڑھا ہوا ہے اور وہ بڑے مزے سے اس پر تبصرہ بھی کر رہی تھیں۔ مجھے جب اس ناول کے لیے بلایا گیا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ مجھ سے کوئی یہ نہ کہے کہ کہانی سنائیں اس ناول کی، اگر آپ نے یہ ناول پڑھا ہوا ہے تو میں کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔

میں رفو گری پر کام کر رہی تھی کہ "اے پلس" سے مجھے زنجبیل کی کال آئی۔ زنجبیل کو میرے کچھ ناولز پسند تھے جس میں "مسترد" بھی شامل تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا اور میں نے ان سے کہا کہ میں "رفو گری" پر کام کر رہی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہم سے ایگریمنٹ کرلیں، جب رفو گری سے فارغ ہو جائیں تو ہمارے ساتھ کام کریجیے گا، تب ہم "مسترد" کریں گے۔ میں نے ایگریمنٹ سائن

[illegible] ایگریمنٹ سائن کرنے کے لیے بلایا گیا تو دو ایگریمنٹس پر سائن کرنے کے لیے کہا گیا۔ ایک "رفو گری" کے لیے اور ایک "دل موم کا دیا" کے لیے اور "دل موم کا دیا" ایسا سیریل ہے کہ جس کے لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ جیسا میں چاہتی تھی ویسا ہی شوٹ ہوا ہے۔"

"کتابی شکل میں کتنی تصانیف آچکی ہیں؟"

"اب تک تین تصانیف آچکی ہیں۔ "دل موم کا دیا"، "اب کر میری رفو گری" اور "حسن المآب"۔"

"ڈراموں کی پے منٹ اچھی ہوتی یا بس گزارا ہے؟"

"ڈراموں کی پے منٹ الحمدللہ پہلے پروجیکٹ سے لے کر اب تک اچھی ہے۔"

"اپنی لکھی ہوئی تحریروں میں سے پسندیدہ تحریر؟"

"مجھے اپنی ساری تحریریں پسند ہیں۔ مجھے اپنے لکھے ہوئے نقطے تک پسند ہیں، مگر پھر بھی اپنی تحریروں میں جس تحریر کو میں ماسٹر پیس کہہ سکتی ہوں کہ جس کے بعد قلم توڑ دیا۔ وہ "خالی آسمان" ہے اور میں برملا کہتی ہوں کہ ایسی کہانی کبھی ڈائجسٹ میں نہیں چھپی ہوگی، مگر اسے وہ رسپانس نہیں ملا جو اس کو ملنا چاہیے تھا۔"

"کیا کیا آن ایر آچکا ہے اور کیا پہلے سے لکھی تحریریں ڈراماٹائز ہوئیں یا اوریجنل کہانی بھی دی؟"

"رفو گری" کے لیے سب سے پہلے کام کیا مگر جو چیز سب سے پہلے آن ایر ہوئی وہ ٹیلی فلم تھی "پانی کا بلبلہ" جو میرے ناول "اصل حکایت" پر بنائی گئی۔ اس کے بعد "رفو گری" آن ایر آیا۔ پھر اے پلس سے "صرف تم" کے نام سے ٹیلی فلم آن ایر ہوئی۔ "گھمنڈ" اے پلس سے آن ایر ہے۔ "دل موم کا دیا" اے آر وائی سے آن ایر ہے اور ابھی تک تو میں نے اپنے ناولز پر ہی کام کیا ہے۔

اب ایسا ہوا ہے کہ میں نے باقاعدہ پروڈیوسرز کے ساتھ بیٹھ کے کچھ اسٹوریز لکھی ہیں اور اب جو

سے کر رہی ہوں، اس طرح کام کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔"

"ڈراما جب شوٹ ہو رہا ہوتا ہے تو آپ سیٹ پر ہوتی ہیں کیا؟ یا مکمل اختیار پروڈیوسرز اور ڈائریکٹر کو ہوتا ہے؟"

"جب ڈراما شوٹ ہوتا ہے تو میں گھر میں ہوتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ جب کوئی کام ٹیم ورک کے ساتھ ڈسکس کرکے کیا جائے، اس کا زیادہ اچھا رزلٹ آتا ہے۔ بجائے یہ کہ آپ رائٹر کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں اور اپنی عقل پر بھروسا کریں ایک بات ضرور کہوں گی کہ آپ خواہ کتنے ہی اچھے ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور آرٹسٹ کیوں نہ ہوں، کردار اور کہانی کو آپ رائٹر سے بہتر نہیں سمجھ سکتے۔"

"ڈرامے کی فیلڈ میں جگہ بنانے میں مشکل ہوئی؟"

"میرے نام کا مطلب "بہتا پانی" ہے۔ اس لیے اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی، سارے راستے خود بخود ہی بنتے چلے گئے۔ کال آئی، میں چلی گئی۔ کہا یہ کرنا ہے میں نے کر دیا۔ ایک سیریل کے دوران دوسرا معاہدہ سائن کر دیا، تو اللہ کا کرم ہے۔"

"خاندان والے فخر کرتے ہیں یا ہلکا لیتے ہیں؟"

"بچپن میں ہی میں نے اپنی زندگی کے دو حصے بنا لیے تھے ایک حصہ جس میں میری فیملی اور میرا گھر تھا۔ اور دوسرا حصہ میری ذات جس میں میرا لکھنا پڑھنا تھا۔ میں عام طور پر اس موضوع پر بات کرنا پسند ہی نہیں کرتی تھی اور کوئی کرتا بھی تھا تو میں ٹاپک بدل لیا کرتی تھی مگر میرا لکھنا پڑھنا، کاوشوں کا شائع ہونا سب بھلا کیسے چھپ سکتا تھا۔

تو ہمارے خاندان میں میری چچی میری بہت تعریف کرتی ہیں، میری کزن عاصمہ میری قابلیت پر رشک کرتی ہے۔ میرے چچا امین رضا نے کہا کہ چھوٹے ماموں گل نواز اور مامی اسکول ٹیچر ہیں تو جب میرے ماموں زاد بھائی کی شادی ہوئی تو سب کو یہ ایکسائٹمنٹ تھی کہ سائرہ رضا بھی آ رہی ہیں کیونکہ میری ممانی نے سب کو بتایا ہوا تھا۔ آپ یقین کریں کہ وہاں تین چار ٹیبلز ایسی تھیں جہاں صرف سائرہ رضا کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ میری بہن، میری بھابھیاں سب بہت فخر کرتی ہیں اور بڑی بھابھی ناصرہ تو بڑے مزے سے سب سے کہتی ہیں، مجھے جانتے ہیں میں کون ہوں، میں سائرہ رضا کی بھابھی ہوں۔ چھوٹی بھابھی گل ناز نے تین دن میں میرا ناول "حسن المآب" پڑھ لیا۔

مجھ سے چھوٹا بھائی کہتا ہے کہ تم اتنی لمبی لمبی چھوڑ کیسے لیتی ہو، وہ بھی فخر کرتا ہے اور جو سب سے چھوٹا بھائی ہے اسے اپنی ماں پر کہ وہ ٹیچر ہیں اور مجھ پہ کہ میں رائٹر ہوں، بہت فخر کرتا ہے۔

میرے میاں مشتاق صاحب کہتے ہیں کہ شادی سے پہلے تم کچھ بھی نہیں تھیں۔ میں نے تمہیں ڈراما باز بنا دیا ہے، اپنے بچوں سے میں نے کبھی پوچھا نہیں۔ میری بہن حمیرا رضا میری تحریروں کو بہت پسند کرتی ہے اور میرا بہنوئی شمس رضا جو میرا چچا زاد بھائی بھی ہے، مجھ پر فخر کرتا ہے اور میرے لیے تحفے میں پین اور کاغذ بھیجتا رہتا ہے۔"

"ڈرامے کیا حقیقی زندگی کے قریب ہوتے ہیں؟ اور کیا اپنی حقیقی زندگی میں بھی آپ مسائل کو اس طرح حل کر لیتی ہیں؟"

"بنیادی پلاٹ تو حقیقت سے ہی لیا جاتا ہے اور ہم سب کچھ چونکہ اچھا اچھا دکھانا چاہتے ہیں تو ہم اینڈ کو بھی اچھا ہی دکھاتے ہیں۔ جب کہ عام زندگی میں اینڈ اچھے نہیں ہوتے لوگوں کے۔ تو اگر ہم بھی برے اینڈ دکھا دیں تو لوگوں کا دل ٹوٹ جائے گا۔ جہاں تک حقیقی مسائل کا تعلق ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ میرا قلم زیادہ طاقت ور ہے، اسے میں جہاں چاہوں گھما دوں، مگر حقیقی زندگی میں مسائل کو حل کرنا زندگی کے فیصلے اوپر والا کرتا ہے، ہم نہیں۔"

"یہ عام سی بات ہے کہ سیریل ہٹ تو رائٹر ہٹ اور سیریل ناکام تو رائٹر ناکام۔" "دل موم کا دیا" سے مطمئن ہیں؟"

"مطمئن بھی ہوں اور خوش بھی ہوں اور اکثر کہا جاتا ہے کہ ڈراما ناول سے ریلیٹ نہیں کر رہا تو میں ان سے یہ کہوں گی کہ پڑھنے اور دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پڑھتے وقت آپ کے تصور میں کچھ اور ہوتا ہے اور دیکھتے وقت آپ کے تصور سے مختلف ہوتا ہے۔ تو یہ سیم چیز نہیں ہو سکتی مگر پھر بھی نیلم منیر نے "الفت" کا کردار بہترین کیا ہے۔ اسی طرح میرا سیریل "گھمنڈ" بھی بہت پسند کیا جا رہا ہے۔"

"ڈراما کے بارے میں تو کافی باتیں ہو گئیں، کچھ ذاتی زندگی کے بارے میں بھی سوال ہو جائیں۔ بچپن سے لے کر اب تک مزاج کی کیسی رہی ہیں؟"

"میں بہت خوش مزاج ہوں مگر غصے کی تیز بھی بہت ہوں۔ پہلے بھی غصہ بہت آتا تھا اور اب بھی بہت آتا ہے۔ غلط بات برداشت نہیں، ایک بار ایک مچھلی والے نے میری ماں کے ساتھ بدتمیزی کی تو میں نے اس کی چھری اٹھالی کہ اب بدتمیزی کی تو یہ تمہارے پیٹ میں گھونپ دوں گی اور اسی طرح بازار میں ایک اور بندے نے بدتمیزی کی تو میرے ہاتھ میں واش روم صاف کرنے والا برش تھا جو کہ میں نے اسی وقت خریدا تھا اس سے میں نے اس کی پٹائی کر دی تھی اور غصہ کم ہونے کے بجائے بڑھا ہی ہے۔ پوزیشن کے حساب سے نرم گرم ہوں۔ میرے ساتھی مجھے شگفتہ مزاج کہتے ہیں مگر میڈیا کے لوگوں میں میں بہت بد دماغ اور رُوڈ مشہور ہوں۔ پتا نہیں اس کی کیا وجہ ہے۔"

"فرصت کے اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

"بچپن میں جو کام فارغ اوقات میں کیا کرتی تھی۔ وہ اب میرا پروفیشن بن چکا ہے اور اب اسی سے فرصت نہیں ہے۔ میری ایک خواہش جو اب پیارے سوٹ خود سلائی کروں، مگر ٹائم ہی نہیں ہے۔

گھرداری سے بہت لگاؤ ہے اور اگر لگاؤ نہ بھی ہو تو "الف" سے لے کر "ے" تک ہر چیز میں خود کرتی ہوں۔ حتیٰ کہ سبزی خریدنے بھی خود ہی جاتی ہوں۔ مزے کی بات یہ کہ کوئی پہچانتا نہیں۔ کھانا اپنے طور پر تو میں اچھا پکاتی ہوں، مگر میری امی کہتی ہیں کہ تم صرف پیٹ بھرنے کے لیے پکاتی ہو۔

سیاست سے دلچسپی تھی تب ہی پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کیا۔ صبح اور رات سونے سے پہلے مجھے لازمی خبریں سننی ہوتی ہیں۔ سیاسی ٹاک شو بہت دلچسپی سے دیکھتی ہوں مگر اب میں اپنی موجودہ سیاست سے بہت مایوس ہو گئی ہوں اور بڑی سے بڑی خبر سن کر بھی افسردہ نہیں ہوتی۔ کھیلوں سے لگاؤ تھا جب وسیم اکرم اور شاہد آفریدی ہوتے تھے، اب صرف ہارنے اور جیتنے کی حد تک دلچسپی رہ گئی ہے۔

گھومنے پھرنے کا شوق ہے اور چونکہ میاں صاحب کو لانگ ڈرائیو کا شوق ہے تو ہمیں بھی یہ شوق ہو گیا ہے۔ ابھی پنجاب تک چلے گئے تھے مگر میں روڈ کے حادثات سے بہت خوف زدہ رہتی ہوں۔

میوزک کا بہت شوق ہے۔ آواز اچھی ہو یا نہ ہو میں گنگنانا نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ شوق مجھے اپنے والد کی طرف سے آیا کہ ان کے پاس میوزک کا بہت اچھا کلیکشن تھا استاد امانت علی خان تو مجھے مہاراجہ لگتے ہیں نصرت فتح علی اور عابدہ پروین کو تو دنیا تسلیم کرتی ہے۔ "منا ڈے" کا، سہگل کا، کشور کا، مکیش وغیرہ کا۔ اس دور کے سارے گانے یاد ہیں، آج کل میں کوک اسٹوڈیو کو فالو کرتی ہوں۔ آئمہ بیگ بہت پسند ہے، شجاع حیدر کی کمپوزیشن بہت پسند ہے۔ ساحر علی بگا اور سجاد علی بے حد پسند ہیں۔ لیکن آج کل گانے جو ری میکس ہو رہے ہیں ان کے لیے میں باقاعدہ کوئی سزا تجویز کرنا چاہ رہی ہوں۔"

"اس سارے سفر میں سب سے زیادہ

سپورٹ کی ہے کیا

"سچ کہوں تو اس سفر میں مجھے "احتل" نے بہت سپورٹ کیا۔ میری تحریروں کو پسند کیا۔ میں ان کو "کسٹم ری چیک پوسٹ" کہتی ہوں کہ اگر احتل نے اسے پاس کر دیا ہے۔ یا ان کی طرف سے تعریف آ گئی ہے تو پھر وہ تحریر واقعی زبردست ہے۔ احتل سے بہت زیادہ دوستی ہے، وہ مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی ہیں۔ میں ان کا بہت احترام کرتی ہوں۔"

"اپنے علاوہ کون کون پسند ہیں رائٹرز میں؟"

"اپنے علاوہ میں تمام رائٹرز کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ سب مجھے بہت پسند ہیں، میں کسی کو برا نہیں کہوں گی۔ ابھی گزشتہ دنوں نعیمہ ناز کی کاوش بے سود —— نے مجھے پاگل کر دیا۔ سمیرا احمید کی "دیبا فضل کریم" نے میرا دماغ خراب کر دیا، میرا سانس بند کر دیا تھا۔ "ایمل رضا" کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ عنیزہ آپا کی تحریریں جو آج کل چھپ رہی ہیں، بہت پسند ہیں۔"

"کچھ اپنی فیملی لائف کے بارے میں بھی بتائیں؟"

"میری تین بیٹیاں ہیں۔ ارینج میرج تھی اور جلدی یعنی کم ایج میں ہو گئی کیونکہ میرے والد کی ینگ ایج میں آنکھوں کی بینائی چلی گئی تھی تو امی نے سوچا کہ بھائی تو ابھی چھوٹے (بیٹے) ہیں، سائرہ کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میرے میاں صاحب بہت تعاون کرتے ہیں۔ آفس لے کر جانا، وہاں سے لے کر آنا، میری ایک کال پر مجھے لینے آ جاتے ہیں اور میری ان کاوشوں کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اور کبھی اگر کہہ بھی دیں کہ بس کر دو، تو میں ان کو دوٹوک انداز میں کہتی ہوں کہ ہاؤس وائف عموماً شوہر اور بچوں کو آفس اور اسکول بھیج کر سو جاتی ہیں اور پھر اس وقت اٹھتی ہیں جب بچے اسکول سے آ کر دروازے کی بیل بجاتے ہیں۔ میں گھر کی تمام ذمہ داریاں نبھا رہی ہوں تو کسی کو میری ان

بہر حال کچھ بھی ہو، میاں صاحب کی سپورٹ کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ ایک بات اور بتاؤں کہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو میری پہلی تحریر پر امی بہت خوش ہوئی تھیں۔ بھائی چھوٹے تھے انہوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی، البتہ والد صاحب کو میں نے ایک دو بار بتایا بھی تو انہوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ لیکن جب میری شادی ہو گئی تو اس کے دو تین ماہ کے بعد ایک صبح میرے والد بہت اونچی آواز میں رو رہے تھے، تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ

جب میرے والد کے خواب میں ان کی والدہ آتی تھیں تو وہ اونچی آواز میں رویا کرتے تھے۔ امی سمجھیں کہ شاید ایسا ہی کوئی خواب دیکھ لیا ہے۔

امی نے پوچھا تو بہت دیر بعد ہچکیوں سے روتے روتے انگلی سے اس کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں میں نے بہت سارے گملے رکھے ہوئے تھے اور جہاں میری کرسی پڑی رہتی تھی...... تو والد صاحب نے کہا کہ "کسی کو کچھ نہیں کہتی تھی، بس خاموشی سے کونے میں بیٹھ کر پتا نہیں کیا لکھتی رہتی تھی، میری بیٹی چلی گئی۔" تو میری امی نے بے ساختہ کہا کہ "کیا ہو گیا ہے آپ کو، آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔ بڑے ٹائم پر اس کی شادی ہوئی ہے"...... تو میرے لیے بڑی حیران کن بات تھی کہ انہوں نے مجھے اس طرح یاد کیا۔"

"قارئین کے لیے کوئی بات؟"

"جی...... یہ کہ "دل موم کا دیا" کا ناول بھی میں نے ہی لکھا تھا اور اسکرپٹ بھی۔ اس کی آخری اقساط ضرور دیکھیے گا۔ اسی طرح "گھمنڈ" بھی میری ہی تحریر ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ کو یہ دونوں سیریلز پسند آ رہے ہوں گے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے سائرہ رضا سے اجازت چاہی، اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

رضیہ جمیل

پہلا خط کراچی سے عائشہ رباب کا ہے، لکھتی ہیں

ایک طویل عرصے بعد حاضر ہوئی ہوں۔ ستمبر کا شمارہ لیٹ ملا، اس لیے پہلے اس پر تبصرہ۔

پہلی شعاع پڑھی کیا عمدہ الفاظ لکھے تھے سیدھے دل میں اتر گئے۔

بات کرتے ہیں۔ ناولوں کی تو سب سے پہلے "خواب شیشے کا۔" کہانی بہت ہی اچھے انداز میں بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی۔ عفت سحر طاہر کو بہت بہت مبارک باد۔ "شام کی حویلی میں" ڈھیر سارے کردار ریشم کی ڈوریوں جیسے الجھے رشتے، دنیا والوں کی بے حسی کی منظر کشی کرتی پرسوز کہانی پر تبصرہ ادھار رہا۔ ان شاء اللہ کچھ قسطوں بعد۔

اب آتے ہیں مکمل ناول کی طرف۔ "گردش ایام" اگر کہوں کہ یہ کہانی پورے رسالے کی جان ہے تو کچھ بے جا نہ ہو گا۔ کہانی کی بنت سے لے کر الفاظ کے چناؤ تک۔ تمام کی تمام بہترین تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ "مٹھی میں جگنو" کرداروں کے رویے سمجھ سے بالاتر تھے۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے اتنی بے خبری۔

اب چلتے ہیں ناولٹ کی جانب "قصہ ایک شہزادی کا" سمیرا سرفراز۔ بہت خوب "رب کی بستی" منشا محسن نے خوب لکھا۔

اگر بات کریں افسانوں کی تو "یار دل دار" اس بار کی قسط خوب رہی۔

"راہ نور" سمیرا حمید نفسیاتی اسپتال اور مر جانے کی خواہش رکھنے والے مریض سے مرنے کے لیے اتنا لمبا سفر کیا کہ اف توبہ بھولو پہلوان اور اس کا غم، اس غم کو پچھاڑ کر کس طرح اس نے صبر کیا۔ کوئی عام بات نہ تھی۔ گجرانوالہ کا سفر ہنستے ہنستے کٹا۔ اللہ اللہ صالحہ کی محبت، یوسف کی قربانی، آنسو، آہیں، سسکیاں اور کنتا رلائیں گی ابراہیم کا دکھ، دل ہی بند ہونے لگا۔ شاہین کی پرواز، کھلا اور روشن آسمان، آپ کے فیصلے، اختتام اتنا زبردست کہ اور کچھ پڑھنے کا دل ہی نہیں چاہے گا۔ سمیرا حمید کو میری طرف سے ڈھیروں مبارک باد۔

"مکین شہر جمال کا" بہت بہت زبردست کہانی تھی۔ اختتام بہت ہی اچھا تھا۔ ایک نہایت بہترین اور برسوں یاد رہنے والی کہانی کا ذکر کرنا تو میں بھول ہی گئی اور وہ "بن پاکھی" اس کہانی کے لیے میں مصنفہ کو بہت بہت مبارک باد دینا چاہوں گی۔

ماہ اکتوبر کا شمارہ ہاتھ میں بہت دیر سے آیا، قسط وار کہانیوں کے علاوہ ابھی صرف یار دلداری پڑھا ہے۔ ہلکی پھلکی مزاح کی چاشنی میں ڈوبی یہ کہانی منہ میٹھا کر گئی۔

ان تمام باتوں کے ساتھ بتاتی چلوں کہ "انٹرمیڈیٹ" سال دوم کا نتیجہ آ گیا ہے۔ میں نے پری انجینئرنگ 81% کے ساتھ پاس کی ہے۔

ج: عائشہ! سب سے پہلے تو شان دار نمبروں سے امتحان میں کامیابی پر مبارک باد۔

دوسری مبارک باد شان دار تبصرے پر...... آپ نے پورا پرچا پڑھا اور ہر کہانی پر نہایت عمدگی سے تفصیلی تبصرہ کیا۔ آپ کے اگلے خط کے منتظر ہیں۔

سدرہ شہزاد گوجرہ سے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

ہے کہ ہم سے رابطہ کریں ۔دوست، آپا بنا کر اپنی تصویر بھیج کر ہمیں چھوڑ کیوں دیا۔

پہلی شعاع سرآنکھوں پر۔آپ کی بات بجا ہے مگر ہم خود جذباتی اور جوش والے ہیں۔برائی پر خاموش نہیں رہتے۔

آپ بتائیں اگر آپ کا ہمسایہ قتل میں ملوث ہو۔

خدانہ کرے تو کیا بول چال جاری رکھیں گی؟ ہم نے تو بائیکاٹ کر دیا ہے نتیجہ خدا کے سپرد''حمد و نعت'' امجد اسلام امجد انہیں مبارک ہو۔کاش کہ ہم بھی ...... منزل مقصود پالیں۔زبان خلق نقارہ خدا...... نبی کی باتیں......بس کرتے رہیے......ہم سنتے رہیں۔''دستک'' شگفتہ بھٹی کو سلام ...... یہ تو مجھے اپنی موجودہ شکل سے ملتی جلتی لگیں۔''ناتا جوڑا'' نورین حفیظ آپ کو اور آپ کی اچھی سوچ،عمل کو سلام۔اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔اگر آپ فون کریں تو بے حد خوشی ہوگی۔اور میرا خیال ہے میں نے ''ناتا'' میں صرف آپ ہی کو آفر کی ہے یا کہہ لیں عزت دی ہے شکریہ۔

شعاع کے ساتھ ساتھ...... شکر ہے پڑھنے کو ملا...... دیتے رہا کریں۔پاکستان کے لوگوں سے مل کر اچھا لگتا ہے۔شاعری بھی زیادہ کریں۔ارے انیلا طالب!تمہارا افسانہ؟ مبارک ہو بھئی۔پڑھا ہے۔اچھا لکھا ہے۔کافی سبق آموز ہے لڑکیوں کے لیے۔جاری رکھو کوشش...... حرا قریشی تو غائب ہی ہوگئی۔شہرزاد ہمیں بہت پسند ہے۔تاریخ کے جھروکے بھی دل کھینچتے اور سبق عطا کرتے ہیں۔آپ نے صائمہ مشتاق کو خط کے جواب میں لکھا ہے کہ صرف تعریف کی۔تنقید بھی کریں۔تو جناب جنہیں ہر بات سے سبق لینا ہو وہ تنقید کیوں کریں؟ کافی لوگ تنقید کرتے تو ہیں۔کیا وہ کافی نہیں ہم جو ہر بار کہتے ہیں۔شاعری زیادہ ہو۔ناول مختصر ہوں۔تو کیا اتنی تنقید کافی نہیں۔فوزیہ ثمر کہاں غائب ہوگئی؟

اور ہاں جناب ہمارے جڑانوالہ سے ہمیں تو گلاب کا عرق خالص ملتا ہے یا پھر ہماری دعا کی برکت ہے۔بہر حال کتنے ہی مریض اس سے ٹھیک کر لیے ہیں۔اب تو کسی بھی ڈراپ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ج: پیاری کوثر !آپ کے خط شائع نہیں ہوسکے۔اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔کچھ ڈاک کی خرابی اور کچھ پرچا تاخیر سے ملنے کی بنا پر زیادہ تر خط اس وقت موصول ہوتے ہیں جب پرچا پریس جاچکا ہوتا ہے۔

آپ کا فون نمبر شائع نہیں کر رہے ہیں۔کسی کا فون نمبر پرچے میں دینا ہماری پالیسی نہیں ہے،اگر طاہرہ عندلیب چاہیں تو ہم سے رابطہ کرسکتی ہیں۔ہم ان کو آپ کا فون نمبر دے دیں گے۔

قتل کرنا تو بہت بڑا جرم ہے۔اسے معاف نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر کسی میں کوئی خرابی ہو یا اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا بائیکاٹ کرنا صحیح نہیں ہے۔اس کو سمجھانا چاہیے۔خصوصاً آپ جیسی سمجھ دار خاتون کو انہیں سمجھانے کی کوشش ضرور کرنا چاہیے۔

نتاشا انصاری لکھتی ہیں

''شہرزاد'' بالکل بھی اچھا نہیں کیا شیری نے حمزہ کے ساتھ۔یار ولدار۔ہمیشہ کی طرح زبردست...... ہاہاہا ایک بار پھر بچ گئے سارے مسخرے۔چور دروازہ۔موجودہ دور کا سب سے اہم اور توجہ طلب موضوع (ترقی کی دوڑ میں لوگ حلال و حرام کے فرق کو بھول چکے ہیں)۔''دوسری اور آخری محبت'' (محبت ایک بار ہی ہوتی ہے مگر محبت ہمیں محبت کرنا ضرور سکھا دیتی ہے) بہت خوب صورت تحریر۔

ج: پیاری نتاشا!آپ کے فون نمبر مل گئے ہیں۔آپ کا ناول زیر مطالعہ ہے۔شائع ہوگا یا نہیں آپ کو فون پر بتا دیں گے۔شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ نذیر گل نے میری کالونی کوہاٹ سے لکھا ہے

میں شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں۔میرا اور ان کا تعلق 2006 سے ہے۔اس ماہ کا شعاع بہت زبردست تھا۔چاہے اس میں سلسلہ وار ناول ہو۔مکمل ناول،ناولٹ اور افسانے سب اپنی جگہ بہترین تھے۔شاید آٹھ سال پہلے ایک مکمل ناول نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔اب یاد نہیں۔وہ کہانی شعاع کی تھی۔یا خواتین ڈائجسٹ کی۔اس کہانی کا نام توبہ تھا۔اور بشریٰ جی نے لکھی تھی۔بہت دل چھونے والا ٹاپک تھا۔میرا شعاع اور کرن کا ساتھ دو ہزار آٹھ سے ہے لیکن ہمت اب کی ہے پڑھنے کا بہت شوق ہے بس تیسری تک پڑھی ہوں۔اس ماہ رسالہ دیر سے ملا خط جلدی لکھ رہی ہوں پھر آپ کہتی ہیں خط دیر سے ملا تھا۔رسالے پہلے ماں لا کر دیتی تھی اب شوہر جی لا دیتے ہیں،سسر جی منع کرتے ہیں۔کہتے ہیں کیا فائدہ میں نے بہت پڑھے ہیں،شوہر جی کہتے ہیں پاگل ہو جاؤ گی پھر روتی صورت دیکھ کے لا دیتے ہیں جو لکھنا آتا ہے رسالے سے ہی پڑھ کر لکھ پائی ہوں آپی پھینک مت دینا پلیز۔

ج: پیاری سدرہ!خط تو ہم کسی کا بھی نہیں پھینکتے۔سب ہی خط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔یہ ضرور ہے کہ سب خط شامل نہیں ہو پاتے۔آپ نے صرف تیسری کلاس تک پڑھا ہے۔اس کے باوجود بہت اچھی لکھائی ہے اور خط بھی بہت اچھا لکھا ہے۔آئندہ پورا پرچا پڑھ کر تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

تبسم بشیر حسین......ڈنگہ

ہم ایک بار پھر سے حاضر ہیں۔کیا کریں دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔اگر آپ نے میری باتوں کو مائنڈ کیا ہے تو آئی ایم ــــ ریئلی سوری!خیر......اس دفعہ کا شمارہ 2 کو ملا۔راتوں رات پڑھ ڈالا۔ٹائٹل بہت خوب صورت تھا!خاص کر چوڑیاں۔ایک نظر فہرست پر ڈالی۔ثمرہ بخاری کو دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔پہلی شعاع سے ہوتے ہوئے حمد و نعت پڑھی اور پھر نبی کی باتیں۔انٹرویو میں فواد خان سے مل کر اچھا لگا پلیز فیروز خان کا انٹرویو لیں!مہوش حیات اور زارا عباس سے ملاقات ففٹی ففٹی رہی۔''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' ارم احمد کو آپ نے زبردست مشورہ دیا ہے۔مکمل ناول ''موچنگ از سحر ساجد'' ونڈر فل۔''دوسری اور آخری محبت'' سدرہ نے بھی زبردست لکھا۔افسانے ''یار ولدار'' ہمیشہ کی طرح بیسٹ رہا۔چور دروازہ کشف بلوچ لگتا ہے کہ نئی ہیں پر اچھا لکھا۔باقی ''بدلتے رشتے''۔''جانا کہاں''۔''رنگ دے میرے'' کیا کہانی سب کو پسند آئے تب ہی شامل ہوتی ہے۔صرف مدیرہ فیصلہ نہیں کرتی ہیں؟

ج: پیاری تبسم!کہانیوں کے بارے میں ہمارے ہاں جمہوری طریقے سے اکثریت کی رائے پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔سب کا متفق ہونا تو بہت مشکل ہوتا ہے،لیکن صرف مدیرہ کہانی کا فیصلہ نہیں کرتی ہیں۔

آپ ہی دل کے ہاتھوں مجبور نہیں ہم بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔اپنی عزیز قارئین سے ناراض ہو ہی نہیں سکتے۔ویسے بھی جہاں تعلق ہوتا ہے محبت ہوتی ہے۔لگاؤ ہوتا ہے وہیں گلے شکوے بھی ہوتے ہیں۔لاگ ہو تو سمجھیں لگاؤ ہے۔کچھ نہ ہو تو دھوکا کھائیں کیا......والی بات ہے تعلق نہ ہو تو ربط ہوتا ہے نہ گریز۔

کراچی سے تسنیم کوثر لکھتی ہیں

خط آپ کے میں لگتا ہے آپ کراچی والوں کو شامل نہیں کرتیں۔ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ تمام شہروں سے خطوط آ رہے ہوں اور کراچی سے ایک بھی نہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ شعاع سے کراچی والوں کی دلچسپی پہلے جیسی نہیں رہی؟ ہاں البتہ میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ آپ نئے لوگوں کو ضرور شامل بزم کرتی ہیں لیکن پرانوں کو بھی یاد رکھیے۔کوئی بات ناگوار لگے تو پیشگی معذرت عرض ہے۔

ج: پیاری تسنیم!کراچی سے ہمیں خط بہت کم تعداد میں موصول ہوتے ہیں۔زیادہ تر خط چھوٹے شہروں اور قصبوں سے آتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ کراچی کی لڑکیاں اور خواتین پرچا نہیں پڑھتیں یا انہیں شعاع میں پہلے جیسی دلچسپی نہیں رہی ہے بلکہ اس کی وجہ کراچی کے مسائل ہیں جن کی بنا پر ہر شخص یہاں وقت کی قلت کا شکار ہے۔صرف ٹریفک کے مسائل دیکھ لیں۔اگر کالج،اسکول یا جاب پر جایا جائے تو ڈھائی تین گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔اگر ٹریفک جام ہو جو کہ اکثر رہتا ہے تو یہ دورانیہ بڑھ بھی سکتا ہے۔آپ خود کراچی میں رہتی ہیں۔ان مسائل سے ضرور واقف ہوں گی۔

یہ بات ضرور ہے کہ ہم چھوٹے شہروں اور دیہات میں رہنے والی قارئین کے خطوط کو فوقیت دیتے ہیں۔کیونکہ وہ بہت دشوار گزار مراحل سے گزر کر خط لکھتی ہیں اور پھر ہمیں خط پوسٹ کراتی ہیں۔

کوثر خالد نے جڑانوالہ سے محفل کو رونق بخشی ہے لکھتی ہیں

بس آپ کے توسط سے طاہرہ عندلیب زہرہ کو بتانا

حمید کے مکمل ناول راہ نور نے بالکل ویسے ہی میرے دل کو چھوا جیسے توبہ نے چھوا تھا۔ جس وقت طلحہ، ہادی اور ابراہیم نمک کی کان کی اندھیری جگہ پر پہنچے تو اس اندھیرے کی گھٹن کو میں نے محسوس کیا۔ اور کان سے باہر آنے پر اس روشنی میں زندگی کو محسوس کیا۔ شعاع مشعل راہ ہے سب خواتین کے لیے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے تمام شماروں کو قائم دائم رکھے۔

ج: پیاری عائشہ! اتنی دور سے آپ نے ہمیں خط لکھا اور صرف دو کہانیوں پر تبصرہ...... موجودہ شمارے کے بارے میں آپ نے کوئی رائے نہیں دی۔ آئندہ خط لکھیں تو ہر کہانی کے بارے میں لکھیے گا۔ خوش رہیں آپ اور اسی طرح ہمیں خط لکھتی رہیں۔

شبانہ عندلیب گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں

فرینہ اعجاز رنگین خوب صورت پیراہن کے ساتھ اچھی لگ رہی تھیں۔ سب سے پہلے آپا! پہلی شعاع کو پڑھا اور آپ سے اتفاق کیا۔ حمد و نعت کے بعد پیارے نبی کی پیاری باتوں سے خود اور اپنے گھر والوں کو فیض یاب کیا۔ کیونکہ اس کو پڑھے بغیر ہم ادھورے ہیں۔

افشین نعیم کا "یار دلدار" اس بار کچھ ماٹھا رہا۔ "چور دروازہ" اور "آشیانہ" سب پر بازی لے گئے۔ باقی افسانے بھی ٹھیک تھے۔ ناولٹ میں عاصمہ فرحین نے تو بالکل بھی متاثر نہیں کیا۔ سحر ساجد اتنے عرصے بعد موچنگ کے ساتھ آئیں۔ سب سے پہلے تو مجھے موچنگ ہی سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیا چیز ہے۔ پھر جب کہانی پڑھنی شروع کی تو احساس ہوا کہ یہ تو سوہنی مہینوال کا ری میک ہے۔ معذرت کے ساتھ ناول کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ البتہ دوسرا مکمل ناول تھوڑا دکھی کر گیا۔ سدرۃ المنتہیٰ کے ہاں خوشی بھی ہمیں دکھ میں لپٹی ہوئی ملتی ہے۔ سلسلہ وار ناول میں شام کی حویلی میں مجھے بہت پسند آ رہا ہے ایک تو نام ہی کافی ہے رخسانہ نگار صاحبہ کا...... دوسرے مختلف طبقہ فکر کی کہانی کو انہوں نے موضوع بنایا ہے ابھی تو تعارف ہے امید ہے آگے جا کر کہانی اور بھی دل چسپ ہو جائے گی۔

مستقل سلسلوں میں "خط آپ کے" اور "تاریخ کے جھروکے" میرے موسٹ فیورٹ سلسلے ہیں۔ جنہیں میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں اور کبھی مس نہیں کیا۔

"آئینہ خانے" میں کی خبریں کم البتہ بریکٹ میں کمنٹس زیادہ مزے دار ہوتے ہیں۔

ج: پیاری شبانہ! سحر ساجد کی کہانی چونکہ ماضی میں جا کر لکھی گئی تھی۔ اس لیے اس پر آپ کو سوہنی مہینوال کے ری میک کا گمان ہوا۔ بنیادی طور پر یہ سادہ سی لو اسٹوری تھی لیکن اس کی انفرادیت اور خوب صورتی یہ تھی کہ یہ آج کے ماحول سے بالکل مختلف ماحول میں لکھی گئی اور زبان، بیان اور کردار نگاری میں اس زمانے کے ماحول کی باریکیوں کا خیال رکھا گیا۔ یہ بلاشبہ مصنف کی بہت خوبی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو اچھی نہیں لگی۔ شعاع آپ کو پسند آیا۔ بہت شکریہ۔ رخسانہ نگار اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ قند مکرر کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔

مشک عنبر نے گاؤں عثمان کھٹڑ سے شرکت کی ہے

میں نے ابھی ICS کیا ہے۔ رائٹر بننا میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے۔ میں پانچویں کلاس میں تھی جب لکھنا شروع کیا پہلے بچوں والی کہانیاں لکھتی تھی۔ شعاع نے میرے اندر کی بچی کو اتنا بڑا کر دیا کہ اب میں ناول لکھنے کے قابل ہو گئی ہوں۔ خود کو جج کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اصل میں میں جہاں رہتی ہوں وہاں سپورٹ کرنے والا کوئی نہیں۔ گاؤں ہوتا تب بھی بات بنتی۔ مگر میں ڈھوک میں رہتی ہوں جہاں گھر کے آس پاس گھر نہیں بلکہ دور دور تک زمینیں ہی زمینیں ہوتی ہیں۔ اس لیے مجھے تو بہت ہی مشکل پیش آئی۔ فرینڈز نے تو ہاں ٹھیک ہے ہی کہہ کر ٹال دیا ہر بار۔

ج: پیاری مشک! آپ کی کہانی مل گئی ہے ابھی پڑھی نہیں گئی۔ آپ نے اپنے فون نمبر لکھے ہیں۔ کہانی کے بارے میں ہم فون کر کے اطلاع دے دیں گے۔ آپ 32721666 پر رابطہ کر کے خود بھی پتا کر سکتی ہیں۔

لیکن ایک بات کی وضاحت کر دیں۔ کہ ہم قسط وار ناول اس وقت تک نہیں پڑھتے جب تک وہ مکمل موصول نہ ہو جائیں۔ ابھی آپ نے لکھنا شروع کیا ہے۔ اس لیے پہلے افسانے، ناولٹ یا مکمل ناول لکھیں پھر سلسلہ وار ناول کی طرف توجہ دیں۔

زاہدہ محمد خان نے شادی وال گجرات سے لکھا ہے

شعاع نومبر 2016ء میں مصباح علی کا ناول حاصل کشت و خون دسمبر 2016ء میں نعیمہ ناز سلطان کا افسانہ دو ٹکڑے۔ اور اب ستمبر 2018ء میں نعیمہ ناز سلطان کا ناول "گردش ایام" پڑھ کر مجھے تو یوں محسوس ہوا ہے جیسے ہم بی اے کے مطالعہ پاکستان کا پیریڈ لے رہے ہیں۔ ستمبر میں لکھی گئی میں جگنو کے بارے میں اکتوبر کے شمارے میں خط پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ کئی قارئین کو بی سحر ملک کا ناول نہیں پسند آیا لیکن مجھے بہت پسند آیا ہے ویل ڈن بی سحر ملک۔

اکتوبر 2018ء میں، آپ کے خط میں اپنا خط نہ پا کر بہت مایوسی ہوئی میرا خیال ہے آپ پرانی قارئین ہی کے خط شائع کرتی ہیں نئی کے نہیں۔ میں شعاع تفریح حاصل کرنے کے لیے پڑھتی ہوں۔ ہدایت نامہ پڑھنے کے لیے نہیں۔ مجھے تو میرے والدین نے نماز، روزے کا پابند رہنے، اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے اور اچھے کام کرنے اور برے کاموں سے باز رہنے کے لیے اور قرآن مجید کے استاد، تعلیم نے بھی بتایا سکھایا ہوا ہے۔ میں نے تو رسالوں سے اچھی باتیں نہیں سیکھیں۔ میری باتوں کا برا نہ مانیے گا بہت زیادہ معذرت خواہ ہوں۔

ج: پیاری زاہدہ! ہمیں افسوس ہے کہ اکتوبر کے شمارے میں آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ آپ اطمینان رکھیں خط شائع نہ ہوں تب بھی ہم تمام خط پڑھتے ہیں۔ خط شائع نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ تاخیر سے موصول ہونا ہے۔ کبھی کبھی صفحات کی مجبوری بھی آڑے آ جاتی ہے۔

ہم اپنی تمام قارئین کو عزیز رکھتے ہیں اور ان کے خطوط کو جگہ دیتے ہیں نئی یا پرانی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ کچھ قارئین کا کہنا تو یہ ہے کہ ہم نئی خواتین کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

زاہدہ ہم پرچے آپ کی تفریح طبع کے لیے ہی شائع کرتے ہیں لیکن تفریح کے ساتھ ساتھ کچھ اچھی

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

نومبر 2018ء کے شمارے کی ایک جھلک

- "الف" عمیرہ احمد کا ناول،
- "ام الیقین" سمیرا حمید کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- "سب ہی کھوٹ من کے تھے" سدرہ حیات کا مکمل ناول،
- "حالم" نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- "رزق زوال" نعیمہ ناز کا مکمل ناول،
- "میرا دلبر میرے ساتھ" عائشہ تنویر کا ناولٹ،
- افشین نعیم کا ناولٹ،
- بشریٰ احمد، حمیرا نوشین، عطیہ خالد، حنا شرقی، نوشین فیاض اور آسیہ مجید کے افسانے،
- مشہور صحافی "شکیلا سعود اور عمار مسعود" کا بندھن،
- "انعم تنویر" سے باتیں،
- "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا نومبر 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

باتیں بھی شامل کر لی جائیں تو اس میں کیا حرج ہے۔

افق ارین نے کرک کے پی کے سے لکھا ہے

شمارہ سارا بیسٹ تھا۔ افسانے بہت اچھے تھے۔ ''کشف بلوچ'' کا ''چور دروازہ'' ہو یا فرح حسین کا ''جانا کہاں'' یا پھر افسانوں کی جان ''یار دل دار'' سارے ہی افسانے بہترین تھے۔ ناولٹ ''شہلا، شکور، شکوے'' پڑھ کر مزا آ گیا۔ اچھی تحریر تھی۔ ''حاصل لاحاصل'' میں نفیسہ کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ مکمل ناول دونوں ہی بہت اچھے تھے۔

''موچنگ'' میں سارگل کی محبت کا انجام پڑھ کر دکھ ہوا بہت خوب صورت تحریر تھی۔

''دوسری اور آخری محبت'' میں ''صاد'' کا بہت برا لگا۔

''شہزاد'' میں وہاج کا انجام پڑھ کر دل خوش ہو گیا لیکن اس ذلیل انسان کے ساتھ اس سے بھی برا ہونا چاہیے تھا۔ ''شام کی حویلی میں'' رخسانہ نگار کا نام ہی کافی ہے۔ فواد خان کا انٹرویو پڑھ کر اچھا لگا۔

''تجھ سے ناتا'' اس بار کچھ ہٹ کر تھا۔ لیکن اچھا لگا۔

ج: پیاری افق! آپ کا جامع اور درست تبصرہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی آپ نہ صرف پرچا پڑھتی ہیں بلکہ باقاعدگی سے تبصرہ بھی کرتی ہیں۔

پچھلے ماہ کی طرح اس ماہ بھی آپ نے تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ بہت شکریہ۔

زینب نور جہانیاں سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

16 اکتوبر کو ملتان والی آپی کو رسالہ موصول ہوا۔ سب سے پہلے یہی دیکھا کہ میرا خط شائع ہوا یا نہیں۔ میرا نام دیکھ کر فوراً فون کھڑکایا۔ میرے گھر میں میری صلاحیتوں پر کسی کو بھی یقین نہیں۔ بقول امی جان ''تمہارا دماغ صرف پڑھنے اور پڑھانے میں چلتا ہے، باقی معاملات میں صفر ہو۔''

میں نے کچھ تحاریر لکھی ہیں۔ بھیجنے کا ارادہ بھی رکھتی ہوں۔ ایک بات بتائیں...... اگر میری کہانیاں شائع ہوں گی تو میرا ذاتی فون نمبر ہونا لازمی ہے؟

اوہاں......! ایک اور بات...... کیا لائن چھوڑ کر لکھنا ضروری ہے؟ وہ کیا ہے ناں بھئی......؟ ہمیں ہفتہ وار 50

روتے ہیں۔ اب آپ خود دیکھیں۔ اکتوبر کا شمارہ ابھی تک آپی نے بھجوایا نہیں نایاب جیلانی کا شدت سے انتظار ہے۔ پلیز اس انتظار کا ''دی اینڈ'' کر دیں۔ جیسے رخسانہ نگار نے ''شام کی حویلی میں'' لکھ کر کر دیا ہے۔

ج: پیاری زینب! آپ ہمیں کہانیاں لکھ کر بھجوا دیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ آپ سطر چھوڑے بغیر لکھ سکتی ہیں لیکن یہ رعایت صرف آپ کے لیے ہے۔ کہانیاں بھیجنے کے لیے فون نمبر کی شرط لازمی نہیں ہے۔

ریحا گل نے فیصل آباد سے لکھا ہے

اکتوبر کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ ''شام کی حویلی میں'' اور ''شہزاد'' اچھی جا رہی ہیں ''دوسری اور آخری محبت'' نے دل چھو لیا۔ اور ناولٹ ''شہلا، شکور اور شکوے'' کافی سسپنس لیے تھا آخر تک کہانی نے تجسس برقرار رکھا۔ ''حاصل لاحاصل'' بھی نہایت سبق آموز کہانی تھی۔ نفیسہ کو آخر اس کے کیے کی سزا مل ہی گئی۔ ''موچنگ'' کچھ عجیب تھی۔ افسانے ''یار دلدار'' نے بھی کافی چل کیا مگر اختتام اچھا تھا۔ ''بدلتے رشتے'' میں شمع پر بے حد ترس آیا۔ بے چاری ''جانا کہاں'' میں مریم کی صابر طبیعت اچھی لگی اور نصرت آپا کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔ ''آشیانہ'' اور ''چور دروازہ'' اور ''رنگ دے میرے'' بھی اچھے افسانے تھے۔

ج: پیاری ریحا! آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ایشال چودھری نے نیو مری سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

السلام علیکم! کیا حال ہے؟ ہماری طرف سردیاں شروع ہو گئیں آپ کی طرف موسم کیسا ہے؟

سب سے پہلے شہزاد پڑھنا شروع کیا۔ در شہوار اور کتنا گراؤ گی خود کو۔ موچنگ شروع سے تو خیر لیکن اینڈ تو کان کے پاس سے گزر گیا۔

موسم کے پکوان میں ریسپیز زبردست تھیں۔ حلیم اور فالودے کی ترکیب بہت پسند آئی۔ فالودے کی ریسپی کیا شوگر کے مریضوں کے لیے تھی خیر میری امی نے ٹرائی کی لیکن اس کے بعد دو دن تک میرے منہ سے باتوں کی جگہ

''گھڑ گھڑوں کی آواز آتی رہی۔ ابھی بھی اس میں درد ہے۔

باقی سلسلے بھی اچھے تھے۔ اور غلطیاں تو سب ہی کرتے ہیں اصل بات ہوتی ہے اپنے گناہ یا جرم کو قبول کرنا۔ جس سنز نے ناتا جوڑا میں لکھا۔ اپنے گناہ کو قبول کیا یہ بھی بڑی بات ہوتی ہے۔ ج: پیاری ایشال! کراچی میں سردی آتی ہی کہاں ہے جو شروع یا ختم ہونے کا سوال ہو۔ اس وقت بھی مئی جون کا موسم چل رہا ہے۔

فالودے میں آئس کریم شامل تھی جو ایک کپ دودھ کو میٹھا کرنے کے لیے کافی ہے۔ پتا نہیں آپ کی امی نے یہ ظلم عظیم کیوں کیا کہ آپ کے منہ سے گھڑوں گھڑوں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

حمیرا اکرم منڈو محمد خان سے شریک محفل ہیں

سارے خطوط چھان مارے پر ہمارا خط نہ تھا۔ ٹائٹل گرل اچھی لگ رہی تھی، پہلی شعاع، حمد، نعت، پیارے نبی کی پیاری باتیں سب پسند آئے، دستک میں آمنہ شیخ اور احسن خان سے ملاقات بھی اچھی رہی، شیف ذاکر قریشی سے بہت کچھ سیکھا، سب سے بیسٹ ناول صائمہ جی کا ناول ''شہزاد'' —— قسط بہت مزے کی رہی یہ والی، بہت ٹوئسٹ والا موڑ آ گیا ہے ناول میں ویلڈن صائمہ۔ اس کے بعد رخسانہ باجی کا نیا ناول شام کی حویلی میں پڑھا بہت زبردست رہی پہلی قسط ہی، نعیمہ ناز کا مکمل ناول، گردش ایام کچھ خاص نہ تھا یہ ناول کسی شعاع ہی کے شمارے میں پڑھی ہوئی کسی تحریر سے ملتا جلتا تھا، ہاں شبینہ کا کردار پسند آیا، دونوں ناولٹ میں اچھا ناولٹ سمیرا سرفراز کا قصہ ایک شہزادی کا تھا بہت زبردست لکھا آپ نے سمیرا جی ویری گڈ، دوسرا ناولٹ نگہت محسن علی کا، رب کی بستی میں بھی ٹھیک ہی رہا، سحر ملک کا مکمل ناول ''مٹھی میں جگنو'' ٹاپ پر تھا بہت پسند آیا، مالا کا کردار کافی اچھا رہا، آخر میں افسانے پڑھے، سب کے افسانے بہت اچھے رہے پر یہ آشمین نعیم کا افسانہ ''یار دل دار'' کب ختم ہوگا۔ یہ شمارہ اے ون رہا۔

پ نے اتنی محنت سے خط لکھا، پھر کافی مشکل سے گزر کر پوسٹ کیا اور وہ شائع نہیں ہوا تو افسوس بھی ہے اور غصہ بھی اور یہ دھتکارنے کا لفظ جو آپ نے ہمارے لیے استعمال کیا پیاری بہن! ہم اپنی کسی قاری بہن کو دھتکارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم اپنی قارئین کے خطوط کا اتنی ہی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں جتنی بے چینی سے وہ اپنے خطوط کے شائع ہونے کا انتظار کرتی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ خطوط ہمیں بہت تاخیر سے ملتے ہیں۔ اب آپ کا یہ خط جو ستمبر کے شمارے کے بارے میں ہے ہمیں اکتوبر کا شمارہ پریس جانے کے بعد موصول ہوا آپ کی دل جوئی کے لیے ہم اسے اس ماہ شامل کر رہے ہیں۔ بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے بہت شکریہ۔

ارجمند شاہین حویلیاں ہزارہ سے

شریک محفل ہیں، لکھا ہے

جس کہانی نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے ''وہ میری آخری محبت ہے'' سدرہ نے کمال کا لکھا اور سچ لکھا کیونکہ یہ بالکل میرے ساتھ ہوا۔ تارہ کی جگہ مجھے اپنا آپ چلتا پھرتا نظر آیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ابھی مجھے باقاعدہ فیصلہ نہیں سنایا گیا۔

''موچنگ'' زبردست رہی جس نے افسردہ بھی کیا اور محبت کرنے والوں کو سلام کرنے پر مجبور بھی کیا۔ محبت ہار کے بھی زندہ ہوتی ہے۔

''حاصل لاحاصل۔ بدلتے رشتے۔ جانا کہاں'' سب ہی قابل تعریف رہیں۔ ''یار دل دار'' کو پڑھ کر دل و دماغ دونوں ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں ''چور دروازہ'' بھی قابل تعریف ہے۔

ج: پیاری ارجمند! اللہ تعالیٰ سے آپ کی خوشیوں اور سکون قلب کے لیے دعا گو ہیں۔ ہر تاریک رات کے بعد ایک روشن سحر ضرور ہوتی ہے اللہ سے دعا کرتی رہا کریں۔ ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کا اسپیشل پیغام ان سطور کے ذریعے سمیرا حمید تک پہنچا رہے ہیں۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ف، ح

جب تجھ سے ناتا جوڑا ایک بہترین سلسلہ ہے جہاں ہر کسی کو اپنے تجربات بیان کرنے کا حق حاصل ہے۔ کئی بہنوں کی آپ بیتی پڑھ کر اپنی کہانی کہنے کو میرا بھی جی چاہا۔

س: شادی کب ہوئی؟

ج: جمعہ کے دن 1992 میں ہوئی۔

س: شادی سے پہلے کے مشاغل ودلچسپیاں؟

ج: شادی سے پہلے کچھ خاص دلچسپیاں نہ تھیں۔ ہم دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ بس بہن، بھائیوں اور چند ایک سہیلیوں کے ساتھ ہنسنا، کھیلنا، کودنا، شغل لگانا وغیرہ ہوتا تھا۔ ہم لوگ پنجابی آرائیں ہیں۔ میں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی، میری ہم جولیوں نے آگے داخلہ لے لیا جبکہ میری تعلیم کے آگے تایا جی نے بند باندھ دیے، یہ کہہ کر لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جتنا پڑھ لیا، اتنا ہی کافی ہے۔ اب اسے گھر داری سکھاؤ۔

پورے گھر پر تایا جی کی اجارہ داری تھی۔ ابو جی بھی ان کے ہر فیصلے پر راضی ہوتے تھے۔ اپنا تعلیمی سلسلہ ختم ہونے پر دل تو بہت دکھا، مگر چھوٹی سی عمر میں، میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ پھر جب دونوں بھائیوں کی تعلیم کی باری آئی تو امی جی کے کہنے پر ابو جی نے علیحدگی کی بات کر ڈالی۔ لڑائی جھگڑے مول لے کر علیحدہ ہوگئے تو بھائیوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا آسان ہوگیا۔ ورنہ تایا تو ان کی تعلیم کے بھی حق میں نہ تھے۔ دیکھا جائے تو دیہاتوں میں بیٹوں کو بیٹیوں سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

شادی سے پہلے بھی زندگی سادہ تھی اور سادگی سے ہی گزری۔

س: رشتے میں مرضی شامل تھی؟

ج: نہیں، بس ماں باپ کی مرضی اور فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ جب کسی رشتے دار کے توسط سے میرا رشتہ آیا تو اس وقت میری عمر سولہ، سترہ سال تھی۔ ایک بات بتاتی چلوں کہ میری یہ دوسری منگنی تھی۔

پہلی منگنی بچپن سے خالہ کے گھر طے تھی۔ اور باقاعدہ ہر رسم ہوئی تھی جیسے انگوٹھی پہنانا، پیسے دینا۔ میری عیدی ہر سال آتی تھی، یہ منگنی دس سال قائم رہی تھی۔ ٹوٹی یوں کہ ایک دن خالو کہہ بیٹھے۔

”کڑی تے بہت ہی کمزور وا، اس نوں کھنگ تاپ رہندا وا، اے کو کدڑا گھر دے کم کاج ہونے وا (لڑکی تو بہت ہی کمزور ہے۔ اسے کھانسی بخار رہتا ہے۔ یہ گھر کا کام کاج کیسے کرے گی۔) یہ بات میرا دبلا پتلا جسم دیکھ کر کہی تھی۔ لیکن میری اماں جان کو ان کا یہ طنز بہت برا لگا (یعنی چبھ گیا) اور انہوں نے اسی وقت انکار کر دیا یہ کہہ کر۔

”میری بچی کو اتنا گیا گزرا سمجھ رکھا ہے۔ بیمار لگتی ہے تمہیں تو ختم کر دو یہ رشتہ۔“

بس جی پھر یہ رشتہ اس معمولی بات پر ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد امی جان نے میرے لیے نیا رشتہ تلاش کرنے کی کوشش شروع کی اور ایک زمین دار کا رشتہ ملنے پر ہاں کر دی۔ جب میرے سابقہ منگیتر کو میری شادی کا کارڈ ملا تو وہ کافی عرصے تک افسردہ رہے اور بیمار بھی کیونکہ انہیں پتا نہ تھا کہ رشتہ مکمل طور پر ٹوٹ چکا ہے۔ مجھے بھی بہت دکھ ہوا تھا مگر وہ کہتے ہیں نا ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

س: ذہن میں جیون ساتھی کا تصور کیسا تھا؟

ج: ذہن میں تو وہی تھا جو بچپن میں بزرگوں نے ڈال دیا تھا۔ دل اور ذہن اسی پر خوش اور آمادہ بھی تھے۔ خالہ کی فیملی ہم سے مالی حالات میں کافی بہتر تھی۔ میں تو اسی بات کو سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہتی تھی کہ میری تعلیمی قابلیت کم ہونے کے باوجود مجھے ایک صوبے دار کا ساتھ ملنے والا ہے۔ لیکن مجھے علم نہ تھا کہ وقت بدلنے والا ہے۔

س: منگنی کتنا عرصہ رہی اور کوئی ملاقات وغیرہ؟

ج: نہیں، کوئی ملاقات وغیرہ نہیں ہوئی۔ میری دوسری منگنی سادگی سے ہوئی، منگنی کے ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی اور ایک ماہ بعد سادگی سے شادی ہوگئی۔ وہ اس وجہ سے کہ میرے ہونے والے شوہر کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی ان کی ٹائیفائیڈ کی وجہ سے وفات پا چکی تھیں۔ اور ان کا ایک سات سالہ بیٹا بھی تھا۔ یوں میں صبر و شکر سے بیاہ کر اپنے سسرال آگئی۔

س: شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں خیال؟

ج: دوسری منگنی کے بعد ذہن میں یہ تصور تھا کہ زمین دار ہیں۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ امیر ہیں، عیش ہی عیش ہوں گے لیکن جب میں باقاعدہ گھر پہنچی تو پتا چلا کہ ان کے گھر کچے تھے۔ دو کنال پر مشتمل گھر تھا وہ بھی بے ترتیب اور کچا میرے میکے کی طرف کا چھوٹا مگر پکا تھا۔ میں گاؤں سے ہی بیاہ کر آئی تھی مگر ان کے گاؤں سے ہمارا گاؤں کافی بہتر تھا۔ اور عیش نام کی تو کوئی چیز مجھے نظر نہ آئی۔

س: شادی کے لیے کن چیزوں کی قربانی دینی پڑی؟

ج: کسی خاص چیز کی قربانی نہیں دینی پڑی۔ میری عمر بہت چھوٹی تھی۔ بس ہر لڑکی کی طرح میرے بھی بہت سے خواب تھے اور ان ہی معصوم خوابوں کی قربانی دینی پڑی۔ تعلیم تو آٹھ، نو سال کی عمر میں ہی چھڑوا دی تھی۔

س: شادی بخیر وخوبی ہوئی یا کوئی بد مزگی ہوئی؟

ج: میرے والدین نے ضرورت کی ہر چیز مجھے جہیز میں دی تھی۔ کوئی بد مزگی نہیں ہوئی۔ نہ ہماری طرف سے، نہ سسرال والوں کی طرف سے۔ اس وقت کے دیہاتی ماحول میں بہت کم اس بات کا نوٹس لیا جاتا تھا کہ لڑکی کے جہیز میں یہ نہیں دیا، وہ نہیں دیا۔ بس جو دے دیا جاتا وہی خوشی خوشی رکھ لیا جاتا تھا۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ اب تو ہر نئی آنے والی دلہن کے جہیز پر تعریف یا تنقید کی جانے لگی ہے۔

س: شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج: سادہ سی زبان میں سادہ سے تعریفی الفاظ کہے تھے۔ ”بہت سوہنی لگ رہی او۔“

س: شادی کے بعد کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج: بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں، میں غصے کی تیز ہوگئی وہ اس وجہ سے کہ ساسو ماں مجھ سے چیزیں چھپا چھپا کر رکھتی تھیں۔ میرے کام کرنے سے پہلے ہی کہہ دیتیں۔

”تجھ سے کہاں ہوگا یہ کام، تو کام تھوڑا کرے گی، بگاڑے گی زیادہ۔“

مجھے گھر کا فرد بننے ہی نہیں دیا جا رہا تھا۔ ہر چیز چاہے وہ کھانے کی ہو یا استعمال کرنے کی مجھ سے چھپا دی جاتی۔ یہاں تک کہ کپڑے دھونے والا صابن بھی چھپا دیا جاتا کہ کہیں یہ زیادہ نہ استعمال کر لے۔

مجھے ان دکھاوے کے بڑے لوگوں کی بے انتہا کنجوسی پر بہت افسوس ہوتا۔ جب میرے شوہر گھر میں قدم رکھتے تو مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی انہیں فوراً یہ کہہ کر واپس بھیج دیا جاتا کہ ”پتر فلاں کم کر آ، فلاں کر آ“ اور وہ چلے جاتے۔ جب وہ میرے ساتھ کمرے میں موجود ہوتے تو آوازیں لگا لگا کر انہیں بلا لیتی تھیں۔ کبھی ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھانے دیتیں کہ اس طرح کیا زیادہ پتا چلتا ہے کہ تم دونوں میاں

بقیہ صفحہ نمبر 255

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں نوازاتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی۔ ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

رخسانہ نگار عدنان

شام کی حویلی میں

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر دے رہے ہیں۔اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میرو خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہے۔وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میرو اسے منالے۔وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔سہیل اپنے طور پر پتا کروالیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد سے جانا پہچانا لگتا ہے۔وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہیں کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میرو دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔اس حسین عورت کی طرف میرو شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیختا چلاتا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میرو کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

تیسری قسط

شام کی حویلی میں
یاد کی اندھیری کوٹھڑی میں
پیا نام کا دیا
رات بھر جلتا ہے
سانجھ ڈھلے آن ملے
روپ کا سایہ سا لرزتا کپکپاتا
دیواروں پر ٹمٹماتا ہے
ہجر کی کالی راتوں میں
نیم اندھیرے برآمدوں میں
دائرے سے بناتا
سانپ جیسی سیڑھیوں پر
زینہ زینہ اترتی شام کے سینے پر کالی بلا سی رات کو
بے آواز اشاروں سے کوئی پاس بلاتا ہے
اس ٹمٹماتے لرزتے بجھتے دیے
کو منہ زور آندھیوں سے بجھاتا
شام کی حویلی میں

پلک پلک پر بے رنگ موتیوں جیسے بے مول آنسو جنہیں چننے والی پوریں جانے کس دیس کے کس مکان کی اوٹ میں شاید کسی اور کو دلاسا دیتیں، ریشمی زلفوں کو سہلاتی میٹھی نیندوں میں ہلکورے لیتی آنکھوں نے بھی شاید اس کا سپنا دیکھنا چھوڑ دیا تھا جس کے ہجر میں اس نے اپنی آنکھیں، اپنے سپنے سب کچھ کھو دیا تھا۔

چھناکے کی آواز آئی اور کارنر کی تپائی پر پڑا نازک شیشے سے بنا خوب صورت کرسٹل پیس کئی ہزار کرچیوں میں ڈھل چکا تھا۔

طاہرہ بیگم نے فون کرتے ایک ناگوار نظر اس کونے پر ڈالی جہاں چند سیکنڈ پہلے یہ ناخوش گوار وقوعہ ہوا تھا۔مگر اس بار تو آذر کو بھی ماں کی ان ناگوار نظروں نے ہراساں نہیں کیا تھا وہ اس ٹوٹے کرسٹل پیس اور اس کی کرچیوں سے بے نیاز ماں کی طرف بڑھتے ہوئے چہرے پر خفگی کے تاثرات لیے شاید بہت غصہ کرنا چاہ رہا تھا۔

”ناراضی اگر مجھ سے ہے تو غصہ اس بے جان چیز پر نکالنے کا کیا مقصد ہے آذر؟“ وہ بھی ماں تھیں اور ماں بھی وہ جو اولاد ہی نہیں اولاد کی بھی رگ رگ سے واقف تھیں۔

کسی بھی لگی لپٹی کے بغیر انہوں نے بھی صاف اپنی خفگی کا اعلان کر دیا تھا۔آذر جو واقعی غصہ دکھانا چاہ رہا تھا۔تیسرے قدم پر ٹھٹک گیا۔

”کم از کم اماں جان! آپ کو اور کسی سے نہیں، ہمیں ردا کی مرضی تو چاہیے ہوگی نا اس پرپوزل کو اوکے کرنے کے لیے۔“ اس نے بہت محتاط انداز میں لفظوں کا مناسب چناؤ کرتے ہوئے اپنی ڈھکی چھپی ناپسندیدگی جتادی تھی۔

”تو پھر میں کون ہوں؟“ وہ ٹھنڈے ٹھار انداز میں اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے کچھ ایسی سرد مہری سے بولیں کہ آذر کو لگا اس نے یہ کہہ کر بہت برا کیا ہے ماں کا دل دکھایا ہے۔

اور یہ گناہ...... بلکہ گناہ عظیم تو وہ مر کر بھی گوارا نہیں کرتا۔

”سوری اماں جان...... میں خدانخواستہ آپ کے فیصلے پر اعتراض نہیں کر رہا۔“ وہ جلدی سے معاملہ رفع دفع کرنے کو بولا۔

”اگر ردا کی مرضی نہیں ہوتی‘ وہ منع کر دیتی ہے تو؟“ وہ ہاتھ بلند کر کے اسے مزید بولنے سے روکتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

”نہیں...... وہ اماں جان...... کیوں کرے گی منع؟“ آذر کو اپنی حماقت کا احساس ہوا اگر اماں جان کی فون

کال کا کچھ حصہ سن ہی لیا تھا تو تھوڑا صبر سے سوچ بچار سے سونیا اور ردا سے بات کر کے یہاں آتا۔

''اگر منع کر دیتی ہے تو...... انکار کرتی ہے پھر؟'' ان کا سوال قطب کی لاٹ کی طرح کھڑا تھا۔

''نہیں...... وہ۔'' آزر بس منمنا کر رہ گیا۔

''اگر اس کی مرضی نہیں ہوتی آزر! تو ظاہر ہے پھر تم دونوں میاں بیوی بھی مجبور ہو گے۔ شادی تو اسی کی ہونی ہے نا تو تم لوگ مجھے بھی منع کر دو گے، مطلب میرے فیصلے سے انکار ہی ہوا ناں؟''

اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔

''نہیں۔'' وہ اسے مزید بولنے سے روکتے ہوئے بولیں۔ ''اور جس فیصلے کا پورا اختیار صبح چند گھنٹے پہلے تم میرے ہاتھ میں تھما کر گئے تھے۔ اب اسی پر سوال اٹھا رہے ہو۔ آزر! تم اس ذہنی غلامی سے کب نکلو گے۔ کب تمہارے اندر ایک مردوالی، ایک باپ کی طاقت آئے گی جس کے فیصلے ٹھوس اور اٹل ہوتے ہیں۔ کیا میں ساری زندگی انگلی پکڑ کر تمہیں درست سمت میں چلاتی رہوں گی۔'' بالآخر ان کی پٹاری سے وہ سانپ نکل آیا جو آزر کی کمزوری تھا۔

وہ جب بھی آزر کو اس کی بے طاقتی اور کمزور مردانگی کا طعنہ دیتیں اسے لگتا۔ کوئی اسے اندر تک زخمی کر جاتا ہے۔

وہ بے دم سا ہو کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

ان کے اس طعنے نے جیسے اس کی ساری طاقت' غصہ اور خفگی نچوڑ لی تھی۔

''فیصلہ آپ ہی کا ہوگا اماں جان لیکن ردا......'' وہ بالکل کمزور پڑ چکا تھا۔

''چچ...... چچ...... چچ۔'' وہ زبان سے ترحم بھری آوازیں نکالتیں جیسے آزر کو پورے مرد سے ایک بونا بنا چکی تھیں۔

''تو میرے مرد بیٹے! نکل آؤ۔ اس اگر مگر ہاں ناں کے دائروں سے۔ فیصلہ اگر میں نے کرنا ہے تو فیصلہ ہو چکا۔ اب اسے ردا سے' سونیا سے اور جس سے بھی خاندان برادری والوں یا محلے والوں سے' جس سے بھی منوانا ہے وہ تمہارا کام ہے۔'' وہ اب براہ راست بغیر کسی رکاوٹ کے گویا اس پہ پتھراؤ کر رہی تھیں۔

''ایسے رشتے قسمت والوں کو ملتے ہیں اور ابھی جو کچھ دیر پہلے ہوا' ایسے خوفناک موسم میں خدانخواستہ کوئی بڑا حادثہ ہو جاتا۔''

''اور کیا پتا' ہو ہی چکا ہو۔ تم تو بعد میں پہنچے ناں۔'' آزر تو جیسے ششدر رہ گیا۔ اس کی ماں گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹھے باہر سڑکوں پر ہونے والے ہر حادثے بشمول چھوٹے بڑے سانحے کی خبر رکھتی تھیں۔ اور وہ الو، گدھا دن رات باہر سڑکوں پر رستوں پر آتے جاتے ایسے ہونے انہونے حادثے سے آنکھیں بند کر کے گزر رہا ہے...... کم از کم اماں جان کے طعنوں سے اس نے یہی اخذ کیا۔

''سونیا کو کوئی اعتراض نہیں ہے اماں جان!'' وہ دبے لہجے میں بولا۔

''تو پھر سونیا کی بیٹی کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ جتاتے ہوئے دبنگ لہجے میں بولیں تو وہ حیران سا ماں کی شکل دیکھنے لگا۔

''بیٹیاں تو ماں کا عکس ہوتی ہیں نا تو اسے بھی ماں جیسا تابعدار' مؤدب اور ماں باپ کی عزت کی لاج رکھنے والی ہونا چاہیے۔''

انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے بیٹی کی تربیت کا ''سانچہ'' بھی تشکیل دے دیا۔

''اگرچہ میں جانتی ہوں، تمہیں میری باتیں اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔'' وہ بیٹے کو گم صم بیٹھے دیکھ کر پھر سے بولیں۔

''خدانخواستہ اماں جان! آپ نے ایسا سوچا بھی کیوں؟'' وہ تڑپ کر بولا۔

''نامعلوم کیوں کبھی کبھی...... بلکہ اکثر ہی...... ہمیشہ۔'' وہ اپنے ہی اندازے کی تردید کرتی چلی گئیں ''مجھے لگتا ہے سونیا شکل سے جتنی تابع دار اور سر جھکانے والی لگتی ہے' ہر بات میں جی حضوری کرنے والی...... ایسی اصل میں ہے نہیں۔'' آزر بھونچکا سا ماں کی شکل دیکھنے لگا۔

''اس نامعلوم خدشے کا اظہار تو انہوں نے پہلی بار کیا تھا ورنہ کبھی کبھی موڈ میں ہوتیں تو اکثر کہتیں ''اللہ سونیا جیسی بہو ہر بیٹے کی ماں کو دے۔''

وہ بے بسی سے ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔ پوچھ نہیں سکا انہیں اتنے سالوں بعد یہ خدشہ کیونکر لاحق ہوا۔

''شام میں جو حالت میری تھی۔ سوچی سونیا کی حالت دیکھ کر تو مجھے لگا مجھے ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ خیر بیٹی کی ماں کو ایسا ہی فکرمند ہونا چاہیے، میں مزید رسک نہیں لینا چاہتی۔ سلیمان کے لیے میں ہاں کر چکی ہوں تم چاہو تو ردا سے بات کر لو ورنہ یہ فریضہ اس کی ماں کا ہے۔ وہ اسے ہی ادا کرنا چاہیے۔ بلاؤں کسی کو۔ تم تو کمرے کے دروازے کے پاس کرچیوں کا انبار لگا کر بیٹھ گئے۔'' وہ اٹھنے لگیں۔

''میں بھجواتا ہوں کسی کو، آپ نہیں جائیں۔'' بے دلی سے کہتا ہوا وہ مزید بحث کیے بنا کمرے سے نکل گیا۔

طاہرہ کے چہرے پر ابھی بھی ناپسندیدگی کے تاثرات تھے۔ انہیں آزر کا ''ردعمل'' اچھا نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

''وہی جو ہر اس لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے جس کے شوہر کو باہر جانے کا جنون ہو' اپنے گھر اور گھر والوں کو آسائشوں کی جنت میں بسانے کا ارمان پالنے والوں کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کو چاہنے والوں کو ان آسائشوں کی نہیں ان کے ساتھ کی ہوس ہوتی ہے۔ ان کی محبت کا لالچ ہوتا ہے۔ ان کی ہمسفری کی آرزو ہوتی ہے۔''

وہ جانے کون سے خلا میں جھانکتی' ماضی کے کس منظر میں گم پاس لیٹی کشف کے وجود سے بے خبر رک رک کر بول رہی تھی۔

''آنی! بابا کون سے ملک گئے تھے؟'' وہ چپ ہوئی تو کئی منٹ گزر گئے۔ وہ چپ تھی۔ شاید ماضی کے کسی منظر کا حصہ بن کر وہیں رہ گئی تھی۔

کشف کے پوچھنے پر چند لمحے وہ اسے انجان سی نظروں سے دیکھتی رہی۔

''ان دنوں میر منصور کا دوست تھا امریکا میں۔ اس نے میر کو اسپانسر کیا تھا پھر بیس بائیس سال پہلے امریکا جانا اتنا جان جوکھوں کا کام نہیں تھا' جتنا آج کل ہے۔'' وہ بمشکل حال میں پلٹی تھی۔

''میر منصور......!'' وہ دہرا کر بولی۔ ''مگر آنی! میرے نام کے ساتھ تو صرف منصور لگا ہے۔'' اس کے سوال پر زینب اسے بس دیکھتی رہ گئی۔

''میر منصور اچھا نام ہے تو آنی میرے نام کے ساتھ صرف منصور کیوں لگوایا آپ نے؟'' وہ پھر اشتیاق بھرے اصرار سے پوچھنے لگی۔

شاید وہ بھی اس نام کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی جس میں سالوں بلکہ صدیوں سے زینب قید تھی۔

''میرا بس چلتا تو شاید یہ بھی نہ لکھواتی۔'' جیسے تیسے اس کے منہ سے ناگواری سے نکلا۔

کشف اس کی کیفیت کو دوسرے لمحے سمجھ گئی۔

”ناراض ہیں نا آپ بابا سے۔ ہونا بھی چاہیے انہوں نے اتنے سالوں سے آپ کی خبر لی نہ میری۔ اگر وہ اپنی فیملی کے لیے باہر گئے تھے تو پھر پلٹ کر ہماری خبر کیوں نہیں لی۔“ وہ بھی ماں کا ساتھ دیتے ہوئے بولی۔

زینب کچھ نہیں بولی بس اس کے ریشمی بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں چلاتی کھڑکی سے نظر آتے اندھیرے آسمان کو دیکھتی رہی۔

بادل تو نہیں تھے آسمان پر لیکن کالا سیاہ مٹیالا آسمان تاروں سے خالی تھا۔ شاید اس کے دل کی طرح جو ہر امید سے خالی تھا۔

”پھر...... پھر کیا ہوا آپ کا ان سے کانٹیکٹ نہیں ہوا؟“ کشف اس کی لمبی چپ پر بے قراری سے بولی۔

”ہوتا رہا...... مگر رابطے بھی اسی وقت قائم رہتے ہیں جب یہ دو طرفہ ہوں صرف ایک شخص کی کوشش سے بھلے اس کے دل میں کتنی آرزو کتنی شدت ہو دوسرا رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تو سب شدتیں بے فائدہ ہوتی ہیں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بجھے ہوئے دل سے بولی۔

”مگر کیوں...... کیوں وہ آپ سے ہم سے رابطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔“ وہ تڑپ کر پوچھ رہی تھی۔

”یہی سوال میں نے بارہا اس سے اور پھر خود سے کیا تھا اس کا جواب پہلے ٹالنے اور بہلاوے والا تھا پھر خاموشی اور پھر...... کچھ بھی نہیں اور بہت سال میں یہ سوال خود سے کرتی رہی پھر ایک دن مجھے کہیں سے اس سوال کا جواب بھی مل ہی گیا۔“ وہ گہرا سانس لے کر کہنیوں کے بل ذرا سا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

کشف بھی سر اٹھا کر ماں کی شکل دیکھنے لگی۔

”کیا...... کیا پتا چلا آپ کو بابا کیوں دور ہو گئے تھے؟“ وہ بے چین تھی۔

”اسے وہاں کوئی ہم جیسا مل گیا تھا شاید اس نے شادی کر لی تھی۔ اس کی اپنی نئی فیملی بن گئی تو شاید وہ مجھے ہم دونوں کو فراموش کر گیا۔“ وہ نظریں جھکائے شاید آنکھوں سے امڈنے والے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

کشف یک ٹک ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔

”اور جب مجھے یہ پتا چلا تو کشف! میرے سینے میں اٹھتے جوار بھاٹے کو جیسے قرار مل گیا۔ میں نے ہر آس ہر امید کا دھاگہ خود اپنے دانتوں سے زور لگا کر توڑ دیا۔“ وہ پھر سے ماضی میں گم ہو رہی تھی۔

انہوں نے بھی پھر آپ سے بات نہیں کی، ملنے نہیں آئے۔“ وہ ٹوٹے دل سے پوچھ رہی تھی۔

زینب نے بمشکل نفی میں سر ہلایا۔ آنکھوں میں اترتے پانیوں کو پیچھے کی طرف دھکیلا۔

”انہیں میری یاد بھی نہیں آئی ہو گی آنی؟“ کشف رندھی آواز میں شاید دل میں اپنی بے قراری کا حساب لگا کر بمشکل بولی۔

”نہ آئے میری جان! میں جو ہوں تمہارے لیے تمہارا سب کچھ۔ بچپن سے لے کر آج تک بتاؤ‘ کیا میں نے کبھی اپنی بیٹی کو کسی چیز کی کمی محسوس ہونے دی؟“ وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر شدید محبت بھرے جذبے سے کہتی جیسے کشف کے ٹوٹے دل کو دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اور میری جان! ہم دونوں ہیں نا ایک دوسرے کے لیے۔ پھر ہمیں کسی تیسرے کی کیا ضرورت؟“ وہ اسے تسلی دینے کو بولی۔

”یہ تو ٹھیک ہے نا آنی! وہ ”کسی“ تیسرا نہیں ہے وہ آپ کے شوہر اور میرے فادر ہیں۔“ وہ عمر کے جس حصے میں تھی اس میں جذبات کو چھپانا نہیں آتا۔ زینب نے ایک دم سے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے۔

”اگر اس کی زندگی میں ہماری کوئی جگہ نہیں تو ہم کیوں اس کے لیے اپنے گزرتے ہوئے اچھے وقت کو خراب کر لیں۔ اور کشف میری جان دنیا میں ایسے بھی تو بچے ہوتے ہیں جن کے باپ مر جاتے ہیں تو تم بھی یہی سمجھو۔“ وہ رک رک کر شاید اسے سمجھانے کے لیے کہہ رہی تھی۔

”میرے بابا زندہ ہیں۔ آپ کس طرح یہ بات کہہ سکتی ہیں آنی! میں ایسا کیوں سمجھوں۔ ٹھیک ہے انہیں ہماری پرواہ نہیں۔ ہم سے محبت بھی نہیں لیکن ایک بار...... ایک بار تو میں ان سے ملوں گی‘ ضرور ملوں گی‘ چاہے ان کا گریبان پکڑ کر ساری دنیا کے سامنے انہیں یاد دلاؤں کہ مجھے پہچانیے میں کون ہوں۔ میں اپنا حق آپ کو بھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ جوش میں آ کر بولتی چلی گئی۔

زینب ایک دم سے تڑپ کر سیدھی ہوئی۔

”ہرگز نہیں...... بالکل بھی نہیں۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گی نہ تم اس سے کوئی سوال کرو گی نہ تقاضا کرو گی۔ بلکہ، بلکہ تم اسے باپ بھی نہیں کہو گی۔ وہ شخص باپ کہلانے کا حق دار نہیں جس نے اتنے سالوں میں ایک بار بھی تمہاری شکل دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ تمہیں پیار کرنے‘ سینے سے لگانے کی آرزو نہیں کی...... تم اس سے کبھی نہیں ملو گی۔ اسے بابا بھی نہیں پکارو گی۔ میری اتنی سی خواہش، اتنی سی بات تو تم مانو گی ناں!“

”آنی!“ کشف ششدر سی اس کے جلال بھرے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

”یہی...... یہی سزا ہو گی اس کی...... اس کی بیٹی اسے باپ نہیں کہے گی اور...... میں اسے شوہر کا درجہ نہیں دوں گی۔“ زینب شدید جذباتی انداز میں کہتی بکھرے بال ہاتھوں سے درست کرتی پلنگ سے اتر کر باہر کی طرف بڑھی۔

”پر آنی! میں انہیں بابا کہوں یا نہیں۔ آپ انہیں شوہر کا درجہ دیں یا نہیں مگر میں ایک بار ان سے ملوں گی ضرور۔“

کشف کے لہجے میں کیسا عزم تھا کہ دہلیز پار کرتی زینب ان ہی قدموں پر ٹھٹک گئی۔

”میں نے کہا ناں۔ تم نہیں ملو گی اس سے کبھی بھی۔“ وہ حلق کے بل چلائی تھی۔ کشف کو اس سے ایسے ردعمل کی امید نہیں تھی۔

”اور اگر وہ تمہارے سامنے آ بھی جائے‘ میں زندہ ہوں یا مر چکی ہوں۔ تم اس شخص کو بابا نہیں کہو گی ورنہ...... ورنہ میں سمجھوں گی تم نے اپنی ماں کی ساری محنت کو، اس کی محبت کو گالی دی ہے۔“ وہ پاگلوں کی طرح اس کے پاس آ کر اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ کر کہنے لگی۔

کشف اس کے انداز سے کچھ ہراساں سی ہو گئی تھی۔ لیکن اسے لگا شاید یہی فیصلے کی گھڑی ہے۔ آج ہی سب کچھ طے نہیں کیا تو وہ بعد میں زینب سے کچھ بھی نہیں منوا سکے گی۔

”باپ کو اگر باپ نہ کہو تو معاشرہ گالی دیتا بھی ہے اور آپ کے وجود کو گالی بنا بھی دیتا ہے۔ یہ چاہتی ہیں آپ؟“ اس کے سرد لہجے میں کہے جملے نے لمحہ بھر کو زینب کو ساکت سا کر دیا۔

”اور یہی گالی جب آپ کو پڑے گی۔ میرے وجود اور آپ کے لیے سوالیہ انگلیاں اٹھیں گی تو میں برداشت نہیں کر سکوں گی اور شاید آپ بھی نہ کر سکیں۔“ وہ اب کے قدرے نرم پڑ کر ماں کو سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ زینب صدمے کی کیفیت میں نفی میں سر ہلاتی جا رہی تھی۔

”آنی! اسی گندی بات پر تو میری بتول خالہ سے منہ ماری ہوئی، پلیز مجھے اس بات کے لیے پابند نہیں کریں۔ میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔“ وہ ماں کو کندھوں سے پکڑ کر منت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

[illegible]

''آج تو تم نے مجھے میری ممتا کو میری نظروں میں بے وقعت کر دیا۔ میں تو پھر کچھ بھی نہیں ہوں۔ محض زیرو...... صفر۔ کچھ بھی نہیں جس میں سے سب کچھ مائنس کر دیا گیا ہو...... تم بھی...... میر منصور بھی۔

وہ عجیب لٹے پٹے سے انداز میں پلنگ پر گر سی گئی تھی۔ کشف کو احساس ملامت نے آ گھیرا۔

''یہ نہیں تھا میرا مطلب...... اب آنی! ایک بار تو اس کا گریبان پکڑنے کا مجھے حق ہونا چاہیے ناں۔'' وہ ماں کے پاس بیٹھ کر شرمندہ سے لہجے میں جیسے صفائی دیتے ہوئے رک کر بولی۔

''یہ حق اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ صرف میں ہوں۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گی' کوئی ایسا حق نہیں تم پر اس کا اور نہ تمہیں اس پر۔'' وہ پھر سے اسی جلدی میں بولی۔

کشف ماں کو الجھے ہوئے انداز میں دیکھے گئی۔ پھر اپنا تکیہ اور چادر اٹھا کر اپنے پلنگ کی طرف بڑھ گئی۔

''لیکن یہ میں طے کر چکی ہوں کہ چاہے مجھے امریکہ کیوں نہ جانا پڑے۔ میں میر منصور سے ملنے ایک بار ضرور جاؤں گی۔''

زینب کمرے کی لائٹ آف کر کے اپنے پلنگ پر تکیہ ٹھیک کر کے جیسے ہی لیٹی تھی اس کے کانوں میں کشف کی قطعی لہجے میں کہی گئی بات نے جیسے کرنٹ دوڑا دیا۔

''کشف!'' وہ چلائی۔

''مجھے نیند آ رہی ہے آنی! اور پلیز مجھے صبح جلدی اٹھا دیجیے گا۔ میں نے اپنے اسائنمنٹ پر کام کرنا تھا' سارے دن میں جو کچھ ہوا۔ وہ بھی سب میرے دماغ سے نکل گیا۔ پلیز صبح نماز سے بھی پہلے کا الارم لگا لیں' مجھے کام کرنا ہے کافی۔'' وہ یوں عام سے لہجے میں کہہ رہی تھی جیسے ان کے درمیان اس سے پہلے بڑی خوش گوار روٹین کی باتیں چل رہی تھیں۔

مگر زینب جانتی تھی۔ اب کچھ بھی دونوں کے درمیان پہلے جیسا نہیں ہو سکتا۔ وہ کشف کی فطرت کو اتنا تو سمجھتی تھی ماں ہونے کے ناتے' وہ جس بات کے لیے دل میں ٹھان لیتی ہے پھر اسے پورا کرنے سے دنیا کی کوئی بھی طاقت اسے نہیں روک سکتی۔

''مجھے اسے کچھ بتانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ پاگل ہو گئی تھی جو میں اسے سب کچھ بتانے بیٹھ گئی۔ اب یہ اس بات سے ٹلے گی نہیں...... اور وہ، وہ ہے کہاں...... شاید کہیں بھی نہیں...... جو کہیں نہیں، اس کی تلاش فضول ہے میں اسے پھر سمجھاؤں گی۔''

وہ بے چینی سے کشف کی طرف کروٹ لے کر اسے دیکھنے لگی جو شاید غنودگی میں جا چکی تھی۔

☆☆☆

''کچھ نہیں ماما!'' ردا نظریں جھکائے آہستگی سے بولی۔

''مت چھپاؤ مجھ سے کچھ بھی...... میں ماں ہوں تمہاری...... مجھے سب کچھ معلوم ہونا چاہیے۔'' سونیا وحشت زدہ سی اسے جھنجھوڑتے ہوئے زور سے بولی۔ ردا لمحہ بھر کو حق دق سی رہ گئی۔

''ماما! کہا ناں، کچھ بھی نہیں ہوا...... میں بس ڈر گئی تھی بہت زیادہ۔ بارش بہت تیز تھی اور وہ راستہ اجنبی اور سنسان۔ اچانک سے کوئی کالے رنگ کا کتا یا شاید بلی کہیں سے اڑتی ہوئی میری گاڑی کی ونڈ اسکرین سے ٹکرائی میں بریک بھی ٹھیک سے نہیں لگا پائی۔ گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرائی بڑا نقصان نہیں ہوا لیکن مجھے لگا...... میں چیخیں مار کر رونے لگی پھر پاپا کا فون آیا تو۔'' وہ جیسے خود کو سنبھالتے ہوئے رک گئی۔

''میں ڈر گئی تھی بس!'' اس نے دہرا کر پھر جیسے ماں کو تسلی دینے کی کوشش کی جو اسے ابھی بھی شاکی سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ایک اور گہرا سانس لے کر سونیا نے جیسے خود کو کمپوز کیا۔ اس نے آہستگی سے ردا کے ہاتھ تھامے۔

''مائی گاڈ! تم تو برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی ہو ردا...... کیا ضرورت تھی شاور لینے کی۔'' وہ اس کی فکر میں خفا ہوتے ہوئے بولی۔

''بال بھی بھیگ گئے تھے میرے اور کپڑے بھی پھر...... کچھ عجیب سی فیلنگز ہو رہی تھیں جیسے کیچڑ کے چھینٹے پڑ گئے ہوں میرے کپڑوں پر۔'' وہ ماں سے شیئر کر رہی تھی۔

سونیا پھر سے کچھ پریشان سی اسے دیکھنے لگی۔

''لیکن آپ پریشان نہیں ہوں ماما! میں ٹھیک ہوں بالکل' پاپا آ گئے تھے تو میں ایک دم سے ٹھیک ہو گئی تھی اور آپ کیوں اتنا پریشان ہو جاتی ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے ماما!'' وہ ماں کے ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگا کر محبت اور فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔

سونیا کو اس پر ایک دم سے پیار آیا۔

''اولاد کی سانسوں اور اس کی سلامتی کے ساتھ ماں کی سانسیں جڑی ہوتی ہیں خدانخواستہ ایسی کسی بھی سچویشن پر کمپوزڈ رہنا کسی بھی ماں کے بس میں نہیں ہوتا ردا۔'' وہ بیٹی کے بال برش کرنے لگی تھی۔

''ساری مائیں آپ جیسی نہیں ہوتیں ماما!'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''دادو کو دیکھ لیں' کتنی بہادر ہیں وہ...... ہے نا؟''

سونیا کا اس کے بالوں میں گردش کرتا برش والا ہاتھ تھم گیا۔

''کچھ غلط کہا میں نے ماما؟'' وہ پلٹ کر ماں کو دیکھ کر بولی۔

''نہیں۔'' سونیا نظریں چرا کر رہ گئی۔

وہ چند لمحے خاموش رہیں جیسے سوچ رہی ہوں کہ یہ بات اس وقت کی جانی چاہیے یا نہیں۔

''ردا!'' سونیا فیصلہ کرتے ہوئے بولی۔

''ماما! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' ردا نے شاید سنا نہیں تھا۔

''تمہاری دادو نے ایک جگہ...... اپنی امریکا میں بھتیجی شائستہ کے بیٹے سلیمان کے ساتھ رشتہ طے کر دیا ہے۔'' سونیا نے ردا کی بات ان سنی کرتے ہوئے ایک دم سے سب کچھ کہہ دیا تھا جو وہ اتنے دنوں سے کہنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

یہ ہمت اسے شام کے ان چند گھنٹوں نے دی تھی جو اس نے ردا کی گمشدگی کے دوران گزارے تھے۔

''بیٹی جوان ہو جائے تو پھر اسے رخصت کرنے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرو ورنہ بعد میں بہت سارے پچھتاوے ہاتھ ملنے لگتے ہیں۔'' شام میں پتا نہیں کیوں مدتوں پہلے مری ماں کے کہے جملے اس کے کانوں میں کوئی سیسے کی طرح انڈیلتا رہا تھا۔

اور ان ہی لمحوں میں اس نے جلد سے جلد ردا کی شادی جہاں اس کا باپ دادی طے کر رہے تھے کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''ماما پلیز۔'' ردا تڑپ کر پلٹی تھی' اس کے ہاتھ سے ہیئر برش چھین لیا تھا۔

سونیا حیرانی سے دیکھنے لگی۔

''شادی میری زندگی کا معاملہ ہے۔ کیا اس فیصلے میں مجھے بولنے کا حق نہیں ہے۔ دادی کیوں فیصلہ کریں گی۔'' سونیا ششدر سی اسے دیکھ رہی تھی۔

''وہ اس گھر کی بڑی ہیں اور اس طرح کے فیصلے گھر کے بڑے ہی کیا کرتے ہیں۔'' سونیا نے جتاتے

for more novels and digests

ہوئے زور دیا۔

"یہ آپ کے زمانے کی بات ہوگی۔ ہم اس کھونٹی سے بندھ کر زندگی گزارنے کا فیصلہ قبول نہیں کر سکتے جو ہماری مرضی کے بغیر ہو...... میں جبران کو پسند کرتی ہوں اور اسی سے شادی کروں گی۔" وہ بھی تند و تیز لہجے میں بولتی چلی گئی۔ کیونکہ سونیا کے انداز سے وہ سمجھ گئی تھی کہ اگر اب بھی نہیں بولے گی تو پھر زندگی بھر زبان بند ہی رکھنی پڑے گی۔

سونیا نے ایک زناٹے دار تھپڑ ردا کے منہ پر مارا۔

وہ پیچھے کو گرتی ہوئی گال پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کو دیکھتی رہ گئی۔

"ایسا کبھی مر کر بھی نہیں سوچنا کہ تمہاری شادی وہاں ہوگی جہاں تم نے محبت کی پینگیں بڑھائی ہوں گی۔" سونیا کے لہجے میں ناقابل بیان نفرت تھی۔

ردا کو ماں سے ایسی توقع نہیں تھی۔ اس نے کبھی...... کبھی بھی تینوں بچوں کو پھولوں کی چھڑی سے نہیں مارا تھا کجا کہ تھپڑ مارنا۔

"پلیز ماما...... میری محبت کو یوں گالی نہیں دیں۔ میں نے جبران سے بہت پاکیزہ محبت کی ہے۔ شادی کرنا چاہتا ہے وہ مجھ سے اور اپنی امی کو لے کر آنا چاہتا ہے ہمارے گھر۔" وہ بغیر کسی ڈر خوف کے اونچا اونچا بولی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے آ رہے تھے۔

اس کی گردن دبوچ کر سونیا وحشت بھرے انداز میں اس پہ جھپٹی تھی۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا نہ تم اس گمان میں رہنا کہ میں تمہیں ایسا کچھ کرنے کی اجازت دوں گی۔ تمہاری شادی وہیں ہوگی جہاں تمہاری دادی فیصلہ کر چکی ہیں اور تم ایک لفظ نہیں بولو گی۔" کہہ کر اسے پرے جھٹک کر تیزی سے آگے بڑھی۔ دروازہ کھولتے ہی سامنے کھڑے آزر کو دیکھ لحہ بھر کو ٹھٹکی پھر کترا کر چلی گئی۔ آزر کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

"تو اس لیے آنی نے ہمیشہ مجھ سے یہ بات چھپائی۔ مجھے میرے باپ کا پورا نام تک نہیں دیا۔" وہ کچھ کھچی کھچی بھری ہوئی تھی۔

لوگوں کا شور' باہر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کا شور' رکشے والے' تانگے والے' چنگ چی والے آپس میں راہ چلتے رک کر یونہی حال احوال پوچھتے بات کو طول دیتے' مذاق میں ایک دوسرے کے پیچھے بازاری آوازیں کستے۔ ہر طرح کے شور سے کان بند کیے وہ اپنے ہی اندر مچے گھمسان کے رن میں کھوئی تھی۔

"نہ مجھے کبھی بابا کی کوئی تصویر دکھائی' ان کی کوئی نشانی' نہ ان کے حوالے سے کوئی چیز کوئی حوالہ کچھ بھی تو نہیں۔" اسے ماں سے گلے شکوے کرتے ہوئے عجیب سی ہزیمت کا احساس ہو رہا تھا۔

"وہ کیوں مجھے ان سے ملنے کے لیے منع کر رہی ہیں۔"

"وہ اپنے انتقام کے لیے مجھے استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ یہ ماں باپ جن کی رحم دلی' محبت اور اولاد کے لیے بے لوث چاہت ضرب المثل ہے' اپنی خود غرضی کے لیے کیسے اولاد کو ہتھیار بناتے ہیں۔"

اس کے اندر غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اتنی شدت سے کہ اگر اس وقت اس کا باپ کہیں سے سامنے آ جاتا تو صرف زینب کی ضد میں وہ ضرور کئی بار اسے بابا کہتی بلکہ اس کے گلے سے لگ کر بہت سارا پیار بھی کرتی۔

اس کی دماغی رو جانے کہاں سے کہاں بھٹکتی جا رہی تھی۔

وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں گم باپ کے مختلف خاکے بناتی اس کے ساتھ دل کی باتیں کرتی جانے کہاں پہنچ گئی تھی جب ایکا ایکی اسے گھیرے سناٹے کا احساس ہوا۔

اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ پوری ویگن خالی ہو چکی تھی۔ ویگن اپنے آخری اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ گویا وہ اپنی یونی کے اسٹاپ سے بھی آگے نکل گئی تھی۔

"یا اللہ حد ہے پاگل پن کی بھی...... یہ میں نے کیا کیا؟" وہ کوفت کھاتی' جھنجلاتی ویگن سے تیزی سے اتری تھی۔

بس کا ڈرائیور اور کنڈیکٹر ایک طرف کھڑے اس اسٹاپ کی سواریوں کے انتظار میں منہ سے لگائے سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتے اسے عجیب سی نظروں سے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہے تھے۔

وہ کوئی کمزور لڑکی نہیں تھی۔ اندرون شہر کے جس علاقے سے اس کا روز کا آنا جانا اور گزرنا تھا۔ وہاں مردوں کی ایسی نظریں بڑی عام سی بات تھی۔

عورتوں کو اس طرح گھورنا اور گھورتے چلے جانا شاید انہوں نے اپنا پیدائشی حق سمجھ لیا تھا۔

اور ان راستوں سے گزرتی عورتوں لڑکیوں نے بھی اب ان کی اس حرکت پہ ایک خاموش سمجھوتا کر لیا تھا۔ وہ اب نہ تو ان نظروں سے الجھتی تھیں' نہ سوال و جواب کرتی تھیں مگر یہاں اس ویرانے میں اس بے باکی سے گھورتی نظروں نے حقیقتاً اسے سہا کر رکھ دیا تھا۔

وہ اسٹاپ کا جائزہ لے کر کسی بھی آنے والی وین یا بس کا انتظار کیے بغیر یونہی منہ اٹھائے اجنبی علاقے میں تیز تیز چلتی جا رہی تھی جیسے ان سارے راستوں سے وہ روز گزرتی رہی ہو۔ اس وقت تو اسے بس یہاں سے نکلنا تھا۔

☆☆☆

وہ پوری تن دہی سے اس انتہائی بدتمیز کلاس کو حساب پڑھانے کی کوشش کر رہی تھی جو کسی بھی طرح کچھ پڑھنے یا سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

"میم! ہمارے سر نے کہا ہے' یہ ٹاپک ایگزام میں نہیں آئے گا تو اس کی تیاری نہ کریں۔ ٹائم ویسٹ نہیں کریں۔" ممی ڈیڈی کا اکلوتا لاڈلا ٹیڈی بیئر جیسا روفی کھڑا ہو کر بغیر کسی لحاظ کے بولا تھا۔

"جی میم! ہمیں یہ ٹاپک سمجھ میں نہیں آتا اور نیکسٹ کلاس میں اس سے ریلیٹڈ کوئی چیز نہیں ہے تو ہم یہ نہیں پڑھیں گے۔"

ساری کلاس روفی کی ہم خیال ہو کر بولی تھی۔

"یہ کون سے سر نے کہا ہے آپ لوگوں سے؟" وہ تحمل سے بولی۔

"میری اکیڈمی کے سر نے۔" وہ اسی طرح زینب کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"اوکے۔ میں نہیں پڑھاتی۔ اب جو یہ چیپٹر نہیں پڑھنا چاہتا' وہ میرے ساتھ پرنسپل کے آفس تک چلے تاکہ میم سے خود بات کر سکے کہ سلیبس کا یہ آخری چیپٹر ایگزام میں شامل ہی نہیں کیا جائے گا۔"

وہ بھی کتاب بند کر کے ہاتھ میں پکڑے چلنے کو تیار ہوئی۔

بچے کچھ پریشان اور متذبذب انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"ویلیس گو کلاس...... آئی ایم ویٹنگ۔" وہ دروازے کے پاس پہنچ کر مڑ کر بولی۔

"روفی! آپ تو چلیں بلکہ لیڈ کریں پوری کلاس کو۔" اس نے اس انگلی سے روفی کو اشارہ کیا جواب بینچ پر بیٹھا گردن جھکائے اپنے بیگ میں سے یونہی کچھ تلاش کرنے میں مگن تھا۔

"میم! یہ تو مجھے علشبہ نے کہا تھا کہ میم سے یہ کہنا۔" روفی نے جب ساری بات خود پر آتے دیکھی تو جھٹ سے کھڑا ہو کر بولا۔

جھوٹ بول رہا ہے میم! میں نے اس سے یہ نہیں کہا تھا۔" علشبہ تڑپ کر اٹھ کر بولی۔

"جھوٹ تم بول رہی ہو۔ ابھی کلاس اسٹارٹ ہونے سے پہلے تم نے کیا کہا تھا مجھ سے؟" روفی بھی دوبدو بولا۔

"اور میم! اس نے ساری کلاس سے یہ بھی کہا تھا کہ جب ہم بات کریں تو آپ لوگوں نے ہمارا ساتھ دینا ہے۔" روفی خود کو بچانے کے چکر میں علشبہ سے تین سال پرانی دوستی بھی قربان کرنے کو تیار تھا۔

"اوکے...... تو پوری کلاس چل رہی ہے پرنسپل کے آفس اور یہ سب کس نے کس کو کہا تھا۔ اس کا فیصلہ بھی وہیں ان کے آفس چل کر ہو جائے گا۔" زینب اب جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچانے کے موڈ میں تھی۔

بچے گھبرا چکے تھے۔

"قسم! نو میم! ہم نے یہ نہیں کہا تھا' ہمیں روفی اور علشبہ نے کہا تھا...... ہم تو یہ چیپٹر پڑھنا چاہ رہے تھے۔" مرحا ودیئے کو بھی کلاس کی نمائندگی کرتے ہوئے کھڑی ہو کر بولی اور رونے لگی۔

علشبہ اور روفی کے لیے یہ سچویشن خطرے کی گھنٹی تھی۔

"سوری میم...... پلیز ایکسکیوز کر دیں...... پلیز۔" روفی کھسیا کر بولا۔

"آئی ایم رئیلی سوری میم!" علشبہ بھی بھنچی آواز میں روفی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ اسی وقت بریک کی گھنٹی جیسے ساری ہی کلاس کے لیے زندگی کی نوید بن کر ٹن ٹن بجی تھی۔

"اوکے...... اس پر ہم کل بات کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" اس نے قطعی معافی کا اعلان کیے بغیر اپنا بیگ اور رجسٹر اٹھا کر مڑ کر دیکھے بغیر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

کلاس میں چہ مگوئیاں اونچی آوازوں میں اور آوازیں شور میں بدل رہی تھیں۔

وہ قدرے خاموش جگہ پر تیزی سے پہنچی تھی۔

اس کا فون جانے کب سے بجے جا رہا تھا۔

کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے کونے میں پڑی کرسی گھسیٹ کر چھاؤں میں رکھی اور اس پر بیٹھ گئی۔

"زینب! فارغ ہو گئی ہو تم؟" حیدر بھائی کا سوال اسے چونکا گیا۔

"شاید آج کام ہو جائے۔" اس کے دل نے خوش فہمی کی اڑان بھری۔

"ابھی تو نہیں حیدر بھائی! بریک ہوئی ہے۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"ایکچوئلی میں آفس سے کسی کام سے نکلا تھا۔ تین گھنٹوں کی بریک ہے میرے پاس تو میں سوچ رہا تھا ہم سرفراز صاحب سے مل لیں۔ میں نے کال کی تھی وہ اپنے آفس میں ہی موجود ہیں۔" وہ اسے تفصیل بتانے لگے۔

"مگر میں ابھی دو گھنٹے سے پہلے تو نہیں نکل سکوں گی۔" وہ کچھ پریشان ہو کر بولی۔

"نو پرابلم۔ میں ابھی آفس سے نکلا ہوں۔ تمہیں پک کرنے میں تقریباً سوا گھنٹے تک آ سکوں گا۔ اپنا کام ختم کر کے اس وقت تک تو فری ہو ہی جاؤ گی۔"

"چلیں آپ آ جائیں میں بات کر لوں گی پرنسپل سے۔ تھوڑا پہلے نکل آؤں گی۔ یہ کام بھی تو ضروری ہے نا۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"اوکے تو میں گھنٹے تک تمہیں پک کرنے آ رہا ہوں۔"

"جی بہتر!" وہ فون بند کرنے کو تھی۔

"طبیعت کیسی ہے اب تمہاری؟" انہوں نے رک کر پوچھا۔

"ٹھیک ہوں بالکل اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کل میں بے ہوش کیسے ہو گئی تھی۔ بس سر کے پچھلے حصے

[illegible]

"تمہیں اپنا کمپلیٹ چیک اپ کرانا چاہیے۔ اس طرح بے ہوش ہونے کی کوئی وجہ تو ہو گی۔" وہ فکرمندی سے بولے۔

"بی پی لو تھا میرا' کل لنچ میں کچھ نہیں کھایا اور آپ کے کنجوس آفس والوں نے بھی خالی سڑی ہوئی چائے کا ایک کپ پلایا تو میں بے ہوش نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔" وہ مذاقاً ہنسی۔

"اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ تم نے لنچ نہیں کیا۔ بتا دیتیں تو میں کچھ منگوا لیتا تمہارے لیے۔" وہ ہمیشہ کی طرح اس کا خیال کر کے بولے۔

"اچھا میں ٹھیک ہوں بالکل آپ فکر نہ کریں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"ابھی لنچ کر لیا ہے یا آج بھی گول کرو گی؟" فون رکھتے ہوئے پھر سے خیال آنے پر پوچھنے لگے۔

"کرنے لگی ہوں۔ سر میں درد سا ہے اسنیکس کے ساتھ چائے اور ٹیبلٹ لیتی ہوں۔"

"اوکے ٹیک کیئر' اللہ حافظ۔" حیدر نے فون بند کیا تو وہ سوچنے لگی۔

"مجھے ڈاکٹر موحد کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ وہ بے چارہ مہربان شخص گھر تک آیا اور میں اسے چائے تک نہیں پلا سکی۔"

اس نے فوراً موحد کا محفوظ کیا ہوا نمبر ملایا۔

کال ریسیو نہیں ہوئی۔ دوسری بار کی کوشش کے بعد اس نے میسج لکھ کر بھیج دیا۔

دور سے گزرتی آیا کو دیکھ کر اسے کچھ کھانے کا خیال آیا تو اسے اشارہ کر کے پاس بلا کر چائے کے ساتھ کچھ لانے کو کہا۔ اس کے سر میں واقعی درد تھا۔ خاص طور پر پچھلے حصے میں۔

صبح کشف بالکل خاموش تھی۔ اپنی اسائنمنٹ بناتی رہی۔ رات جو کچھ وہ بول رہی تھی مجھے لگا شاید وہ پھر اس پہ بات کرے گی مگر اس کی خاموشی! مجھے ابھی اسے یہ سب کچھ نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ ڈسٹرب ہو گئی ہے۔

اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر نیلگوں آسمان پر کہیں کہیں اڑتے پرندوں کو دیکھا۔

"مگر کسی نہ کسی دن تو اسے بتانا ہی تھا سب کچھ اور میں کب تک اس سے سب چھپا سکتی تھی۔" اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔

"پتا نہیں اللہ نے میری ہی زندگی اتنی مشکل اور قابل رحم کیوں بنائی۔ اب تو کبھی کبھی لگتا ہے میں بھاگتے بھاگتے تھکنے سی لگی ہوں۔" سر سیدھا کر کے گراؤنڈ میں بھاگتے دوڑتے بچوں کو محویت سے دیکھنے لگی۔

"نہیں مجھے ابھی اپنے بارے میں نہیں کشف کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اس کی تعلیم مکمل ہوتی ہے تو اس کا کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر اسے اپنے گھر کا کرنا ہے۔" اس نے عزم سے سوچا۔

☆☆☆

"ارے میں یہ اس طرف کہاں نکل آئی ہوں۔" وہ مین روڈ سے ہٹ کر بڑے بڑے عالیشان گھروں کے علاقے کی طرف نکل آئی تھی۔

اور جانے پہچانے علاقے کو دیکھ کر بے اختیار ٹھٹکی تھی۔

"مجھے بلال کو کال کر کے بلانا چاہیے۔ وہی مجھے ان بھول بھلیوں سے نکالے گا۔ یہاں تو کوئی کنوینس بھی نہیں مل رہی۔" وہ چلتے چلتے تھک سی گئی تھی۔

ایک طرف ہو کر بیگ میں سے فون نکالنے لگی۔

جب ہیوی بائیک اس کے پاس ایک شور کے ساتھ آ کر رکی تھی۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ کئی

...for more novels and digest

قدم اچھل کر پیچھے ہوئی تھی۔

ہیلمٹ پہنے کوئی لڑکا اس کے بے حد قریب تھا۔

لمحہ بھر کو اس کی ساری بہادری اڑنچھو ہوگئی۔

''کو......کون ہو تم؟'' بظاہر مضبوطی سے بولی تھی وہ مگر فون پکڑے ہاتھ میں پسینہ پھوٹ نکلا تھا اور دل تو جیسے ریل کی پٹڑی پر بگٹٹ بھاگا جا رہا تھا۔

''تمہیں کڈنیپ کرنا ہے۔ چلو بیٹھو پیچھے۔'' وہ خوف ناک آواز میں بولا تو لمحہ بھر کو کشف کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے بیگ شولڈر سے اتار کر زور سے لڑکے کے کندھے پر مارا۔

''تم مجھے بے وقوف بناؤ گے حمزہ کے بچے!'' وہ اس کی ہیوی بائیک کی چابی نکال کر مٹھی میں پکڑ چکی تھی۔

''اب میں تمہیں کڈنیپ کروں گی، بچ سکتے ہو مجھ سے۔'' وہ اسے دھمکاتے ہوئے اس کا ہیلمٹ کھینچ کر بولی تو وہ ہنس پڑا۔

''کیا ہے، تھوڑا ڈراما کر لیتیں کشف!'' وہ منہ بسور کر بولا۔

''بکو نہیں۔ پہلے ہی میرے ساتھ ڈراما ہوتے ہوتے بچا ہے۔'' اسے چند منٹوں پہلے کا خوفناک سا منظر یاد آیا۔

''کیا مطلب۔ کیا ہوا' کون پیچھے لگ گیا تھا تمہارے؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''ارے اتنی جرأت نہیں ہے کسی میں کہ کشف کے پیچھے لگے، اپنا سر سلامت لے کر گھر نہیں پہنچے گا وہ۔'' وہ اکڑ کر بولی۔

''کیا بات ہے بھئی تمہاری، ابھی جب میں نے پاس آ کر ڈرایا تو آپ کی گھگھی بن گئی تھی خوف سے۔'' وہ تمسخر سے بولا۔

وہ جواب میں اسے گھور کر رہ گئی۔

''اچھا سنو حمزہ! مجھے یونیورسٹی تک ڈراپ کر دو گے پلیز۔'' اس وقت یہ کھوچا سکہ ہی اس کے کام آ سکتا تھا لیکن دوسرے لمحے اس کی بے ہودہ بائیک دیکھ کر اس نے اپنی فرمائش بدل ڈالی۔

''آئی مین کسی کنوینس تک لے چلو پلیز۔''

''سوری، میری کلاس ہے صرف دس منٹ بعد اور میرا کالج پانچ منٹ کی دوری پر میری پیاری بائیک پر ہے تو میں آپ کے ساتھ اس نیکی کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔ ہاں گھر چلی جائیں، پاپا ابھی آفس نہیں گئے آپ کی یونیورسٹی ان کے راستے میں آتی ہے وہ آپ کو ڈراپ کر سکتے ہیں۔'' وہ کٹھور پن سے بولا۔

''دیکھو اچھے بھائی نہیں ہو۔'' اس نے خوشامد سے کام چلانا چاہا۔

''اچھی بہنیں اچھے بھائیوں کے فیوچر پر کوئی کمپرومائز نہیں کرتیں۔ یہ میری اسٹڈیز، میرے کیریئر کا سوال ہے تو ایسے میں آپ کو صرف میرے لیے دعا ہی کرنی چاہیے۔'' وہ بے لحاظی سے کہتے ہوئے جانے لگا۔

''اچھا مجھے گھر تک ہی ڈراپ کر دو، یہاں سے ابھی بھی فاصلہ ہے نا۔ پہلے ہی چل چل کر پاؤں اکڑ گئے ہیں میرے۔'' وہ ہوائی گھوڑا اڑنے کو تھا کہ کشف کو عین وقت پر خیال آ گیا۔ فوراً منت سے بولی۔

''بائی دا وے یہ آپ اس علاقے میں کس چکر میں مٹرگشت کرتی پھر رہی ہیں۔ خیریت تو ہے نا کوئی مشن امپاسبل لگ رہا ہے مجھے۔'' وہ خیال جو اسے سب سے پہلے آنا چاہیے تھا بالکل آخر میں آیا۔

''تم اپنا ننھا سا دماغ نہیں تھکاؤ، میرے بھائی! مجھے بس گھر تک ڈراپ کر دو۔ اتنی نیکی تو کما ہی سکتے ہو۔'' وہ اچک کر اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھی تھی۔

''افوہ کس قدر واہیات سیٹ ہے اس کی، ایک دم اِڈیٹ سواری۔'' وہ بڑبڑائی۔

''اے خبردار! میری گرل فرینڈ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں ہونی چاہیے ورنہ یہ یہیں سے سیدھا راکٹ کی رفتار سے آپ کو آخری آسمان تک پہنچا دے گی۔'' حمزہ تلملا کر رہ گیا تھا۔

''گرل فرینڈ ہے یہ تمہاری، مائی گاڈ۔ لوہے کی گرل فرینڈ۔'' وہ اسے مزید تپانا نہیں چاہتی تھی مگر اس کی ہنسی رک نہیں رہی تھی۔

اور حمزہ کی بائیک نے واقعی آسمان سے باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔

کشف اس کی شرٹ کالر سے کھینچتے ہوئے خوف سے آنکھیں بند کیے چیخ رہی تھی مگر وہ ان سنی کرتا چند سیکنڈز میں اسے ''خان ولا'' کے آگے تقریباً گراتے ہوئے ڈراپ کر گیا تھا۔

''آئی ایم گیٹنگ لیٹ، بائے اور شکریے کی ضرورت نہیں۔ ایسی چھوٹی موٹی نیکیاں کرنا میری عادت ہے، پور گرل۔'' وہ ہاتھ جھاڑتا اس کا تمسخر اڑاتا چلا گیا تھا۔

کشف کو طیش تو بہت آیا تھا۔ جس کمینگی سے وہ احسان جتا کر گیا تھا اور عام حالات میں شاید وہ کبھی بھی یہاں نہیں آتی۔ بلکہ زینب کو جب بھی ادھر آنا ہوتا تھا، منتیں کرتی تھی تو وہ اپنی اسٹڈیز، ٹیسٹ یا ایگزام کا بہانا کر کے منع کر دیا کرتی تھی مگر آج حمزہ کو یوں اچانک سامنے دیکھ کر اور خود کو اس علاقے میں بھٹکتے محسوس کر کے اسے لگا، قدرت نے خود اسے یہاں پہنچایا ہے۔

''سونیا آنٹی کو تو بابا کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگا۔ وہ کوئی نہ کوئی کلیو تو مجھے دیں گی۔'' وہ یہی سوچتے ہوئے کال بیل پر ہاتھ رکھے کچھ جذباتی سی ہو رہی تھی۔

اگرچہ اس کا دل یہاں آنے کے لیے کبھی بھی راضی نہیں ہوا تھا مگر آج کی مجبوری بہت خاص تھی۔ وہ آج اتفاقاً نہیں آتی تو شاید دو ایک دنوں میں ارادہ کر کے آ جاتی، بیل بج رہی تھی۔

☆☆☆

فون پر آتی موحد کی کال نے زینب کے تیزی سے بڑھتے قدم روکے تھے۔ اس نے بڑی خوش دلی سے کال ریسیو کی۔

''سوری میم! میں آفس میں نہیں تھا۔ میرا فون آفس ڈرا میں تھا، ابھی آ کر دیکھا تو آپ کی کالز اور میسج ملا۔ ایکسٹریملی سوری۔'' وہ مٹھاس بھرے لہجے میں معذرت کرتا ہوا جیسے سیدھا زینب کے دل میں اترتا جا رہا تھا۔

لمحہ بھر وہ جواب میں کچھ بول ہی نہ سکی۔

گلاب کی کیاری کے ساتھ لگے پیپل کے قد آور درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے وہ جیسے تھم سی گئی تھی۔

''ہیلو۔ یو اوکے میم۔'' اس کی گہری چپ پر وہ تشویش میں مبتلا ہو کر پوچھ رہا تھا۔

''موحد! آپ مجھے میم کیوں کہہ رہے ہیں؟'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔

وہ بس مسکرا کر رہ گیا۔

''سوری، میں پوچھنا بھول گیا ہاؤ آر یو۔ دوبارہ تو طبیعت خراب نہیں ہوئی آپ کی۔'' وہ ایک دم سے چپ سی رہ گئی۔

اس بات کی امید اسے کشف سے تھی کہ وہ صبح اٹھتے ہی اس کی خیریت تو پوچھے گی مگر وہ تو بالکل چپ تھی، خاموش۔ اور آج صبح سے ان دو لوگوں نے اس کی طبیعت کی فکر کی جن میں سے ایک سے تعلق جڑے ابھی چو بیس

''آئی ایم فائن ڈاکٹر! اچھا مجھے آپ سے ایک ریکویسٹ کرنا تھی جس کے لیے میں آپ کو کال کر رہی تھی۔'' وہ فوراً اصل بات کی طرف آئی۔ حیدر بھائی آنے والے تھے، وہ انہیں انتظار نہیں کروانا چاہتی تھی۔

''جی میں سن رہا ہوں پلیز۔'' اس مٹھاس بھرے لہجے پر، کیوں اسے بار بار دھوکا ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے آئینوں میں بار بار کوئی عکس جھلملاتا تھا۔

''آج رات کا ڈنر آپ ہمارے ساتھ، مطلب میرے گھر کریں گے؟'' وہ فوراً ہی اپنے خیالوں کی مالا جھٹک کر بولی۔

''ارے...... یہ کیا کہہ رہی ہیں میم! ہاؤ از اٹ پاسبل۔'' وہ ایک دم سے پریشان سا ہو گیا تھا۔

''وائے ناٹ موحد!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''کیا ہم اس قابل نہیں لگے آپ کو۔'' وہ دوسرے لمحے رات کے بتول والے منظر کو سوچ کر بجھے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

''ارے نہیں نہیں پلیز۔ آپ نے ایسا سوچا بھی کیوں۔ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں اور اس طرح ڈنر پر آنا، بلکہ آپ یوں کریں، میری طرف آجائیں، کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں۔'' وہ فوراً جوابی دعوت دینے لگا تو زینب کو اسے ٹوکنا پڑا۔

''موحد! آپ ریسٹورنٹ میں تو شاید روزانہ ڈنر کرتے ہوں گے، میری خواہش تھی کہ آج آپ ہمارے گھر عام سا کھانا جو میں خاص آپ کے لیے بنانا چاہ رہی تھی، ہمارے ساتھ شیئر کریں پلیز۔'' اس نے ایسے لہجے میں کہا کہ موحد چاہنے کے باوجود انکار نہیں کر سکا۔

اس کے اقرار نے دل کو عجیب سا سکون پہنچایا تھا۔

آپا کے بتانے پر وہ فون پر الوداعی کلمات کہتی آنکھوں کے کونے صاف کرتی تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔

☆☆☆

آزر بے حد سنجیدہ تھا۔

سونیا اپنی ہی پریشانی میں گم کوٹ ــــــ اسے پکڑا کر جانے لگی کہ اس نے ایک دم سختی سے اس کی کلائی پکڑلی تھی۔

سونیا اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔

تکلیف کے باوجود عجیب سی حیرت بھری نظروں سے اس نے آزر کی طرف دیکھا کہ ایسی حرکت تو اس نے شادی کے ان ابتدائی دنوں میں بھی کبھی نہیں کی تھی جب سونیا کے دل میں شاید ایسی کسی خواہش نے چٹکی کاٹی ہو۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟'' اس نے صرف اس کی کلائی ہی نہیں مروڑی تھی، لہجے میں بھی بہت چبھن تھی۔

سونیا ٹھٹک کر رہ گئی۔

''کیا ہوا ہے آزر! میں نے کچھ کہا؟'' وہ سہم کر بولی۔

''بس یہی ایکٹنگ تو شاید عمر بھر کی کمائی ہے تمہاری۔'' اس کا طعنے بھرا جملہ اسے کرنٹ کی طرح لگا تھا۔ ''کیا میں تمہیں نظر نہیں آتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔

سونیا کی آنکھوں میں توہین کے احساس سے نمی سی آگئی۔

''میں رات سے تم سے بات کرنا چاہ رہا ہوں اور تم...... کیا کسی نے تمہیں موت کی خبر سنادی ہے جو یوں زرد، ہونق چہرہ لیے پھر رہی ہو۔'' اس کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

''پلیز۔ مجھے میری غلطی تو بتادیں، میں نے کیا کیا ہے۔'' وہ شرمندہ سی آنکھیں صاف کرتی رخ پھیر کر بولی۔

''اماں جان نے سلیمان کے رشتے کے لیے ہاں کردی ہے شائستہ آپا کو اور اگلے مہینے وہ لوگ آرہے ہیں۔ دو تین ہفتوں میں شادی، نکاح، رخصتی سب طے کرلیا ہے انہوں نے۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

سونیا جیسے دل تھام کر بیٹھ گئی۔

بس اسے دیکھتی رہی۔ منگنی کی تو اسے امید تھی مگر آگے کے مرحلے بھی اتنی جلدی اماں جان خود ہی ''طے'' کرلیں گی، یہ اسے اندازہ نہیں تھا۔

''کل جو کچھ ہوا اس کے بعد شاید کوئی بھی گنجائش دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تم نے ردا سے بات کی؟'' وہ بھی ایک طرف بیٹھ گیا تھا کہ یہ مسئلہ دونوں کے بات کرنے کا متقاضی تھا۔

اس نے فقط اثبات میں سر ہلایا۔

''تھینک گاڈ۔ بات کرلی۔ انفارم ہی کرنا تھا اب تو۔'' وہ گہرا سانس لے کر ممنون لہجے میں بولا۔

''مگر...... وہ راضی نہیں ہے۔'' وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں پر انگلی پھیرتے ہوئے کچھ دیر بعد بولی۔

آزر کا ماتھا شکنوں سے بھر گیا۔ ''مطلب؟'' وہ تڑخ کر بولا۔

''ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی؟'' سونیا کی خاموشی سے اس نے یہی اخذ کیا۔

سونیا جواب میں صرف دیکھ کر رہ گئی۔

''بولو بھی کچھ...... کیا کہتی ہے وہ؟'' وہ جھلا کر بولا۔

وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ اگر آزر کو پتا چل گیا کہ وہ کسی اور کو...... نہیں نہیں یہ بات اماں جان تک پہنچی تو......

''آزر! ردا کی گاڑی ورکشاپ میں ہے۔ اسے آفس جانا ہے، وہ کہہ رہی تھی کہ آپ کے ساتھ چلی جائے گی تو آپ پلیز راستے میں اس سے خود بات کرلیں۔ آپ جانتے تو ہیں، مجھ سے زیادہ بچے آپ سے بات کرنے میں کمفرٹ فیل کرتے ہیں۔''

یہ سچ تھا۔ سونیا کے اعصاب کسی بھی بڑی پریشانی کو اپنے کندھوں پر جھیلنے کے متحمل نہیں تھے، سو اس بار بھی اس نے خود کو اس معاملے سے الگ کرنا چاہا۔

''سنو سونیا! یہ اس طرح کی باتیں مائیں بیٹیوں سے کرتی ہیں، نہ کہ باپ۔ میں کرتا اچھا لگوں گا تمہارے خیال میں۔'' پہلی بار آزر نے اس کی کوشش پر پانی پھیرا تھا۔

''مگر آزر! وہ میری بات سمجھنے، سننے کے لیے تیار نہیں اور میں نہیں چاہتی یہ معاملہ کسی طرح اماں جان کے کانوں تک پہنچے۔'' وہ اگر اس وقت ہمت نہیں دکھائے گی تو کل اگر کوئی طوفان اٹھا تو اس کی ساری ذمہ داری سونیا پر ہوگی۔

اور ایسا تو آزر بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ معاملہ اماں جان تک پہنچے۔ رات میں وہ اسے جتنی باتیں سنا چکی تھیں اس کے بعد تو اب ان تک صرف ردا کی ہاں ہی پہنچنی چاہیے تھی۔

''بھیجو اسے، میں باہر گاڑی ــــ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ کوٹ پہنتے ہوئے کمزور سے لہجے میں بولا۔

سونیا نے کچھ کہنے کی کوشش کی پھر ہونٹ بھینچتے سر ہلا کر باہر نکل گئی۔

باہر کوئی کال بیل پر ہاتھ [illegible] بھول گیا تھا۔ [illegible] ہی اور دروازہ کھولتے ہی سامنے کھڑی کشف کو دیکھ کر جیسے سکتے میں رہ گئی۔

☆☆☆

''حیدر بھائی! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ سرفراز صاحب اتنے اچھے انسان ہوں گے، آئی مین پبلشر تو وہ کہیں سے بھی نہیں لگ رہے تھے۔''

وہ دونوں آفس سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو زینب کے چہرے پر ناقابل یقین سی خوشی تھی۔

حیدر جواب میں صرف مسکرایا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، وہ ان بزنس مین پبلشرز جیسے بالکل نہیں، کتاب کی پرنٹنگ اور اس کے سرورق کو جس باریک بینی سے وہ پلان کر رہے تھے، ریئلی امیزنگ۔'' وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولتی جا رہی تھی۔

''لیکن مجھے تو یہ بھی خوشی ہے کہ انہوں نے ایک تو قیمت اچھی لگائی، کہیں زیادہ بحث نہیں کرنا پڑی پھر آدھی پے منٹ کا چیک بھی فوراً بنوا دیا۔ باقی کی رقم کتاب چھپنے کے ساتھ ہی مل جائے گی۔''

حیدر گاڑی مین روڈ پر لاتے ہوئے محتاط انداز سے دائیں طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''ہاں یہ بات تو سب سے بڑھ کر ہے، سچی بات تو یہ ہے حیدر بھائی! انسان سب سے زیادہ اپنی ضرورتوں کے ہاتھوں ہی ایکسپلائٹ ہوتا ہے۔''

''ارے یہ شاعر اور مصنف کے منہ سے اچھی نہیں لگتیں ہم دنیا داروں جیسی باتیں۔'' وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولے۔

''تو شاعر اور مصنف اس دنیا میں نہیں رہتے یا ان کے ساتھ ضرورتوں کا ایندھن بھوک کی شکل میں نہیں لگا ہوتا۔ دیکھیں بات کتاب چھپنے کی نہیں تھی اور یہ میری پہلی کتاب بھی نہیں تھی کہ میں صرف اس کے چھپنے کی خوشی میں چھوٹی موٹی رقم بھی انہیں خوشی سے دے دیتی۔''

''جانتا ہوں میں، تم جس طرح سے سروائیو کر رہی ہو اور تم نے کبھی کسی سے اپنے حالات بیان بھی نہیں کیے حالانکہ وہ صفدر کی بہن سونیا...... کتنی امیر کبیر ہے، اتنی پیسے والی فیملی سے تعلق ہے اس کا اور کشف جس طرح تمہاری ذمہ داری ہے، اسی طرح اس سونیا پر بھی حق ہے اس کا۔'' وہ شاید اسے تسلی دینے کو یہ سب کہتے چلے جا رہے تھے۔

مگر اسے جیسے بہت تکلیف سی ہوئی تھی۔

''پلیز حیدر بھائی! اس طرح کی باتیں نہیں کریں، کشف میری بیٹی ہے اور وہ صرف میری ذمہ داری ہے، مجھے تو اس وقت ایک اور ہی پریشانی لاحق ہے۔''

اسے رات والا قصہ یاد آ گیا تھا۔

''حیدر بھائی سے کہوں یا نہیں۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''اب کیا ہو گیا؟'' وہ سرسری نظر سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

''بس زندگی میں ٹھہراؤ ہے نہ سکون۔'' وہ بیگ کے اسٹریپ کو مروڑتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھی۔

''کشف نے کچھ کہا؟'' وہ اندازہ لگا کر بولے۔

وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

''کیا کہا اس نے؟'' وہ اس کی خاموشی پر پھر سے بولے۔

وہ جواب میں گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

''کہیں اپنے باپ کا پتا تو نہیں پوچھ لیا؟'' وہ شاید مذاق کے موڈ میں یوں ہی بول گئے۔

زینب گردن موڑ کر حیران سی انہیں دیکھنے لگی۔

''آپ نے یہ کیسے سوچا...... مطلب؟'' وہ حیران تھی۔

''اس عمر سے ہم بھی تو گزرے ہیں زینب! ایسی جستجو، اس طرح کا تجسس ہمارے اندر بھی تو مچلتا تھا پارے کی طرح ہمیں بھی کب چین لینے دیتی تھی۔'' وہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔

وہ یونہی تو اس شخص پر آنکھیں بند کر کے بھروسا نہیں کرتی تھی۔ بہت قریبی تعلق نہ ہونے کے باوجود وہ جس طرح اس کے دل کا بھید بوجھ جایا کرتے تھے، یہ صرف وہی سوچ سکتی تھی۔

''میرے پاس اس کے سوال سے بچنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔'' وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

''تم نے کیا بتایا اسے؟'' وہ چونک کر بولے۔

''وہی جو حقیقت ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ حیدر کے ہاتھ سے اسٹیئرنگ چھوٹ گیا، وہ اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

''ایما! تم جانتی ہو نا۔ تمہاری ماں بیمار ہے۔'' وہ اسے بامشکل بات چیت کے لیے راضی کر کے گھر کے قریب پارک میں لایا تھا۔

''بیمار نہیں ڈیڈ! ذہنی بیمار۔'' وہ تلخی سے بولی۔

وہ اسے گہرا سانس لے کر دیکھتا رہ گیا۔

اس معاشرے کی یہی برائی جو کبھی جوانی کے دنوں میں انہیں حسین خواب نظر آتی تھی، آج ان کے گلے کی سب سے بڑی مصیبت تھی۔

آزادی...... جو منہ میں ہے، جو دل میں ہے، بول دو۔ سامنے والا کون ہے، اس کے دل پر کیا گزرے گی، پروا نہیں کرو۔ صرف یہ دیکھو کہ تمہیں کیا پسند ہے، تمہیں کیا اچھا لگتا ہے۔

سو یہی کچھ ایمان عرف ایما بھی کر رہی تھی۔

اس کی اکلوتی لاڈلی بیٹی، جس کے لیے اس نے زندگی میں جتنے سہانے خواب دیکھے تھے شاید خود اپنے لیے بھی نہیں دیکھے تھے۔

''ایما! میری جان! وہ ذہنی بیمار نہیں ہے۔ بہت محبت کرنے والی، پیار کرنے والی ماں ہے تمہاری۔ ایک معمولی سا نفسیاتی مسئلہ ہے کہ سرخ رنگ دیکھ کر اس کی ذہنی حالت بگڑ جاتی ہے، اس کے علاوہ کبھی تم نے دیکھا ہے کہ وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو، بی از نارمل۔'' وہ رک رک کر اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سوری ڈیڈ! بلکہ اب تو مجھے لگتا ہے، آپ بھی مام کی طرح ابنارمل ہی ہوتے جا رہے ہیں کہ آپ کو ان کی بیماری اب بیماری بھی نہیں لگتی یا آپ نے ان کی ابنارملٹی کے ساتھ کمپرومائز کر لیا ہے۔'' وہ کسی بھی طور کچھ بھی سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

میرو نے تھک کر سامنے پارک میں کھیلتے بچوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔

''ڈیڈ! ایک مشورہ دوں میں آپ کو۔'' اس کے لہجے کی شرارت بتا رہی تھی کہ وہ اسے کیا مشورہ دینے والی ہے۔

''پلیز...... اولڈ ہوم یا مینٹل ہسپتال کی بات نہیں کرنا۔'' وہ چڑچڑے پن سے اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''نو نو...... ناٹ ایٹ آل۔'' وہ تیزی سے سر ہلا کر بولی۔ وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

''ڈیڈ! آپ اتنے ہینڈسم، اتنے چارمنگ ہیں ابھی بھی۔ کسی بھی طرح سے مام کا اور آپ کا میچ نہیں بنتا۔ آئی کانٹ انڈرسٹینڈ کہ آپ نے ان سے شادی کیسے کر لی جب کہ شی از اولڈر دین یو (وہ آپ سے عمر میں بڑی

ہیں)۔'' وہ بلا جھجک بول رہی تھی۔
میر کے ماتھے پر شکنیں پڑ رہی تھیں۔
''ایما!'' وہ ٹوک کر بولا۔
''کم آن ڈیڈ! آدھی لائف سپوئیل کر چکے ہیں آپ، اس سائیکو عورت کی وجہ سے، ابھی آدھی باقی ہے۔ طلاق دے دیں اسے اور کسی خوب صورت اپنی جیسی ینگ لیڈی سے شادی نہ سہی فرینڈشپ......''
''ایما! ہاؤ ڈیئر یو۔'' وہ جیسے غصے میں پاگل ہو گیا۔ ''تم اس قدر آؤٹ اسپوکن ہو چکی ہو، تمہیں باپ کا احترام، ماں کا ادب، خیال کچھ بھی یاد نہیں رہا۔''
بے اختیار اس کا ہاتھ ایمان کے گال پر پڑا تھا۔
اور وہ غصے سے پاگل ہو گئی۔
''یو...... یو اولڈ مین! تھپڑ مارا مجھے...... مجھے تھپڑ مارا۔ اس کا مطلب معلوم ہے نا آپ کو...... نہیں معلوم تو ابھی معلوم ہو جائے گا۔ میں بتاؤں گی اس تھپڑ کا مطلب تمہیں۔ یہ تمہارا وہ کنزرو ٹو کنٹری نہیں ہے، جہاں جب جی چاہے عورت پر ہاتھ اٹھاؤ، مارو، پیٹو۔ کوئی ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔''
وہ فون ہاتھ میں لیے نمبر ملاتے ہوئے چیختے جا رہی تھی۔ میر وشششدر سا کھڑا رہ گیا۔
ارد گرد شور بڑھ رہا تھا۔
ایما اس طرح چیخ رہی تھی، لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔
بہت کچھ بول رہے تھے مگر اس کی نظریں تو ایما کے ہاتھ اٹھا اٹھا کر چیختے اور سرخ پڑتے چہرے پر جمی تھیں۔
ذرا سی دیر میں اس کے کانوں نے پولیس گاڑی کا ہوٹر بجتے سنا تھا۔
وہ بھاگ جانا چاہتا تھا یہاں سے، دور بہت دور مگر جیسے اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔
ماضی کا وہ خوفناک منظر ایک بار پھر خود کو دہرا رہا تھا۔
پولیس کی گاڑیاں ہوٹر بجاتی آ رہی تھیں اور وہ اس خونی منظر سے بھاگ جانا چاہتا تھا اور نہیں بھاگ سکا تھا۔
آج بھی وہ چاہنے کے باوجود نہیں بھاگ سکا تھا۔
اسے پولیس کی گاڑی میں پہلے بھی اس طرح بغیر کسی مزاحمت کے بٹھایا گیا تھا۔ آج بھی اس نے مزاحم ہونے کی کوشش نہیں کی۔
اور دور ہوتے منظر میں ایما ہاتھ ہلا ہلا کر چیختی ریڈ کوٹ میں ملبوس آہستہ آہستہ ایک سرخ نقطے میں ڈھل رہی تھی۔
دور جلتا ہوا سرخ انگارہ۔
کسی بجھتے ہوئے دیے کی سرخ سے زرد پڑتی لو۔
اس نے آنکھیں بند کر لیں، اب دیکھنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

''سوری! ہم لیٹ ہو جائیں گے۔ چلو ردا!'' آزر نے اسی کھردرے لہجے میں جواب دیا تھا، جس کی توقع کشف اس سے کر رہی تھی۔
اور سچ تو یہ تھا کہ وہ اس وقت یہاں سے جانا بھی نہیں چاہ رہی تھی، اگرچہ اسے سونیا سے بھی کسی خاص لگاوٹ یا محبت کی امید نہیں تھی لیکن اس وقت واقعی اسے سونیا سے بات کرنا تھی۔
مطلب تھا اسے، کچھ جاننا تھا۔
سو اس نے برا نہیں مانا۔

بلکہ الٹا خوش دلی سے مسکرائی ہوئی، اونچی پونی کے ڈھیلے ہوتے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑس کر یوں ہی گردن ہلا کر سیدھی ہو گئی۔
''اٹس او کے انکل! کوئی بات نہیں۔ مجھے مین روڈ سے کوئی نہ کوئی کنوینس مل ہی جائے گی۔'' وہ پیچھے کھڑی سونیا کو دیکھنے لگی۔
''ارے کشف! آ جاؤ ناں، ہمارے ساتھ۔ پاپا ڈراپ کر دیں گے تمہیں۔''
ردا اپنے مخصوص انداز میں اسٹائلش سوٹ پہنے، میچنگ چپل کے ساتھ شولڈر بیگ کندھے پر ڈالے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
''تمہارے پاپا لیٹ ہو رہے ہیں ردا! وہ نہیں ڈراپ کر سکیں گے اسے، یوں بھی یہ ابھی آئی ہے تو......'' سونیا خوش اخلاقی دکھانا تو نہیں چاہ رہی تھی مگر اس وقت وہ آزر کے خراب موڈ کو مزید خراب کرنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔
''کشف! آ جاؤ تم اندر۔ اماں جان سے مل لو۔'' وہ ایسی اپنائیت سے اسے کم کم ہی بلاتی تھی۔
مگر اس وقت مجبوری تھی۔
کشف الوداعی ہاتھ ہلاتی سونیا کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گئی۔
آزر نے گاڑی پیچھے کرتے ہوئے ردا کو دیکھ کر ہونٹ بھینچے جیسے خود کو بولنے سے باز رکھ رہا ہو۔
گاڑی باہر نکلتے ہی گارڈ نے گیٹ بند کر دیا۔
''یہ یہاں کیوں آئی ہے۔ اماں جان نے دیکھ لیا تو میری جان وق کر دیں گی کہ میں اپنے غریب رشتہ داروں کی یوں چھپ چھپا کر مدد کرتی ہوں۔'' سونیا ناشتے کے بکھراوے کو سمیٹتے ہوئے دل ہی دل میں جل کڑھ رہی تھی۔
''مگر یہ کشف یہاں آئی کیوں ہے، یہ اکیلے تو کبھی بھی نہیں آتی۔ اس طرح زینب کے بغیر۔''
اسے نئی پریشانی لگ گئی۔
پلٹ کر یوں ہی گردن گھما کر دیکھنے لگی۔
وہ لاؤنج میں ایک طرف رکھے ''فش ایکیوریم'' میں پڑی رنگ برنگی مچلتی — مچھلیوں کو دیکھنے میں محو تھی۔
سونیا خالی برتن ہاتھ میں لیے یک ٹک کشف کو دیکھتی جا رہی تھی۔
جانے کیا کچھ اس کے دل و دماغ میں چلنے لگا تھا۔ اسے خود بھی کچھ پتا نہیں چلا، کب وہ خالی برتن ہاتھ میں لیے بے آواز قدموں سے چلتی کشف کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔
کشف کے پیروں میں بڑی عام سی سینڈل تھی، خستہ حال مٹی میں اٹی جو کسی بھی وقت — چلتے ٹوٹ سکتی تھی۔
رمشا اور ردا کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک مہنگے ترین برانڈ کے ہر سوٹ کے ساتھ میچنگ جوتے ہوتے تھے۔
بلکہ ردا تو دیوانی تھی جوتوں کی۔ وہ جب بھی شاپنگ کے لیے جاتی، بھلے کچھ نہ خریدتی مگر ایک جوتا ضرور لیتی تھی۔
''آپ پریشان نہیں ہوں، مجھے ناشتا نہیں کرنا سونیا آنٹی!'' وہ پتا نہیں کب اس کی موجودگی سے آگاہ ہوئی تھی۔
اس کے قد برابر کھڑے ہو کر وہ اس کے بہت قریب کھڑی تھی۔
سونیا کے کندھوں سے نکلتی، اس کا قد اور سانچے میں ڈھلا نازک سراپا، ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگی

تھی۔

''لائیں مجھے دیں۔ مجھے کچن میں رکھ آتی ہوں۔''

وہ اس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر کچن میں رکھنے چلی گئی۔

''افوہ! اگر اماں جان نکل آئیں اپنے کمرے سے تو میں انہیں کیا تسلی دوں گی۔ سوال جواب کا ایک نیا سیشن شروع ہو جائے گا۔''

''تم رہنے دو، برتن میں رکھ آتی ہوں۔'' وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی تھی۔

کشف اس کے یوں اچانک پیچھے آنے پر حیران سی ہوئی تھی، پھر خاموشی سے اس نے ٹرے سونیا کو واپس کر دی تھی۔

سونیا نے ٹرے وہیں میز پر رکھ دی۔

وہ اسے اب جلد سے جلد یہاں سے بھیج دینا چاہتی تھی۔

''خیریت تو تھی آج، تم راستہ بھول کر آ گئیں میرے خیال میں اور وہ بھی زینب کے بغیر۔'' وہ بے ربط سا بول رہی تھی کہ جلدی سے پوچھ لے تم یہاں کس لیے آئی ہو اور کتنی دیر رکو گی۔

''سونیا آنٹی! میں یہاں زیادہ دیر تک نہیں رکوں گی اور کام چونکہ مجھے تھا اس لیے مجھے خود ہی آنا پڑا۔'' اس نے جانے کیسے اس کے دل کی بات کو بوجھا تھا۔

''اور میں آپ سے ریکویسٹ کروں گی کہ آپ بھی آنی کو میرے یہاں آنے کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گی۔'' اس کے انداز میں تھا کچھ جو سونیا کو چونکا گیا۔

☆☆☆

آزر کے ہونٹ کچھ اور بھی بھنچ گئے۔

ردا کن اکھیوں سے باپ کے ردعمل کو دیکھ رہی تھی۔

ماں سے زیادہ اسے باپ سے اچھے رویے کی توقع تھی۔

''یہ ممکن نہیں ہے ردا!'' وہ بہت دیر بعد قطعی لہجے میں بولے تھے۔ ردا کے لیے یہ بالکل غیر متوقع سی بات تھی۔

''مگر پاپا! میں پسند کرتی ہوں جبران کو۔'' اس نے اپنی جنگ لڑنے کا پختہ عزم کر لیا تھا۔

''سو واٹ؟'' وہ جواب میں کندھے اچکا کر بولا۔

''پسند تو ہم زندگی میں بہت ساری چیزوں کو، بہت سارے لوگوں کو کرتے ہیں تو کیا سب کو اپنی لائف کا حصہ بنانے کے لیے تقدیر سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔'' وہ خشک لہجے میں پوچھ رہا تھا یا اسے سمجھا رہا تھا، ردا کچھ دیر اسے یوں ہی دیکھتی رہی۔

''چیزوں میں اور انسانوں میں فرق ہوتا ہے بابا۔'' وہ ترشی سے بولی۔

''یہی میں بھی تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم اس فرق کو خود ہی سمجھ جاؤ تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔'' آزر کے لہجے میں خفیف سی دھمکی تھی جو ردا کو بہت بری لگی۔

''بابا! میں میچور ہوں، بالغ ہوں۔ اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ صرف دادی کی پسند ناپسند کی بنیاد پر نہیں کر سکتی۔ اپنی شادی کا فیصلہ میں خود کروں گی اور آپ میرا ساتھ دیں گے، ماما کے ساتھ مل کر۔''

وہ دوٹوک انداز میں گویا باپ کو اطلاع دے رہی تھی۔

آزر کو پہلی بار سونیا کی پریشانی کا اندازہ ہوا۔

وہ رات گئے ...

داری آزر پر ڈالی تھی۔

''آپ جبران سے ملیں گے تو وہ آپ کو ہر لحاظ سے میرے لیے پسند آئے گا۔ ہاں میں مانتی ہوں جبران کو بھی احساس ہے کہ وہ فنانشلی اتنا اسٹرانگ نہیں ہے، ہماری فیملی کی طرح، بٹ پاپا! وہ محنتی ہے، ٹیلنٹڈ ہے۔ چند ہی سالوں میں وہ وہاں ہوگا جہاں دادی کا سو کالڈ پرپوزل ہے۔'' وہ نخوت سے بول رہی تھی۔

''تو تم چند سال تک اس کے ساتھ ایک اسٹرگلنگ لائف گزارو گی۔ نائن ٹو فائیو آفس کے دھکے اور گھر جا کر سارے گھر کے کام کرنے، ظاہر ہے صرف سیلری پر سنز ہوتے ہوئے ملازم، بڑا گھر، اچھا لائف اسٹائل تو تم افورڈ نہیں کر سکو گی۔'' وہ جتا رہا تھا یا اسے سمجھا رہا تھا جو بھی تھا، ردا کو اچھا نہیں لگا۔

''آپ ہی تو کہا کرتے ہیں پاپا کہ زندگی کا حسن جدوجہد میں ہے، اسٹرگل میں ہے۔'' وہ اس کے الفاظ اسی کو پلٹا کر بولی۔

''تمہاری گاڑی شاید کل تک ملے گی ورکشاپ سے، تو شام کو میں ہی تمہیں پک کرنے آؤں گا تو اس لڑکے سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ آ گیا تمہارا آفس۔'' آزر نے گاڑی روکی تو ردا بے یقین سی باپ کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

حیدر نے بینک کے سامنے گاڑی روکی تو زینب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''بھئی، چیک ڈپازٹ کرا دو اکاؤنٹ میں دو تین لگیں گے رقم ٹرانسفر ہونے میں۔ تم نے کشف کی سمسٹر فیس بھی جمع کرائی ہے پھر۔''

وہ مسکرانے لگی۔

''اب اس مسکراہٹ کا مطلب؟''

''معلوم نہیں کیسے آپ وہ باتیں جان لیتے ہیں جو یا تو میرے دل میں ہوتی ہیں یا جنہیں میں بھول جاتی ہوں اور مجھے یہ چیک رات کو سوتے وقت یاد آتا تھا۔ کل ہاف ڈے ہے، اسکول کی وجہ سے پھر ڈپازٹ کرانے سے رہ جاتا تھا اور اگلے ہفتہ کشف کی فیس تو جانی ہے لازمی۔''

وہ فکرمندی سے بیگ کندھے پر لٹکا کر اترنے لگی۔

''اور گاڑی کا کیا سوچا ہے؟'' وہ اترتے اترتے رک گئی۔

''ابھی کچھ نہیں۔'' کچھ سوچ کر سر جھٹک کر وہ گاڑی سے اتر کر بینک کے اندر چلی گئی۔

حیدر اسے دور تک جاتا دیکھتے رہے، ان کی دماغ میں زینب کی پریشانی اٹکی ہوئی تھی۔ کشف کی تفتیش نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔

''سنو، اس کا ایک ہی حل ہے زینب!'' وہ گاڑی میں آ کر بیٹھی تو حیدر نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کس بات کا حیدر بھائی؟'' وہ بالکل نہیں سمجھی تھی۔

''کشف کی اسٹڈیز مکمل ہونے میں کتنا ٹائم ہے بھلا؟'' وہ سوچتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''بس اس سال کے اختتام تک انٹرن شپ اسٹارٹ ہو جائے گی اس کی۔'' وہ اپنا حساب کتاب جوڑ کر بولی۔

''دیکھو اگر منصور نے کانٹیکٹ کرنا ہوتا، اسے تمہاری یا کشف کی کچھ فکر ہوتی تو وہ بہت پہلے کر چکا ہوتا۔'' وہ سامنے سفید دھوپ میں چمکتی سیاہ سڑک پر نظریں جمائے کہہ رہے تھے۔

''میں نے ایسی کوئی آس دل میں نہیں رکھی حیدر بھائی! یہ سلسلہ میں ختم کر چکی ہوں۔'' وہ بے تاثر لہجے میں کہہ رہی تھی۔

لیکن حیدر جانتے تھے اس میں آدھا سچ اور آدھا جھوٹ یا شاید یہ سارا ہی جھوٹ ہو ورنہ زینب بھی تو......

انہوں نے سر جھٹک دیا کہ اب ان باتوں کو سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

''آپ کیا کہہ رہے تھے حیدر بھائی؟'' ان کی خاموشی پر وہ کچھ بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

''میں تو صرف یہی کہہ رہا تھا کہ کشف کے باپ کا انتظار فضول ہے پھر جتنا وقت گزرے گا معاملات بگڑیں گے ہی تو زیادہ بہتر ہے اسے طول نہیں دیا جائے۔'' وہ رک رک کر بول رہے تھے۔

''میں واقعی آپ کی بات نہیں سمجھ پا رہی حیدر بھائی!'' وہ کچھ پریشانی سے بولی۔

''میری نظر میں ایک دو رشتے ہیں، بہتر ہے ایگزام سے پہلے ہی تم کشف کی کہیں نسبت پکی کر دو جیسے ہی ایگزام ہوتے ہیں، سادگی سے ہاتھ پیلے کر دو تمہارا فرض تو ادا ہو گا۔''

وہ گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔

''کیا میرا مشورہ اچھا نہیں لگا تمہیں؟'' وہ اس کی چپ پر رکے تو وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

''بات صرف میرے اچھے لگنے یا نہ لگنے کی تو نہیں ہے حیدر بھائی!'' وہ افسردگی سے بولی۔

''کیا مطلب، یہ فیصلہ تو تم نے کرنا ہے نا زینب!'' وہ جتا کر بولے۔ ''یا وہ میر منصور کرے گا آ کر؟'' آخر میں ان کے طنز نے زینب کی تکلیف کو بڑھا دیا۔

''وہ تو آج تک میرا فیصلہ نہیں کر سکا حیدر بھائی! تو کشف کا کیا کرے گا اور میں نے آپ سے کہا ناں، مجھے اب اس سے کوئی آس، کوئی امید ہے بھی نہیں۔'' وہ یاسیت سے بولی۔

''لیکن یہ رشتے کا معاملہ میں کشف کی مرضی کے بغیر نہیں کروں گی اگر وہ راضی نہیں ہوئی تو میں زبردستی نہیں کروں گی۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔

''کشف نے محروم زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے تو میری صرف یہی خواہش ہے کہ وہ اپنی آنے والی زندگی بہت خوش، بہت مطمئن گزارے۔ میری طرح نہیں۔''

کہتے ہوئے اس نے رخ پھیر لیا، حیدر نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ کسی کو کمزور لمحوں میں دیکھنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے، یہ حیدر سے بڑھ کر کون جان سکتا تھا۔

گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔

☆☆☆

''میرو کہاں ہے، وہ تمہارے ساتھ ہی تو باہر گیا تھا۔'' زریں کچن سے نکلی تھی، ایپرن باندھے یقیناً وہ کچھ خاص بنا رہی تھی جس دن اس کا موڈ کچھ خاص بنانے کا ہوتا ——— وہ پوری طرح ایپرن باندھے بالوں کو اسکارف میں ڈھکے بہت مصروف سی نظر آتی تھی۔ ایما نے کچھ بھی جواب دیئے بغیر کچن کا رخ کیا۔

کچن میں اس کی پسند کا اسٹیک بن رہا تھا اور ڈیڈ کی پسند کی مٹن بریانی۔

''اف یہ گوشت؟؟؟ ایشیائی قوم۔''

وہ ڈیڈ کو اکثر رغبت سے مٹن قورمہ، مٹن بریانی، کوفتے کھاتے دیکھ کر یہ طنز ضرور کیا کرتی تھی۔

''ساتھ میں، میں گرین یوگرٹ رائتہ بھی بنا رہی ہوں۔ میرو کی خاص پسند کا پودینے کے ساتھ۔'' زریں اپنی دھن میں بولتے ہوئے تیز تیز ہاتھ چلا رہی تھی۔

''آپ کو یہ دونوں چیزیں ناپسند ہیں تو اپنے لیے کیا بنا رہی ہیں؟'' ایما نے تیسرے پین کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔

''ممس و بیچیبیل۔ اونہوں، یہ بھی ڈیڈ کی پسند کا۔ کیا نئے سرے سے ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہیں۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''انہیں آج سرپرائز دوں گی ناں۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر کہہ رہی تھی۔

''اچھا بتاؤ ناں، کہاں گیا ہے وہ۔ یقیناً تم نے اپنے کسی کام سے بھیج دیا ہو گا پھر۔'' وہ خفگی سے بولی۔......

ایما مزے سے بالوں کو کیچر میں جکڑنے لگی۔

اس کی پراسرار خاموشی پر زری کچھ چونکی تھی۔

''کہاں ہے تمہارا باپ؟ کچھ بولتی کیوں نہیں ہو؟'' وہ پاس آ کر اس کا بازو ہلا کر زور سے پوچھنے لگی۔

''ڈیڈ اس وقت حوالات میں ہیں۔ مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا انہوں نے، میں نے کال کر کے پیٹرولنگ بلا لی۔ سو ہی از ان لاک اپ۔''

وہ لاپروائی سے کندھے اچکا کر بولی تو زری صدمے سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''مجھے صرف آپ سے ایک بات پوچھنی ہے سونیا آنٹی!'' سونیا اس سے نظریں چرا رہی تھی، فون پر اس کے لیے کیب منگوا رہی تھی۔ اس کے نمبر ڈائل کرتے ہاتھ وہیں رک گئے تھے۔

''کیسی بات؟'' وہ ناگواری سے اسے دیکھنے لگی۔

''میں جانتی ہوں آپ مجھے پسند نہیں کرتیں اور میرا یہاں آنا بھی آپ کو اچھا نہیں لگا اور میں سچ کہوں خود مجھے بھی آپ اچھی نہیں لگتیں۔ آپ کی طرف آنا میرے لیے بڑا بوجھ ہوتا ہے، اینی وے۔ یہ پسند و ناپسند تو زندگی کا حصہ ہے اور یہ چلتی رہتی ہے۔''

وہ اپنی زندگی کی تلخ ترین حقیقت مزے سے بیان کر کے اب کندھے اچکا رہی تھی۔

سونیا تو بس اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

''مجھے آپ سے اپنے بابا کے بارے میں پوچھنا ہے کیونکہ آنی تو مجھے کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں، سوائے اس کے کہ وہ ہمیں پیسہ کمانے کے چکر میں چھوڑ کر بیرون ملک چلے گئے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے اور انہوں نے ہم سے کبھی کوئی کانٹیکٹ بھی نہیں رکھا۔''

اس نے آج طے کر لیا تھا وہ سونیا سے کچھ نہ کچھ اگلوا کر ہی جائے گی۔

''تو اس سے زیادہ تو میں بھی نہیں جانتی بلکہ کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔'' سونیا روکھے پن سے بولی۔

''یہ میں نہیں مان سکتی کہ آپ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتیں، وہ آپ کے بھائی ہیں۔ اور کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان کے بارے کچھ معلوم نہیں ہو۔'' وہ زور دے کر بولی۔

''کہاں ناں، مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' سونیا چڑ کر بولی۔

''آپ مجھے کچھ بتائیں یا نہیں لیکن میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ اپنے باپ سے ملنے کے لیے امریکہ جانے کا اور اس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔''

سونیا ششدر سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

باقی آئندہ ماہ

افشین نعیم

یار دل دار

عادل خوشی سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔

نوکری، وہ بھی ایسی شاندار سی نوکری...... یہ تو اس کے وہم و گمان سے بھی آگے کی چیز تھی۔

بہترین تنخواہ، ٹارگٹ پورا ہو جانے کی صورت میں بونس، ہر عید کے عید تنخواہ کے برابر الاؤنس، اور آخری چیز کیا تھی......؟

اس نے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش، ہاں ...... یاد آگیا۔ کمپنی، پروبیشن (Probation) کی مدت مکمل ہونے پر گھر بھی دے گی۔ ترقی، کارکردگی سے مشروط تھی۔

کانٹریکٹ سائن کرتے وقت اس کا دل چاہ رہا تھا اٹھ کر ناچنا شروع کر دے۔

کس مشکل سے دل کی اس خواہش پر قابو پایا تھا۔ یہ تو دل ہی جانتا تھا۔

واپس گھر پہنچنے تک کا سفر، اس نے خوشی سے بے قابو ہوتے طے کیا تھا۔ قدم رکھتا کہیں تھا، پڑتا کہیں تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد بلاوجہ مسکراتا۔ گھر پہنچ کر بھی یہی حالات تھے۔ وہ اپنی یہ خوشی شیئر کرنے کے لیے اپنے یاروں کا منتظر تھا۔

وہی اس کے اپنے تھے۔ وہی اس کا خاندان تھے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ جونہی ان چاروں میں سے کوئی اندر آئے گا۔ وہ اس کو گود میں اٹھا کر گھومنا شروع کر دے گا۔

انتظار کی گھڑیاں بالآخر ختم ہوئیں۔ دروازہ بجنے کی آواز سنائی دی۔ ایک ہی جست میں دروازے تک پہنچ کر کنڈا گرایا۔

قبل اس کے کہ آنے والے کو گود میں اٹھا کر اندر لے کر آتا۔ اس کے دماغ نے کچھ غلط ہونے کا سگنل دیا۔ آنے والا اس کے دوستوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ باہر بابا جی کھڑے تھے۔ ان کے مالک مکان۔

اس کی خوشی ایک دم سے کافور ہوئی۔ (اب ان کو گود میں اٹھا کر کیسے گھماؤں......؟)

بابا جی نے بڑے دھیان سے اس کے چہرے کی فیوز ہوتی بتی ملاحظہ کی۔

"کیوں میاں......؟ ایسا کیا کر رہے تھے تم اندر جو مجھے دیکھ کر یوں بارہ بج گئے ہیں شکل پہ؟" بابا جی نے آنکھوں سے اس کا ایکسرے کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایسا...... (سلام ہے بھئی بابے کی سوچ کو۔)"

"آئیں بابا جی...... اندر آئیں......" ان کی بات نے اسے گڑبڑا دیا۔

"اب، اس عمر میں، میں تم جیسے بچے کے سائنڈ کو روند کر تو گزرنے سے رہا۔ ہٹو سامنے سے، راستہ چھوڑو۔"

عادل جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔

بابا جی صحن سے گزر کر کمرے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ دونوں بازو کمر پر ٹکا کر یوں مشکوک نظروں سے چاروں اطراف کا جائزہ لینے لگے جیسے ابھی چارپائی کے نیچے سے کوئی لڑکی برآمد ہو گی یا دروازے کے پیچھے سے شیمپین وغیرہ کی بوتلیں ملیں گی۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں بابا جی......؟" عادل سے رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھا۔

بابا جی گھوم کر عادل کے عین سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

"کہاں ہیں تمہارے باقی کے سارے دوست......؟"

(ڈبے میں بند کر کے پلنگ کے نیچے چھپائے ہوئے ہیں۔)

"اپنے اپنے کام پر گئے ہوئے ہیں۔"

"واپس کیوں نہیں آئے اب تک......؟ خاصا وقت ہو چلا ہے۔" انہوں نے کمرے میں لگی واحد گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ قبل اس کے کہ عادل ان کو کوئی کرارا سا جواب دیتا۔ دروازہ ایک مرتبہ پھر بجا۔ عادل نے جلدی سے جا کر دروازہ کھولا۔

محب اللہ اور احسن اکٹھے اندر داخل ہوئے۔

"لگتا ہے، دروازے کے ساتھ ہی جڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔" احسن اس کی پھرتی پر خاصا حیران تھا۔ عادل نے جواب دینے کا ارادہ کسی اور وقت پر اٹھا رکھا اور خاموشی سے واپس ہو لیا۔

محب اللہ سلام کرتے ہوئے اندر بڑھا۔ اندر پہنچ کر احسن کی زبان اور محب اللہ کے قدموں کو ایک ساتھ بریک لگی۔

"السلام علیکم بابا جی!" محب اللہ نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ احسن نے البتہ دور دور سے ہی سلام دعا پر اکتفا کیا۔

"آپ کھڑے کیوں ہیں......؟ بیٹھیے نا۔" محب اللہ کو خیال آیا۔

بابا جی کڑے تیوروں سے عادل کو گھورتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"کچھ تھوڑی بہت تمیز اپنے دوستوں کو بھی سکھا دو۔" مخاطب محب اللہ سے تھے۔ نظریں عادل کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ عادل نے بغلیں جھانکنا شروع کر دیں۔

"چائے پئیں گے بابا جی......؟"

(کمینہ، نمبر بنا رہا ہے جیسے بابے نے جائیداد اس کے نام کر دینی ہے)

"عادل یار! ایک پیالی چائے تو بنا۔" محب اللہ نے گردن گھما کر عادل سے کہا۔

عادل نے دانت پیستے ہوئے چند نازیبا کلمات اس کی شان میں بے زبانی ادا کیے۔

"نہیں، نہیں، چائے نہیں پیوں گا میں۔" بابا جی جلدی سے بولے۔

(میں بنا بھی نہیں رہا)

"میں ایک ضروری کام سے آیا تھا تمہارے پاس۔" بابا جی نے روئے سخن محب اللہ کی جانب کیا۔ "یہ ہمارے برابر والے گھر میں صدیقی صاحب رہائش پذیر ہیں۔"

"کیا کریں......؟" "نکال دیں ان کو۔" عادل نے احسن کے کان میں منہ گھسا کر کہا۔

"منہ بند رکھیں۔" احسن نے جوابی سرگوشی کی۔

"اس اتوار ان کی بیٹی کی شادی ہے۔ بے چارے پریشان تھے انتظامات کے سلسلے میں۔ مجھ سے تذکرہ کیا۔ تو مجھے تم لوگوں کا خیال آیا۔ اگر زحمت نہ ہو تو ان کی کچھ مدد وغیرہ کروا دینا۔"

”زحمت کی کیا بات ہے بابا جی! ہم دیکھ لیں گے انتظام وغیرہ۔“ محبّ اللہ نے بابا جی کی تسلی کروائی۔

”چلو، پھر آؤ، تمہاری ملاقات کروا دوں صدیقی صاحب سے۔“ بابا جی اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے ساتھ محبّ اللہ نے بھی قدم باہر کی جانب بڑھائے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ان دونوں کو بھی اشارہ کیا۔ چار و ناچار وہ بھی ساتھ ہو لیے۔

”یعنی کہ چھٹی کا دن برباد۔“ یہ وہ بات تھی جو عادل کے دماغ میں سائرن بجا رہی تھی۔

☆☆☆

باقی تمام لوگ ناشتہ کر کے فارغ ہو چکے تھے۔ عادل کی نیند ہی پوری نہیں ہو رہی تھی۔

”اٹھ جا یار، کسی سے وعدہ کیا ہوا ہے۔ کام کروانا ہے۔“ محبّ اللہ نے اس کے منہ پر سے تکیہ ہٹا کر سائیڈ پر رکھا۔

”تو نے کیا ہے نا وعدہ، جا پورا کر جا کے۔“ عادل نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

”عادل! بچے، ہوش کر کیسی باتیں کر رہا ہے۔“

”تجھے نہیں پتا یہ مولوی خالی خولی وعدے اکیلے کرتا ہے۔ کام میں، سب کو اپنے ساتھ لگائے گا۔“ احسن نے محبّ اللہ پر چوٹ کی۔

”کسی لڑکی سے باغوں میں ملنے کا وعدہ نہیں کیا اس نے، نیکی کا کام ہے کسی کی مدد کرنا، باتیں بنانا چھوڑ دو تم لوگ۔“ حیدر نے خفگی سے پہلے عادل اور پھر احسن کو گھورا۔

محبّ اللہ چپ چاپ ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

عادل انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یار! تم چار لوگ کافی ہو نا، میرے بغیر بھی کام چل جائے گا۔“ عادل بالکل جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”کیوں......؟ تو نے پاؤں میں مہندی لگائی ہے آج......؟“ حیدر کو اس کی بات بالکل پسند نہیں آئی۔

”نہیں یار! وہ اصل میں، کہیں کوئی لڑکی وڑکی مجھ پر مرمٹی تو تم لوگوں کے لیے بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔“

”لڑکی اندھی ہوگی، جو تجھ پر مر مٹے گی۔“ حیدر نے فوراً سوال داغا۔

”کیوں......؟ کیا خرابی ہے مجھ میں......؟ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد ہے۔ دیکھنے میں فواد خان جیسا ہوں۔ آج آڈیشن دینے جاؤں نا تو یہ لمبی لائن لگ جائے ڈائریکٹروں، پروڈیوسروں کی۔“ عادل خاصا برا مان کر بولا۔

”تو، چلا جانا، آڈیشن دینے، روکا کس نے ہے۔“

”بس یار! خیال آجاتا ہے۔ ان بے چاروں کا جن کا پہلے سے روزگار لگا ہوا ہے۔ ایسے ہی میری وجہ سے ان سب کی چھٹی ہو جائے۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

”ماشاء اللہ، سبحان اللہ، بڑی ہمدرد طبیعت پائی ہے اپنے باؤ عادل نے، پچاس، پچاس روپے ادھار مانگ کر مہینہ بمشکل پورا کرتے تھے لیکن شوبز کے ستاروں کی روزی پر لات مارنا ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔“ احسن نے بھی حصہ ڈالنا اپنا فرض سمجھا۔

”مزید کتنی دیر چلے گی تم لوگوں کی بکواس......؟“ ان لوگوں کی فضول اور بے کار کی گفتگو سے تنگ آکر آخر محبّ اللہ کو فارم میں آنا پڑا۔

”صرف اتنی دیر جتنی دیر تک ہمارے ہیرو صاحب بستر نہیں چھوڑ دیتے۔“ احسن نے جواب دیا۔

ہیرو صاحب فوراً ہی چھلانگ لگا کر کھڑے ہو گئے۔

”میں غسل خانے سے ہو کر آتا ہوں، ذرا میرا ناشتہ ریڈی کر دو کوئی۔“ کہہ کر جوابی گولہ باری سے پہلے رفو چکر ہو گیا۔

”ہم لوگ جا رہے ہیں، تو ناشتہ کر کے جلدی آجانا۔“ نہانے اور گنگنانے کے دوران حیدر کی آواز سنی اس نے اور سنتے ہی ان سنی کر دی۔

عادل نے باہر نکل کر خاصا وقت ناشتے میں لگایا، پھر خوب دل لگا کر تیاری کی۔

بہترین سوٹ نکال کر استری کیا، خوب ڈھیر سارا پرفیوم خود پر چھڑکا، خوب جیل لگا کر بال سیٹ کیے۔ ابھی جوتوں کا مرحلہ باقی تھا کہ انس آدھمکا۔

”عادل بھائی! آپ کو بلا رہے ہیں وہ لوگ۔“

”آرہا ہوں یار۔ پتا نہیں تم لوگوں کو کس بات کی جلدی ہے۔“ عادل نے دائیں جوتے میں پاؤں ڈالتے ہوئے کہا۔

”یار، وہ لوگ خاصے غیر پارلیمانی الفاظ استعمال کر رہے ہیں آپ کے لیے۔“

”بس یار انس! یہ دنیا اور دنیا والے جلتے ہیں مجھ سے۔ ویسے مجھے معلوم ہے وہ لوگ کیا کہہ رہے ہوں گے۔ نکما، ہڈ حرام، سست وغیرہ وغیرہ۔ ہے نا......؟“ تائید طلب نظروں سے انس کو دیکھا، ساتھ ہی مسکراہٹ اچھالی۔

”جی نہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں بھوکا آدمی، عین کھانے کے وقت مرے گا آکر۔“ انس نے فوراً سے پہلے تصحیح ضروری سمجھی۔

عادل کی مسکراہٹ سمٹتے سمٹتے غائب ہو گئی۔ جلدی سے دوسرا جوتا پاؤں میں ڈالا اور باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ کھانے سے پہلے پہنچنا اشد ضروری ہو گیا تھا۔

گلی خاصی چوڑی تھی اس کو تین اطراف سے شامیانے لگا کر بند کیا گیا تھا۔ چوتھی سائیڈ گزرگاہ کے طور پر کھلی چھوڑ دی گئی تھی۔

مرد اور خواتین کے حصے کو الگ کرنے کے لیے درمیان میں پارٹیشن کی گئی تھی۔

کچھ کھسیاتا ہوا سا وہ ان تینوں کے پاس پہنچا۔ انس اس کے پیچھے تھا۔ تینوں نے اوپر سے نیچے تک کم و بیش چار بار اس کو گھور گھور کر دیکھا اور مزید بھی دیکھتے رہتے جو وہ انہیں ٹوک نہ دیتا۔

”بس بھی کر جاؤ، نظر لگا کر چھوڑو گے کیا؟ کبھی کوئی خوبصورت اور خوبرو مرد نہیں دیکھا......؟“ جلدی جلدی بول کر اپنی جھینپ مٹانے کی کوشش کی۔

”جگر! سارے ارمان تو نے آج ہی پورے کر لیے ہیں۔ کچھ ہماری شادیوں کے لیے بچا لیتا۔“ احسن نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

عادل سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

”ہاں، وہ کام کیا کرنا ہے......؟“ اچانک ہی خیال آیا تو پوچھ بیٹھا۔

”باقی سارے انتظامات تو مکمل ہیں۔ بس اگر ایک ڈانس کا آئٹم ہو جائے تو......“

بات ابھی احسن کے منہ میں ہی تھی کہ بارات کے آنے کا شور مچ گیا۔

محبّ اللہ خود دیگوں کے پاس رک گیا۔ ان لوگوں کو مختلف جگہوں پر انتظامات دیکھنے کی ذمہ داری سونپ دی۔

عادل خوشی خوشی خواتین والے حصے کا انتظام سنبھالنے پہنچ گیا۔

کھانا کھلنے کی دیر تھی۔ ایک ہڑبونگ مچ گئی، تمام خواتین نے کرسیوں کو پھلانگتے، ایک دوسرے کے دوپٹے کے کناروں کو پاؤں سے روندتے کھانے والی میزوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

اس قدر افراتفری کا سماں تھا کہ عادل انتظام بھول بھال ہکا بکا کھڑا خواتین کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

کہاں تو ناز و ادا دکھاتی، جلوے بکھیرتی حسینائیں اور کہاں یہ عالم کہ ڈونگوں کے چمچوں پر لڑائیاں، پلیٹوں پر جھگڑے، ایک دوسرے کی

for more novels and digests

کرسیوں پر قبضے۔

یوں ہی بھٹکتی نگاہ ایک آنٹی کی پلیٹ سے جا ٹکرائی۔ آنٹی پلیٹ کے اندر بوٹیوں کا پہاڑ کھڑا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور خاصی کامیاب بھی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ پہاڑ ماؤنٹ ایورسٹ کا نمبر کاٹ جاتا' انس نے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

عادل چونک کر پلٹا۔

''عادل بھائی! حیدر بھائی کہہ رہے ہیں منہ بند کرلیں، مکھی اندر چلی جائے گی۔''

عادل نے پہلے انس کو اور پھر مردانے میں کھڑے حیدر کو دیکھا۔ حیدر نے اسے اپنی طرف متوجہ پا کر ہاتھ لہرایا۔ ساتھ ہی ساتھ دانتوں کی نمائش کی۔ عادل نے پنجہ گھما کر اسے دکھایا اور انس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اپنے حیدر بھائی سے کہو، اپنا سارا دھیان مردوں کی سمت رکھیں۔ یہاں کا انتظام سنبھالنے کو میں کافی ہوں۔''

''عادل بھائی! آپ بھی خواتین سے زیادہ انتظام پر دھیان رکھیں۔'' انس دانت نکوستا کہہ کر وہاں سے کھسک گیا۔

''ابے...... بتاؤں تجھے......'' قبل اس کے کہ عادل کچھ کہتا، انس وہاں سے کھسک چکا تھا۔

''چہ پدی، چہ پدی کا شوربہ۔'' عادل بڑبڑایا۔

عادل نے دوبارہ اپنی توجہ کھانے اور کھانے پر ٹوٹ پڑتی خواتین کی جانب مبذول کی۔

کھانے سے زیادہ جنگ کا سا منظر محسوس ہو رہا تھا۔ خواتین کی بے تحاشا بھری ہوئی پلیٹیں دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ کھانا ان کو اپنی زندگی میں نہ پہلے کبھی ملا ہے اور نہ آج کے بعد کبھی ملے گا۔

''بات سنو۔'' اسے اپنے انتہائی قریب سے آواز سنائی دی۔

اس نے آواز کی سمت دیکھا تو ایک لڑکی کھانے سے انصاف کرتے ہوئے اسی سے مخاطب تھی۔

''جی؟''

''ذرا سویٹ پکڑانا وہاں سے۔'' ہاتھ سے کھانے کی میزوں کی جانب اشارہ کیا۔

''جی، میں پکڑاؤں سویٹ؟''

عادل نے حیرت سے اس کی جانب دیکھتے اپنی طرف اشارہ کیا۔ تب ہی اس کے برابر میں بیٹھی لڑکی نے اس کے کان میں کچھ کہا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

''اچھا......'' اور اچھا کو اچھا خاصا کھینچ کر ادا کیا۔ ''میں تو اس کو ویٹر سمجھی تھی۔'' باآواز بلند اپنے خیالات کا اظہار بھی کر ڈالا۔

عادل کا جی مکدر ہو گیا۔ اتنی بہترین تیاری پر وہ اسے ویٹر سمجھی تھی۔ اگر وہ یوں ہی سا تیار ہو کر آ جاتا، پھر تو یقیناً مانگنے والا ہی سمجھتی۔

بس، یہ کافی تھا۔ وہ وہاں سے سید حا محب اللہ کے پاس پہنچا۔

''مولوی! تو نے مجھے غلط جگہ بھیج دیا، اب کسی اور کو بھیج دے وہاں۔'' محب اللہ نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

''تجھے زنانہ سائیڈ پر میں نے بھیجا تھا؟''

اس کی شکل دیکھ کر عادل کو یاد آیا کہ وہ محب اللہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بھاگتا ہوا خواتین والے لاؤنج میں پہنچ گیا تھا۔

''بہر حال جو کچھ بھی ہے، میں اب وہاں نہیں جا رہا۔ لڑکیاں خوامخواہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' (یہ نہیں بتایا، ویٹر سمجھ کر فری ہو رہی تھی)۔

''اچھا، انس کو بھیج دے ادھر۔ تو، ذرا ادھر دیکھ کوئی ڈش خالی تو نہیں ہے۔'' ہاتھ سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مردانے میں کھانے کا آخری آخری دور چل رہا تھا۔ کرسیوں کی ترتیب از حد خراب ہو چکی تھی۔

عادل، انس کے پاس آیا۔

''یار! وہ اپنا مولوی کہہ رہا ہے کہ تو ادھر خواتین والی سائیڈ پر چلا جا۔''

''کیوں؟ آپ کو وہاں سے نکال دیا گیا ہے؟'' انس نے دانتوں کی نمائش کی۔ عادل نے محض اسے گھورنے پر اکتفا کیا۔

''یار! عادل بھائی! میں چلا تو جاؤں ادھر۔'' آنکھوں سے اشارہ کیا۔ ''مگر اگر کوئی لڑکی مجھ پر مر مٹی تو آپ لوگوں کے لیے خاصا مسئلہ ہو جائے گا۔''

انس نے اس کے الفاظ اسی کو لوٹائے۔

''اس کی تو فکر نہ کر لالے۔'' عادل اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ''اگر ایسا کچھ ہوا تو ہم حسینہ کو اپنے لگژری فلیٹ کے درشن کرا دیں گے۔ اپنا ایسا بھیانک مستقبل دیکھ کر خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔''

''ہوں......'' انس نے ہنکارا بھرا۔ ''تو مطلب، چلا جاؤں۔ خطرناک صورت حال سنبھال لیں گے آپ۔''

''اوکے۔''

اسے رخصت کر کے اب عادل ارد گرد کا جائزہ لینے میں مصروف گیا۔ کرسیوں پر، میزوں پر یہاں تک کہ زمین پر بھی پلیٹوں، گلاسوں اور چمچوں کی بھرمار تھی۔

ہر پلیٹ بچے کھچے چاولوں، بوٹیوں اور میٹھے سے پر تھی۔ عادل نے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ایک بھی مکمل صاف کی گئی پلیٹ ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ افسوس سے سر ہلایا۔

''تو یہ حال ہے ہمارا۔''

''یہ...... چھت رہ گئی ہے۔''

آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تو برابر میں حیدر اور انس کھڑے نظر آئے۔

''کیا......؟'' عادل کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''میں نے کہا یہ چھت رہ گئی ہے۔'' حیدر نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

عادل نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ لال اور پیلے رنگ کے ریشمی کپڑے سے بنائی گئی مصنوعی چھت پر کوئی قابل ذکر چیز دکھائی نہیں دی۔ چھت سے ہوتی نظر حیدر کی نظروں سے ٹکرائی۔ ایک ابرو چڑھا کر اس کو اشارہ کیا۔

''کیا مطلب؟''

''بھئی، میں کہہ رہا ہوں کہ جب سے مابدولت عادل جنجوعہ صاحب تشریف لائے ہیں، ہر چیز پر خصوصی نظر کرم فرما رہے ہیں۔'' کوئی مرد وزن، کوئی پلیٹ، چمچ، دیگ، کرسی، در و دیوار کوئی چیز ایسی رہ نہیں گئی جس کو آپ کی خصوصی توجہ نہ ملی ہو۔''

''سوائے انتظام دیکھنے کے جس کے لیے خاص طور پر ہم سے درخواست کی گئی تھی۔'' احسن نے بھی لقمہ دیا درمیان میں۔ ''اور کوئی چیز چھوڑی نہیں ہے آپ نے جس کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا نہ ہو۔''

''تو یہ چھت رہ گئی ہے۔ اس کو بھی نوازیں، چند منٹ اس کو بھی گھورنے میں صرف کر دیں۔''

حیدر نے بات کی وضاحت کی۔

''بہت مہربانی، جو آپ اتنی تفصیل سے میرا جائزہ لینے میں مصروف رہے۔'' عادل نے تعظیماً سر کو تھوڑا سا خم کیا۔

تب ہی بابا جی، صدیقی صاحب کی معیت میں ان لوگوں کے پاس آئے۔

''بھئی، تم لوگ بھی کھانا وانا کھا لو۔ کب سے کام میں لگے ہوئے ہو۔''

''ہاں جی، چلیں۔'' سب سے پہلے کھانے کے لیے بڑھنے والا عادل تھا۔ حیدر اور احسن اس کی پھرتی پر بس اس کی پشت گھورتے رہ گئے۔

''یہ اتنا سارا کھانا ہم نے کیا کرنا ہے؟''

عادل حیرت سے بڑے بڑے برتنوں میں بھرا ہوا کھانا دیکھ رہا تھا جو صدیقی صاحب نے زبردستی

ان لوگوں نے ساتھ کر دیا تھا۔

''ایسا کرتے ہیں پلاسٹک کی تھیلیوں میں ڈال کر بیچ آتے ہیں۔'' یہ مشورہ احسن کی طرف سے آیا تھا۔

اس کی بات پر سب لوگوں نے گھور کر اسے دیکھا۔

''اچھا بھئی، جو مرضی آئے کرلو۔ میں نے تو یوں ہی ایک مشورہ دیا تھا۔'' وہ ان سب کی نظروں سے خائف ہوا۔

''ایسا ہے، یہ کوئی تین چار گلیاں چھوڑ کر میدان کے پچھلی طرف جھگیاں ہیں، وہاں بانٹ آتے ہیں یہ کھانا۔'' محبت اللہ کو ہی آخر ایک معقول حل سوجھا۔

تمام لوگ اتفاق رائے سے کھانے پینے کے تمام برتن لے کر جھگیوں تک پہنچے۔

جوں جوں لوگوں کو معلوم ہوتا گیا کہ یہ کھانا یہاں تقسیم کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ توں توں صورت حال خراب ہوتی گئی۔

پہلے پہل لوگوں نے ان سے صرف وہ تھیلیاں جھپٹنے کی کوشش کی جس میں ڈال کر وہ سالن، چاول وغیرہ بانٹ رہے تھے۔

اس کے بعد جیسے جیسے رش بڑھتا گیا، حالات مزید خراب ہوگئے۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہ صورت حال ہوگئی کہ وہ بمشکل برتن اور جانیں بچا کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

حال سے بے حال ہوتے، دوڑتے بھاگتے ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے، وہ سب آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئے۔

''یار ہم لوگ اگر دس منٹ مزید وہاں رکے ہوتے نا تو اب تک تو لوگ ہمارے کپڑے پھاڑ کر ہمارے بھی تکے بنا کر کھا چکے ہوتے۔'' محبت اللہ نے کہتے ہوئے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''تو ثابت ہوا کہ بلا تفریق امیر و غریب ہم ایک بھوکی قوم ہیں۔'' عادل نے تجزیہ پیش کیا۔

''ہم اجتماعی طور پر ایک ایسی بھوک کا شکار ہیں جو کھانے سے نہیں تربیت سے دور ہوگی۔'' انس نے اپنا حصہ ڈالا۔

''میرا خیال ہے کہ شادیوں پر کھانا کھلنے کے وقت پولیس کی ڈیوٹی ہونی چاہیے جو بھوک سے زائد یعنی پلیٹ میں بچے ہوئے کھانے پر چالان کرتی جائے۔'' حیدر نے اپنی دانست میں انتہائی معقول تجویز پیش کی۔

''تو پھر پولیس والوں کے کھانے کا چالان کون کرے گا؟'' احسن کا اعتراض درست مانا گیا۔

''یعنی یہ سب کچھ ایسے ہی چلتا رہے گا، یہاں، کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔'' عادل کا سوال تمام حاضرین محفل سے تھا۔

''تبدیلی کا آغاز ہمیشہ فرد واحد سے ہوتا ہے سو آج ہم یہاں بیٹھ کر عہد کرتے ہیں کہ ہم لوگوں پر تنقید کرنے کے بجائے اپنی اصلاح کریں گے۔'' محبت اللہ نے بات مکمل کی۔

بات مکمل ہونے کی دیر تھی کہ عادل نے تالیاں بجانی شروع کردیں۔ ''واؤ زبردست؟''

اس کی دیکھا دیکھی باقی سب نے بھی تالیاں بجائیں۔

''تم سارے میراثی مل کر تالیاں بجاؤ، میں جارہا ہوں۔'' محبت اللہ سخت خراب موڈ کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔

''تیری وجہ سے مولوی ناراض ہوگیا۔'' احسن نے سخت غصے سے عادل کو دیکھا۔ ''تو نے مولوی کی بات دھیان سے نہیں سنی نا۔''

''وہ کہہ رہا تھا' تبدیلی ہمیشہ فرد واحد سے آتی ہے۔ بھئی میں نے اگر بجانا شروع کردی تھیں تالیاں، تو تم لوگوں کو کیا ضرورت تھی میرا ساتھ دینے کی۔ نہ بجاتے تم لوگ تالیاں۔ ہر جرم میں شریک ہو کر آخر میں ملبہ دوسروں پر گرا دیتے ہو۔'' عادل کا موڈ بھی آف ہوا۔

''بھئی۔ تم لوگ آپس میں لڑنا بند کرو۔'' حیدر

محبت زچ ہو کر بولا۔ ''کوئی ترکیب سوچو مولانا صاحب کو راضی کرنے کی۔''

''آئیڈیا۔'' عادل نے چٹکی بجائی۔ اس نے بولنا شروع کیا، باقی سب نے سننا۔

''گڈ آئیڈیا۔'' احسن نے پسندیدگی کی سند عطا کردی اس کے مشورے کو۔

''تو بس پھر تیار ہو جاؤ۔'' سب نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

محبت اللہ گھر میں داخل ہوا تو خاموشی اور اندھیرے کا راج تھا گھر پر۔

''دروازہ کھلا چھوڑ کر کہاں مر گئے ہیں سب۔'' بڑبڑاتے ہوئے لائٹ جلائی۔ پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا، گرتے گرتے بچا۔

تب ہی کمرہ روشنی میں نہا گیا۔

حیرت سے اس چیز کو دیکھا جس سے پاؤں ٹکرایا تھا۔ محبت اللہ نے آنکھیں مل مل کر دو تین بار اس مرغے کو دیکھا جس سے وہ ٹکرایا تھا۔

اور پھر تو اس کی حیرت دو چند، تین چند، چار چند...... ہوتی چلی گئی۔

وہ چاروں تقریباً دائرے کی صورت میں مرغا بنے ہوئے تھے اس طرح کے، سب کے منہ آمنے سامنے تھے اور پیٹھ مخالف سمت۔

''تم لوگ بالکل غلط جگہ پر اپنے ٹیلنٹ کو ضائع کر رہے ہو۔ تم لوگوں کی صحیح جگہ چڑیا گھر ہے یا پھر کوئی سرکس......''

کسی کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ محبت اللہ جھنجلایا۔

''یہ تماشا کتنی دیر تک چلے گا؟''

ہنوز خاموشی۔

وہ اتنے سخت غصے میں گھر سے نکلا تھا کہ اسے لگ رہا تھا وہ کتنے ہی دن ان میں سے کسی سے بات نہیں کر پائے گا اور اب یہ حال تھا کہ وہ بولے جا رہا تھا۔ باقی سب خاموش تھے۔

''کیا کروں؟'' وہ سر پہ ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

بجا رہا ہو تو......

''تو بانگیں دینا شروع کردوں گا۔'' عادل نے انس کا جملہ درمیان سے ہی اچک لیا۔

''نہیں، میری کمر ٹوٹ جائے گی، ایمان سے۔'' انس نے بذات خود جلدی سے اپنا جملہ مکمل کیا ''تو میں نے تھوڑا ہی مرغا بنایا ہے تم لوگوں کو، اٹھ جاؤ۔''

''نہیں نا...... ایسے نہیں اٹھ سکتے، ہم لوگ۔'' انس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیسے اٹھو گے؟''

''ایسے......'' عادل کہتے ہوئے چوپایوں کے سے انداز میں ہاتھوں اور پاؤں کے بل چلتا محبت اللہ کے قریب ہوا اور اس کا پیر پکڑ لیا۔

''معاف کردے بھائی! غلطی ہوگئی۔'' اس کی دیکھا دیکھی باقی سب بھی اسی کے انداز میں محبت اللہ کی طرف بڑھے۔

اس اچانک افتاد پر محبت اللہ بری طرح بوکھلا گیا۔ ''ہاں ہاں بھئی معاف کردیا۔''

''نہیں، دل سے معاف کر پہلے۔'' اس کے دونوں پاؤں مختلف ہاتھوں نے جکڑ رکھے تھے۔

''کردیا نا یار! دل سے معاف کردیا۔ اب پاؤں تو چھوڑو میرے۔''

سب کے سب اٹھ کر کھڑے ہوئے اور اس کے سامنے کان پکڑ لیے۔ حیدر نے بولنا شروع کیا۔

''ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ سے اچھے اور سچے انسان بن کر زندگی گزاریں گے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے، کسی کا دل نہیں دکھائیں گے۔ غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی مدد کریں گے اور ......اور کیا تھا؟''

مدد طلب نظروں سے احسن کو دیکھا۔

''اور کبھی تالی نہیں بجائیں گے۔'' جواب عادل کی طرف سے آیا۔

اس کی بات پر محبت اللہ کا ایک بے ساختہ قہقہہ گونجا، جس میں باقی سب کے قہقہے بھی شامل

میمونہ صدف

گمشدہ محبت

میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ میرے تین بچے ہیں۔ میری بیوی زوناش، میری ماما کی طرح بے تحاشا خوبصورت ہے۔ اس کا تعلق ایک بہت بڑے گھرانے سے ہے۔ زوناش میری زندگی کی ساتھی ہے۔ میرا خیال ہے زندگی اور دل دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جو زندگی میں ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ دل میں بھی ہو۔ ماما کا کہنا تھا کہ زوناش کے علاوہ کوئی اور لڑکی میری وائف ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

زوناش مجھے سویٹ ہارٹ کہتی ہے۔ کبھی کبھی ہنی بھی کہتی۔ جبکہ وہ بھی جانتی ہے کہ ہمارے رشتے کی مٹھاس آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے۔ ہر شادی شدہ کپل کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ چمکتی دمکتی دکھائی دینے والی شادی شدہ زندگی کی کیفیتیں، کچھ عرصے بعد کھوکھلی نظر آنے لگتی ہے۔

میرے تینوں بچے اپنی اپنی پڑھائی میں مصروف ہیں۔ زندگی پہلے الاؤ کی طرح دہکتی تھی، اب سرد پڑنے لگی ہے۔ وہ چیزیں جن کی کبھی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی، اب وہ چیزیں دھندلا کر پس منظر میں چلی گئی ہیں۔ لیکن ماضی کے کچھ واقعات جو پرانے اخبار کی طرح لگتے تھے، اب میری زندگی کے میگزین کا سرورق بن گئے ہیں۔

☆☆☆

لگتا ہے کل کی ہی بات تھی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی ہے وہ پیچھے کی طرف سفر کرنے لگتا ہے۔ اس سفر میں جتنے لوگ بچھڑ چکے تھے، وہ سامنے آ کر کھڑے ہونے لگتے ہیں۔

خدیجہ...... میری اکلوتی خالہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ہر وقت سر پہ دوپٹا رکھتی تھی۔ اس کی آنکھیں زیادہ تر نم رہتیں۔ پلکیں لرزتی رہتی تھیں۔ ہنستی تھی تو دل چاہتا تھا اسے دیکھتے رہو۔

خدیجہ آج کل ہر روز میرے خواب میں آتی ہے۔ نیند سے آنکھیں کھلتی ہیں تو سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ ماما جیسی خوب صورت نہیں تھی۔ وہ خالہ پر گئی تھی۔ اس کا حسن جلا دینے والا نہیں تھا۔ وہ شعلہ جوالا نہیں تھی۔ وہ صبح صادق جیسی تھی۔ پرسکون اور فرحت بخش۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرے دل پر پھوار پڑ جاتی تھی۔

میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ میری اس جنگ کا آغاز کب ہوا تھا۔ ایسا آخر کیا ہو گیا تھا جس نے ہم دونوں کو الگ کر دیا۔ ماما کی بے جا انا کی وجہ سے سب ہوا تھا یا میری بزدلی کی وجہ سے۔

ماما بہت خوبصورت ہیں۔ بہت زیادہ۔ وہ بتاتی تھیں کہ کالج میں وہ اپنے حسن کی وجہ سے بہت مشہور تھیں۔ اکثر لڑکیاں اپنے بھائیوں کو بہانے سے بلا کر انہیں دکھایا کرتی تھیں۔ کالج سے ہی ان کے لیے بہت سے پروپوزل بھی آئے تھے۔ نانا انکار کر دیتے۔ ان کی منگنی بچپن سے ہی ان کے چچازاد سے ہو چکی تھی۔ نانا ان کی شادی ان ہی سے کرنا چاہتے تھے۔

ماما چھوٹے سے گھر میں رہتی تھیں لیکن ان کی شادی بہت بڑے آدمی سے ہوئی تھی۔ بقول ماما نانا ہر اچھے رشتے کو انکار کر دیتے۔ ماما نے بولڈ اسٹیپ لیا

کے تھے۔ اسی لیے ماما پر ان کا دل آ گیا۔ ماما کو امیر ہونے کا بہت شوق تھا۔ انہیں غربت سے سخت نفرت تھی۔ ماما کی ایک چھوٹی بہن تھیں۔ زہرہ، میری خالہ۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ نانا ابو کے گھر میں اپنی بیٹی اور شوہر کے ساتھ رہتی تھیں۔

بچپن میں کچھ باتیں سننے میں آتی تھیں۔ جب بڑا ہوا تو ان کے مفہوم سمجھ میں آنے لگے۔ چھوٹی خالہ کی شادی ماما کے چچازاد منگیتر سے ہوگئی تھی۔ نانا نے ہی ان کی پرورش کی تھی۔ اسی لیے وہ شادی کے بعد بھی نانا کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

ماما خالہ کی شادی کسی اچھے خاندان میں کروانا چاہتی تھیں لیکن نانا ابو نے اپنے بھتیجے کا نکاح ان سے پڑھوا دیا۔ پہلے مجھے لگتا تھا کہ ماما نانا ابو سے ناراض ہیں لیکن جب ذرا بڑا ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ تو نانا ابو تھے جو ماما سے ناراض تھے۔

☆☆☆

''تایا جی کی حالت ٹھیک نہیں، اپنی ضد توڑ دو، ایک بار آ کر ان سے مل لو۔ وہ بہت بیمار ہیں۔'' خدیجہ کے ابو پہلی بار ہمارے گھر ماما سے ملنے آئے تھے۔

''انہوں نے ہی کہا تھا میں مر بھی جاؤں تو میری شکل دیکھنے نہ آنا......''

''کیا ماں باپ کا اتنا حق بھی نہیں کہ وہ غصے میں کچھ کہہ دیں۔ اپنے ہی مرنے کی بات کی تھی، تمہیں تو کچھ نہیں کہا تھا۔''

''تمہیں ہمارے خاندانی معاملات میں بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے ابو جی مجھ سے ناراض ہوئے تھے۔ تمہارے پاس تھا کیا جو میں تم سے شادی کرتی۔ خود ہی کچھ سوچ سمجھ لیتے۔ کتنا کہا گھر چھوڑ دو، کہیں دفعان ہو جاؤ۔ ہونہہ! تمہیں مفت کی توڑنے کی عادت تھی۔ میرے بدلے میں ابو نے زہرہ کی قسمت تمہارے ساتھ پھوڑ دی۔ اب بہت خوش ہو گے تم؟ بیوی بھی مل گئی، بیوی کا گھر بھی

''میں دس سال پہلے ہی وہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا سویرا! اگر تایا جی نے اپنی قسم دے کر روک نہ لیا ہوتا۔ کوئی بیٹا نہیں ہے ان کا، کیسے ان کے احسانات بھول کر انہیں بڑھاپے میں اکیلا چھوڑ جاتا۔ گھر تمہارے اور زہرہ کے نام ہے۔ مجھے تایا جی کی جائیداد سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔''

''ہونہہ......بس یہ باتیں ہی لے ڈوبیں میرے باپ کو تمہاری وجہ سے ہوا ہے سب۔''

''میں مان لیتا ہوں سویرا! سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ اب چلو میرے ساتھ۔''

ماما اس رات گئیں یا نہیں، لیکن چند دنوں بعد میں نانا کے گھر ان کے ساتھ پہنچ گیا۔ نانا بہت بیمار تھے۔ میرا ہاتھ انہوں نے نانا کے ہاتھ میں دے دیا، جسے انہوں نے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ان کے سرہانے خدیجہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے نانا کا سر دبا رہی تھی۔ جیسے ہی نانا نے میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے رو دینے والے انداز سے نانا کو دیکھا۔ نانا ہنس دیے تھے۔ اس کا ہاتھ بھی پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ نانا کے ہونٹوں سے لگے ہوئے تھے۔

''چلو بچو! تم دونوں بھی دوستی کر لو۔'' نانا نے اس کے ہاتھ کو میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ ماما نے منہ بنا کر خدیجہ کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر میرا ہاتھ کھینچ لیا۔

''جاؤ جا کر ہاتھ دھو کر آؤ......نانا بیمار ہیں، جراثیم لگ گئے ہوں گے۔'' جھٹکے سے انہوں نے مجھے خدیجہ سے الگ کر دیا۔

جس وقت میں اپنے جراثیم والے ہاتھ دھونے جا رہا تھا، نانا نے مجھے آنکھ ماری اور ہنسنے لگے۔ مجھے نانا ابو سے ملنا بہت اچھا لگا تھا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے۔ میری الٹی سیدھی باتیں سنتے رہتے۔ ماما اکثر نانا کے ہاں جایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ڈرائیور مجھے نانا کے گھر ڈراپ کر دیتا۔ ڈرائیور کے ساتھ

بس نانا کے ساتھ ساتھ ہی رہوں۔ کسی اور سے بات نہ کروں۔

نانا ابو مجھے گراؤنڈ لے جاتے۔ وہاں ہم کرکٹ کھیلتے۔ خدیجہ بھاگ کر بال پکڑ کر لاتی۔ نانا ہمیں آئس کریم کھلانے کے لیے بھی لے جاتے تھے۔

خدیجہ ہر وقت سر پر دوپٹا لینے میں مصروف رہتی تھی۔ اسے دوپٹا اوڑھنے کا بہت شوق تھا۔ بازار میں کتنی ہی بار رک کر نانا کو اس کا دوپٹا ٹھیک کرنا پڑتا۔ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی۔ ایک بار میں نے غصے سے اس کا دوپٹا کھینچ کر دور پھینک دیا۔

''یہ کیا کیا دانی......؟؟'' وہ چلا اٹھی۔

''تمہاری وجہ سے بار بار نانا ابو کو رکنا پڑتا ہے۔'' میں چڑ کر بولا۔

پہلے تو وہ مجھے گھور کر دیکھتی رہی پھر یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نانا اس کا دوپٹا اٹھا کر لے آئے تھے۔ اس کا رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔

''تم نے مجھ سے دوستی کی تھی ......پھر دوستی توڑی کیوں......کیوں توڑی دانی......''

مجھے ہنسی آ گئی۔ نانا نے ہم دونوں کو ہاتھ ملانے کے لیے کہا۔ ہماری دوبارہ دوستی کروا دی۔

''لو بھئی دانیال صاحب! اب دوبارہ دوستی نہیں توڑنا!''

نانا مجھے صاحب کہتے تھے۔ کہتے تھے میں بڑا آدمی ہوں۔ مجھے تمیز سے بلانا چاہیے۔

☆☆☆

نانا کے انتقال کے بعد میرا وہاں آنا جانا کم ہو گیا تھا۔ ماما نے مجھے کانونٹ بھیج دیا۔ ایک دو بار خالہ نے کانونٹ مجھ سے فون پر بات کی۔ اے لیول کے بعد اسٹڈی کے لیے انگلینڈ جانے سے پہلے، ایک دن اچانک میں نے کار کا رخ نانا کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ جانے سے پہلے میں ایک نظر نانا کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔

اس کے نیچے نانا کی چارپائی ہوا کرتی تھی۔ وہیں بیٹھ کر وہ کتاب یا اخبار پڑھتے تھے۔ وہیں ہم کھیلتے تھے۔ میں اس درخت پر بہت بار چڑھا۔ ایک بار گر بھی گیا تھا۔ چوٹ پر ہلدی اور تیل لگا کر نانا نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''دیکھو دانیال صاحب! اپنی ماں کو نہ بتانا۔ ورنہ وہ یہ درخت کٹوا دے گی۔''

ماما، نانا کا وہ چہیتا درخت نہ کٹوا دیں، میں نے اپنی چوٹ کو ماما سے چھپا لیا تھا۔ اس وقت درخت کے نیچے کھڑے نامحسوس طور پر میرا ہاتھ کہنی کی طرف چلا گیا۔ میں بلا ارادہ اپنی کہنی رگڑ رہا تھا۔

''دانی......؟؟''

میری پشت سے آواز آئی، میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ خدیجہ نے مجھے پشت سے ہی پہچان لیا تھا۔

''ہماری یاد آ ہی گئی۔'' وہ جھک کر چھوٹی میز سے کتابیں سمیٹنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے کتابیں سمیٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنے آنسو مجھ سے چھپا رہی تھی۔

''بیٹھ جائیں۔ یا آج بھی نہیں بیٹھیں گے۔'' اپنے دوپٹے کے پلو سے اس نے غیر محسوس انداز میں کرسی کو جھاڑا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر دوپٹا تھا لینے کے انداز سے ـــــ میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ ورنہ مجھے اس کی شکل بالکل بھی یاد نہیں تھی۔ اس کی کالی موٹی آنکھیں، جن میں بڑی جلدی آنسو آ جایا کرتے تھے، آج بھی موٹے موٹے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

''خالہ کہاں ہیں؟؟'' میں گھر کی اجاڑ حالت کو دیکھ رہا تھا۔ گھر کے در و دیوار ـــــ گھر والوں کی حالت زار کا راز کھول رہے تھے۔

''جو سامنے کھڑی ہے اس کا حال تو پوچھ لیں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ انگلی کی پور سے اپنی نم آنکھ صاف کی۔

''میں یہاں سے گزر رہا تھا تو......'' میں گڑبڑا

"گزر ہی رہے ہوں گے، ورنہ یہاں آنے کے لیے کون مرا جا رہا ہوگا۔"

اس کا انداز ویسا ہی تھا جیسے بازار میں کہا تھا۔

"تم نے مجھ سے دوستی کی تھی پھر دوستی توڑی کیوں۔ کیوں توڑی دانی۔"

وہ اندر گئی اور میرے لیے چائے بنا کر لے آئی۔

"میں چائے نہیں پیتا......" میں نے ایک نظر چائے کے کپ کی طرف دیکھا۔

"گرمیوں میں ہم روح افزا پیتے ہیں۔ سردیوں میں چائے۔ کوئی اور سوفٹ ڈرنک بھی نہیں ہے۔ گھر میں بھی کوئی نہیں ہے۔ کس سے منگواؤں۔"

میں نے خاموشی سے چائے کا کپ اپنی طرف کھسکا لیا۔ میں زندگی میں پہلی بار چائے پی رہا تھا۔

"تم نے مجھے کیسے پہچانا؟؟" چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ پھر نظریں ہٹا لیں۔

"آپ کو پہچاننا مشکل نہیں تھا۔" اس نے نظریں چرائیں۔

"خالہ...... کہاں ہیں؟؟"

"وہ بازار گئی ہیں...... ابو جاب پر ہیں۔ وارث اسکول۔"

"تم کالج جاتی ہو؟" نہ جانے کیا بات تھی، اس سے نظریں ملانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

"میں رزلٹ آنے کا ویٹ کر رہی ہوں۔ پھر جاب کروں گی۔"

"یونیورسٹی نہیں جاؤ گی؟"

"وہ تو آپ جیسے لوگ جاتے ہیں دانیال صاحب۔ ہم دس بارہ جماعتیں پڑھ کر کمانے لگتے ہیں۔ ابو بیمار رہتے ہیں۔ وارث بھی ابھی چھوٹا ہے اس لیے۔"

مجھے ایسی باتیں سننے کی عادت نہیں تھی یا کبھی سنی نہیں تھیں۔ میں نے ذرا بے زاری سے اسے دیکھا

چائے کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتا۔ خالہ اور خالو کو سلام دینے کے لیے کہتا۔

"پھر آئیں گے؟" پیچھے سے اس کی آواز آئی۔

کوئی جواب دیے بغیر میں وہاں سے واپس آ گیا تھا۔

"دوبارہ وہاں نہ جانا...... وہاں ہمارا کوئی نہیں رہتا......" ماما کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں وہاں گیا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھیں۔

"ماما وہ خالہ......"

"وہ میری بہن ہے۔ ملنا ہوگا تو میں مل لوں گی۔ تمہارا جو تھوڑا بہت پیار تھا وہ نانا سے تھا۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔"

☆☆☆

دو سال بعد میں چالیس سال کا ہو جاؤں گا۔ اتنی عمر گزرنے کے بعد میری آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ رشتے، مالی حیثیت بدلنے کے ساتھ بدل جاتے ہیں؟ یا مالی حیثیت بدلنے پر دل سے اتر جاتے ہیں۔ ماما کو کس بات سے سب سے زیادہ نفرت تھی۔ نانا کے چھوٹے گھر اور غربت سے۔ خالہ سے یا پھر اپنے چچازاد سے جوان کے بچپن کے منگیتر بھی تھے۔

کیا ماما چاہتی تھیں کہ وہ غربت کے مارے، شکوے شکایتیں کرتے ہوئے نظر آئیں۔ ان کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ یا ماما کو یہ اعزاز چاہیے تھا کہ اتنا امیر ہو کر انہوں نے کوئی معرکہ مار لیا ہے۔ خدیجہ کے ابو غریب رہ گئے ہیں۔ وہ سب مان لیں کہ ماما کا فیصلہ درست تھا۔ نانا ابو، خالہ اور خالو سب غلط تھے۔

☆☆☆

ماما کے منع کرنے کے باوجود میں دوبارہ خالہ کے گھر چلا گیا۔ خالہ اور خالو امرود کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ذرا دور خدیجہ نماز پڑھ رہی تھی۔

خدیجہ نے سلام پھیرا تو مجھ پر اس کی نظر پڑی۔

وہ زیرِ لب مسکرانے لگی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ خالہ جلدی سے میرے لیے چائے بنا لائی تھیں۔ چائے بہت اچھی بنی تھی۔ خالہ مجھ پر واری صدقے جا رہی تھیں۔ وہ بار بار رونے لگتیں۔ خالو مجھ سے کالونٹ کی باتیں پوچھ رہے تھے۔

خالو کا بیٹھنے، بات کرنے، چلنے پھرنے کا انداز بالکل نانا ابو جیسا تھا۔ خدیجہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اپنے چائے کے کپ کے کنارے پر وہ انگلی سے گول دائرے بنا رہی تھی۔ ایک بار اس نے ترچھی نظریں کر کے مجھے دیکھا۔ میں نے بھی اسے دیکھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس بار میں اس کے لیے وہاں آیا ہوں۔

خالو مغرب کی نماز کے لیے اٹھ کر چلے گئے۔

میں خدا حافظ کہہ کر واپس جانے لگا۔ خدیجہ نے مجھے پیچھے سے آواز نہیں دی۔ مجھے مایوسی ہو رہی تھی۔ وہ میرے پیچھے ہی کھڑی ہے میں یہ محسوس کر سکتا تھا۔ جھنجھلا کر میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ میری جھنجھلاہٹ پر زیرِ لب ہنسنے لگی تھی۔

"کچھ بھول گئے ہو؟" وہ محظوظ ہو رہی تھی۔

میں چل کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں بھول گیا تھا خدیجہ۔ اب سب یاد آ گیا ہے۔"

میں اور وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر بارش میں کھیلا کرتے تھے۔ پانی اکٹھا ہو جاتا تھا اس میں چھلانگیں لگایا کرتے تھے۔ امرود توڑنے کے لیے پہلے میں اسے اوپر چڑھایا کرتا پھر خود چڑھتا۔ جو میٹھا امرود ہوتا وہ خدیجہ مجھے دے دیا کرتی تھی۔ درخت سے گرنے پر جب مجھے چوٹ آئی تھی اس چوٹ پر وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی تھی۔ جب نانا کا جنازہ اٹھا تھا تب بھی وہ ہچکیاں بھر رہی تھی۔

"تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے دانی...... وعدہ کرو...... کرو وعدہ......"

مجھے اپنا کیا ہوا وہ وعدہ یاد آ گیا تھا۔ میں نے وہ وعدہ ایفا نہیں کیا تھا۔

"اب میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا خدیجہ...... کبھی بھی نہیں۔" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

ماما کے سامنے خدیجہ کا نام لینے کی دیر تھی کہ وہ طوفان اٹھا کہ میں حیران رہ گیا۔ پاپا کبھی کسی معاملے میں نہیں بولتے تھے لیکن اس معاملے میں وہ بھی بولے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

"تم اب بچے تو نہیں رہے دانیال! تمہاری ماں کا بی پی شوٹ کر گیا ہے۔"

میں ناسمجھی سے پاپا کو دیکھ کر رہ گیا۔

"اس میں ایسی کیا برائی ہے پاپا؟ وہ میری خالہ کی بیٹی ہے۔ شادی کرنا چاہتا ہوں میں اس سے۔"

"خدیجہ تمہاری خالہ کی نہیں تمہاری ماں کے دشمن کی بیٹی ہے۔ خدیجہ کے باپ کی وجہ سے وہ اپنی سگی بہن سے نہیں ملتی۔ اس کی بیٹی کو وہ گھر کی بہو بنا کر کیسے لے آئے ــــ ایک ہی بیٹے ہو تم ہمارے۔ دو تین ہوتے تو شاید وہ کچھ سوچ بھی لیتی۔"

"ماما کو اپنی سوچ بدلنی ہوگی پاپا، پلیز۔ شادی میں صرف خدیجہ سے ہی کروں گا۔ ماما کو منانے کی کوشش کریں۔"

ماما نے مجھ سے بات چیت بند کر دی تھی۔ وہ میری طرف دیکھتی بھی نہیں تھیں۔ ایک دن مجھے شک ہوا کہ وہ شاید خالہ کے گھر گئی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ ضرور خالہ کو اس سلسلے میں منع کرنے جائیں گی۔ خالہ جانتی بھی نہیں تھیں کہ میں ماما سے بات کر چکا ہوں۔ جس وقت میں خالہ کے گھر گیا۔ وہاں جو منظر تھا اس نے میرے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔

خالہ کا رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔ کرسی پر بیٹھی خدیجہ بھی سسک رہی تھی۔ خالو البتہ ماما کے سامنے کھڑے تھے۔

"بچپن سے لے کر اب تک تم میری بے عزتی کرتی آئی ہو سویرا! اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں

عزت کس سے عاری ہوں۔ تم میری بیٹی کی ایسے تذلیل نہیں کر سکتیں۔ میری جان ہے میری بیٹی میں۔''

''تم لوگوں کے پاس عزت کے علاوہ ہے ہی کیا۔ پتا نہیں کس غرور میں رہتے ہو تم۔ جو داؤ مجھ پر نہیں چل سکا، وہ بیٹی کے ذریعے چلوا لیا۔ میرے باپ کا مکان ہتھیا لیا۔ میری بہن سے شادی کر لی۔ تم جیسے کنگال کو بیٹی دیتی کس نے تھی۔ ساری زندگی میرے باپ کے ٹکڑوں پر پلے ہو۔ اب بیٹی کو میرا بیٹا ہتھیانے پر لگا دیا ہے۔ اتنے ہی بھوکے ہو تو بتاؤ کیا قیمت دوں؟ جان چھوڑ دو میرے بیٹے کی۔''

خالو کی آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے لگے۔ ''کچھ تو رشتوں کا لحاظ کرو سویرا! کچھ تو...... اور نہیں تو یہی سوچ لو کہ تایا جی کی روح...... اس سے اچھا ہے مجھے چوک میں کھڑا کر کے جوتیاں مار لو۔'' ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''دوبارہ اگر تمہاری بیٹی نے میرے بیٹے پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تو یہ بھی......''

''خالہ...... بس کر دیں...... میرے باپ کی بے عزتی کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔ چلی جائیں یہاں سے آپ۔''

''اتنی ہی شریف تھیں تو کس حق سے دانیال سے ملتی رہی ہو۔ محبت کی پینگیں بڑھاتی رہی ہو۔''

شرمندگی اور دکھ سے خدیجہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی۔ وہ سسک کر رہ گئی۔

''آپ ہی اپنی ماما کی تسلی کروا دیں دانیال!'' وہ رو ہی دی۔

''ان سے کہیں کہ یہ ہماری ایسے بے عزتی نہ کریں۔ میرے اس گھر میں عزت کے سوا ہے ہی کیا۔ یہ ساری زندگی میرے باپ کو طعنے دیتی رہی ہیں۔ اب یہ سب بند کر دیں۔''

ماما نے چونک کر پیچھے میری طرف دیکھا۔ میں گڑبڑا گیا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جاؤ تم یہاں کی۔'' وہ حقارت سے چلائیں۔

''یہ یہاں سے جواب دیے بغیر نہیں جائیں گے۔ انہیں بتائیں دانیال سچ کیا ہے۔''

ماما کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ میری طرف پلٹیں۔

''اگر تم نے میری عزت نہ رکھی تو یاد رکھنا، میں مر جاؤں گی۔ زہر کھا لوں گی میں۔ اس لڑکی کی اتنی اوقات نہیں ہے کہ اس کے لیے تم اپنی ماں کو ذلیل کرو۔''

خدیجہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ خالو نقاہت سے کرسی پر گر سے گئے تھے۔ خالہ بار بار پلو سے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ وہ شریف لوگ ماما کے ہاتھوں بہت ذلیل ہو چکے تھے۔ میں نے ماما کا ہاتھ پکڑا اور انہیں باہر کی طرف لے جانے لگا۔

''چلیں یہاں سے ماما۔''

''نہیں۔ تم جواب دو۔ اس کے منہ پر جواب دو۔'' ماما نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ میری گرفت سے آزاد کرایا۔ وہ ہاتھ اٹھا کر خدیجہ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ وہ اتنی غصہ میں ______ تھیں جیسے خدیجہ کا قتل ہی کر دیں گی۔

خدیجہ یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ اس پر بھاری گزر رہا تھا۔ اس کی عزت میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کی باحیا، پاکیزہ محبت کی گواہی دے دوں۔

''چلیں ماما پلیز! جیسا آپ کہیں گی میں ویسا ہی کروں گا۔ دوبارہ کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔ لیکن چپ چاپ یہاں سے چلیں۔'' میں نے دھیمی آواز میں ماما سے کہا لیکن خدیجہ نے سن لیا۔ وہ سن ہو گئی۔ ماما نے طنزیہ نظروں سے خدیجہ کو دیکھا۔

''سن لیا تم نے۔ ہو گئی تمہاری تسلی۔'' خدیجہ کو طنزیہ نظروں سے گھور کر ماما نے فخریہ کہا۔ خدیجہ ایک دم میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''تم بے شک پھر کبھی یہاں واپس نہ آنا دانیال! ...... ایک بار اپنی ماما ...... کیا ہے۔''

اس دن مجھے معلوم ہوا تھا کہ مرد بہت بزدل ہوتا ہے۔ وہ جتنے چاہے سچی محبت کے دعوے کر لے، حقیقت میں سارے دعوے ریت کے ڈھیر کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک ٹھوکر لگنے سے بکھر جاتے ہیں۔ میں نے ماما کا بازو پکڑا اور جانے لگا۔

''تم دونوں ماں بیٹا کیا سمجھتے ہو کہ جب جی چاہے گا ہمیں اپنا لو گے۔ جب جی چاہے گا ہمیں دھتکار دو گے۔ کتنی بار یہ میرے ابو کی بے عزتی کر چکی ہیں۔ وہ خاموشی سے سہ جاتے ہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں بھی اپنی محبت کی بے عزتی سہ جاؤں گی۔ نہیں دانی...... میں ہمیشہ یاد رکھوں گی کہ تم نے میری پاکیزہ دوستی کو خاموش رہ کر کتنا رسوا کیا تھا۔'' اس نے جیسے حلق سے آنسو اتارے۔

''اگر میں دوبارہ بھی آپ کے بیٹے کو پلٹ کر دیکھوں تو آ کر میرے منہ پر تھوک جائیے گا۔'' اس نے ماما کی طرف رخ پھیر کر کہا۔

''دوستی توڑ رہی ہوں میں تم سے۔ تم جیسے دوست بدنصیبوں کو بھی نصیب نہ ہوں دانیال صاحب! ابا ٹھیک کہتے تھے، تم بڑے آدمی ہو، تمہیں احترام سے بلانا چاہیے۔ مجھے کبھی تمہیں دانی کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

یہ کہہ کر خدیجہ اندر چلی گئی۔ وہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے چلی گئی تھی۔ میرے لیے دوبارہ اس گھر کے دروازے کبھی نہیں کھلے۔ خالہ نے بعد میں وہ گھر ہی بیچ دیا۔ ماما کے حصے کے پیسوں کا چیک ماما کو بھجوا دیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں چلے گئے۔

میں تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا گیا تھا۔ محبت کی جس چنگاری نے مجھے جلایا تھا وہ ٹھنڈی پڑنے لگی تھی۔ تین سال بعد ماما کی پسند سے میری زوناش سے شادی ہو گئی۔

شادی کے پانچ چھ سال تک میں خدیجہ سے اپنی محبت کو محض ایک بے وقوفی سمجھتا رہا تھا۔ ماما مجھے اور زوناش کو ایک ساتھ ...... پھولے نہیں سماتیں۔ ہم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگتے تھے۔ زوناش ذہین تھی، پڑھی لکھی تھی۔ ہماری اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی تھی۔

میں خدیجہ کو بھول چکا تھا...... لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ مجھے یاد آنے لگی۔ میرا اسٹینڈ دکھنے لگا۔ اس کی صورت میری آنکھوں کے سامنے گھومتی رہتی تھی۔ اس کی آواز، اس کی ہنسی، اس کا رونا، اس کا آخری وقت میں دوستی توڑنا، مجھے دانیال صاحب کہنا، مجھے رہ رہ کر سب یاد آتا تھا۔

جیسے جیسے میری عمر بڑھ رہی تھی، ویسے ویسے وہ دوبارہ سے میرے دل پر قابض ہو رہی تھی۔ ویسے ویسے میرے اور زوناش کے رشتے میں سرد مہری آتی جا رہی تھی۔ ایک دن زوناش نے ماما سے شکایت کی۔

پتا نہیں آپ کا بیٹا ہر وقت کن سوچوں میں گم رہتا ہے۔''

ماما نے فکرمندی سے میری طرف دیکھا۔ وہ بھی میرے چپ چپ رہنے سے خائف رہتی تھیں۔

''کیا بات ہے دانی! کیوں ایسے گم صم رہتے ہو؟''

میں نے ماما کو ایک نظر دیکھا۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ جو محبت میں ماضی میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں، وہ محبت مجھے رات بھر جگائے رکھتی ہے۔ وہی محبت دوبارہ سے میرے دل پر اپنے پنجے گاڑ رہی ہے۔

''جواب دو دانی!'' اچانک انہوں نے مجھے دانیال سے دانی کہنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے ان کے دانی کہنے سے میں چھوٹا بچہ ہی تو بن جاؤں گا۔

میں نے ماما کو دیکھا اور کہہ دیا۔

''جسے ہمیشہ کے لیے گم کر بیٹھا ہوں، اسی میں گم رہتا ہوں ماما۔ جس کی پاکیزہ محبت کی قدر نہیں کی، اس محبت پر ہر روز دو آنسو بہاتا ہوں لیکن آپ کہاں سمجھیں گی۔ اب کوئی بھی کہاں سمجھے گا۔''

☆

عندلیب زہرا

ریحانہ پھپھو آچکی تھیں۔
اس کا اندازہ، ان کی پاٹ دار آواز سے بخوبی ہو رہا تھا۔ میں نے ٹی وی لاؤنج میں جھانکا تو ہماری عزیز از جان پھپھو قیمتی لباس میں ملبوس، سونے کے زیورات پہنے، چہرے پر متفکرانہ تاثرات سجائے وہی باتیں دہرا رہی تھیں جنہیں ہم بچپن سے سنتے چلے آ رہے تھے۔

"سجاد کے کاروبار پر کسی نے بندش کروا دی ہے۔ رزق میں برکت نہیں رہی۔ پیسے آتے ہیں اور یوں اڑ جاتے ہیں کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ کبھی یہ بیماری، کبھی وہ پریشانی۔" آخر میں پھپھو اپنی دکھ بھری زندگی پر آنسو بہانے لگیں۔ جملہ سامعین جو افسوس بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے، اب تسلی اور دلاسوں کا بگھار لگانے لگے۔

"ارے حاسدوں کا حسد کھا گیا میری بچی کو ......" دادی نے کڑک دار آواز میں کہا۔

"سجاد کے کاروبار پر کسی نے جادو کروا رکھا ہے۔" ابا بھی ملول سے بہن کو دیکھ رہے تھے۔

"بیٹھے بیٹھے چیزیں خراب ہو جاتی ہیں۔ برتن ٹوٹ جاتے ہیں۔ سالن باسی ہو جاتا ہے۔" اب پھوپھو کی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"آپا! یہ جوڑا تو بہت قیمتی لگ رہا ہے۔" تائی نے محض توجہ بٹانے کے لیے کہا تھا۔

"یہ جوڑا میں نے زیب تن سے خریدا ہے۔ پورے آٹھ ہزار میں۔" تائی کا وار کارگر رہا اور پھوپھو بھی بہل گئیں۔ ابھی گرمیوں کے ملبوسات پر گفت و شنید جاری تھی کہ چھوٹی چچی کا ٹیپو آئس کریم لے کر بھاگتا ہوا آیا اور ٹھوکر کھا کر آئس کریم سمیت سیدھا پھپھو کی گود میں جا گرا۔

ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔ سفید اور زرد رنگ امتزاج کا خوب صورت سوٹ آئس کریم کے داغوں کے ساتھ بدنما لگنے لگا۔ پھوپھو صدماتی کیفیت میں تھیں اور باقی سب ساکت تھے۔

"یہ ہوتی ہے حاسدوں کی نظر۔" دادی کی آواز نے اس خاموشی کو توڑا۔ گھور کر چھوٹی چچی کو دیکھا اور ایک دھموکا ٹیپو کو دے مارا۔ جملہ سامعین اس تبصرے پر کسمسا کر رہ گئے۔ یہ تو سیدھا سیدھا ذاتیات پر حملہ تھا۔ تائی اور چچی خاموشی سے کمرہ چھوڑ گئیں۔ اب پھپھو کہہ رہی تھیں۔

"میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ اچھا کپڑا خراب ہو جاتا ہے۔ پیسے اڑ جاتے ہیں۔ (ہوا میں ہاتھ اٹھائے)۔ اکثر سالن جل جاتا ہے یا باسی ہو جاتا ہے۔"

"تیری کام والی ماسیوں کی نظر ہو گی یا سسرالیوں کی۔ ارے کون کسی کو خوش دیکھ سکتا ہے۔" دادی کی تقریر جاری تھی۔

"آپا! فری کی خیر خبر؟" امی نے دھیان بٹانے کو پوچھا۔

"اس کی قسمت بھی ماں جیسی ہے۔ اتنی مشکل سے شادی ہوئی۔ اب اولاد کے لیے ترستی ہے۔ امید بندھتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے۔ ساس کے تیور الگ بگڑے رہتے ہیں اور شوہر کے الگ۔" پھوپھو واقعی اداس تھیں۔

"یاد ہے جیا، تم نے فری کی شادی پر کتنی رونق لگائی تھی۔" پھوپھو نے مجھے گفتگو میں شامل کیا (حالانکہ کان میرے پہلے ہی ان کی طرف متوجہ تھے البتہ نظریں موبائل پر تھیں)

"ہاں پھپھو۔ فری آپی کی شادی ہمارے خاندان کی یادگار تقریب تھی۔ کتنے دن فنکشن جاری رہا اور آپ نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا تھا......" میں نے انہیں یاد کروایا۔

"ہاں بچے۔ بس وہی نظر بد کھا گئی میری فری کی خوشیوں کو۔"

"پھر نظر بد۔" میں دانت کچکچا کر رہ گئی تھی۔

"جس پیر فقیر کے پاس جاؤ، وہ یہی کہتا ہے کہ جادو ہوا ہے۔ اولاد پر بندش ہے۔ کتنے وظیفے، کتنے چلّے، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پیسے الگ ضائع۔" پھوپھو جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

"فری کی ساس اولاد نہیں چاہتی۔" دادی نے کامیاب وکیل کی طرح دلیل دی۔ اور پھپھو بے وقوف موکل کی طرح قائل ہو گئیں۔

شام تک پھپھو کی واپسی تھی۔ میں امتحان کے بعد فارغ تھی۔ سو امی ابو کی اجازت سے پھپھو کے ساتھ تیاری پکڑ لی۔

پھوپھو کا عالی شان گھر بے ترتیبی کا شکار تھا۔ داخلی دروازے پر ایک تعویذ جھول رہا تھا۔

"پھوپھو! یہ کیا؟" میں ٹھٹک گئی۔

"ارے یہ تو سسرالیوں کی آمد روکنے کے لیے ہے ہر وقت سر پر چڑھے رہتے تھے۔" پچھلی گلی میں ان کی ساس اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔

پھوپھو نے رازداری سے کہا۔ میں نے بھی سمجھ داری سے سر ہلا دیا۔ شرجیل دیواروں پر پانی چھڑک رہا تھا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے آپی ہونے کا رعب جھاڑا۔

"پیر بابا نے دیا ہے بندش کے اثرات ختم

for more novels and digests

کرنے کے لیے۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔ پلاسٹک کی بوتل میں عجیب میلا سا پانی تھا۔

"باجی ...... میں کام ختم کر چکی ہوں اب جاؤں۔" ارشاد نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ یہ اور بات کہ نظریں ڈسٹ بن پر تھیں۔ جہاں ادھ کھائے توس، مکھن کی آدھی پونی ٹکیاں، برگر اور کچھ پرانے پھل پڑے تھے۔

"ہاں بھئی جاؤ۔" پھوپھو نے بے زاری سے کہا۔

"وہ باجی چھوٹے کی دوا کے لیے کچھ پیسے......" اس کی کھسیائی آواز نکلی اور جواب میں صرف گھوری ملی۔ سو وہ الٹے قدموں چلی گئی۔

"تنخواہ کے علاوہ بھی فالتو پیسے دو۔ اونہہ یہ غریب لوگ بڑے ڈراما باز ہوتے ہیں۔" پھوپھو کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

میں بوجھل دل لیے باہر آ گئی۔ دل چاہ رہا تھا گھر لوٹ جاؤں۔ لیکن یہ بات بھی مناسب نہ تھی۔ اگلے دن ارشاد اپنے بیٹوں کو لیے آ گئی۔ چھوٹے بیٹے کو ٹی وی لاؤنج میں لٹایا اور بڑے کے ساتھ چیزیں سمیٹنے لگی۔

"بارش ہو رہی تھی۔ گھر میں پانی آ جاتا ہے۔ فکر ہی رہتی اس لیے دونوں لڑکوں کو ساتھ لے آئی۔ لڑکیاں چاچے کے گھر بھجوادی ہیں۔" وہ پھوپھو کو بتا رہی تھی۔

ہم سب یعنی فیفی، شرجیل اور گڑیا ناشتہ کرتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ باہر مینہ برس رہا تھا۔ ابلے انڈے، پراٹھے، آملیٹ، بالائی اور گرم گرم چائے۔ پھوپھو سب کی پسند کا خیال رکھتی تھیں۔ اب بھی اصرار سے ایک ایک کی پلیٹ میں چیزیں رکھ رہی تھیں۔

ارشاد کے بیٹوں کو خالی چائے پر ٹرخا دیا۔ اچانک میری نظر ارشاد کے چھوٹے بیٹے پر پڑی، وہ تپتا جسم لیے حسرت سے ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک گڑیا کے ہاتھ سے انڈا گرا اور کسی بال کی طرح لڑھکتا ہوا اس کی طرف چلا گیا۔ اس نے بھی جلدی سے ہاتھ بڑھا کر انڈا اٹھایا اور کھانے لگا۔ گرم گرم ابلا ہوا انڈا۔ جس پر کالی مرچ اور نمک کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ اب خالی چائے اتنی بری نہیں لگ رہی تھی۔ پھوپھو کے تیور الگ بگڑ رہے تھے۔ ارشاد برتن دھو کر آئی تو دیکھا۔ پھوپھو برس رہی تھیں۔

"تمیز نہیں سکھائی۔ بھوکے، ندیدے۔"

بچہ ہاتھ میں ادھ کھایا انڈا تھامے سہم گیا تھا۔ لبوں پر زردی لگی تھی۔ ارشاد لمحوں میں سمجھ گئی۔ ایک دھمو کا بخار میں تپتے بیٹے کو جڑا۔ اور انڈا ہاتھ سے چھین لیا۔

"معاف کردیں جی۔"

پھوپھو نخوت سے اندر چلی گئیں۔ گڑیا آرام سے دوسرا انڈا کھا کر کارٹون دیکھ رہی تھی۔ فیفی اور شرجیل اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ ناشتے کا ادھ کھایا سامان میز پر دھرا تھا۔ پھوپھو ہمیشہ بے حساب پکاتی تھیں۔ اب چاہے ضائع ہو جائے ان کی بلا سے۔ میں نے افسوس بھری نظر ڈالی۔

"پھوپھو! ایک انڈا ہی تو تھا۔" میں چپ نہ رہ سکی۔

"رہنے دو، یونہی یہ لوگ سر چڑھتے ہیں۔" انہوں نے گویا ہاتھ سے مکھی اڑائی، اور پیر بابا کا وظیفہ ہل ہل کر پڑھنے لگیں۔ ہاتھ میں تعویذ پکڑے وہ مسلسل زیر لب کوئی ورد کر رہی تھیں۔ جس پر ہزاروں روپے خرچ کیے تھے۔ میں خاموشی سے لان میں ٹہلنے لگی۔ اجاڑ ویران پودے۔

میلا میلا گرد آلود برآمدہ۔ عجیب سی نحوست محسوس ہوتی تھی۔ بوجھل سی خاموشی اور تنہائی۔ میں وقت گزارنے کے لیے پائپ اٹھا کر پودوں کو پانی دینے لگی۔ پھر میں نے مٹی کے کوزے میں پانی بھرا اور لان کے وسط میں رکھ دیا۔ کچن سے تھوڑے سے کچے چاول اور دال بھی بکھیر دی۔

اپنے گھر میں بچپن سے یہ میرا معمول تھا کہ میں فجر اور عصر کے وقت کوزے میں تازہ پانی بھر کر رکھ دیتی تھی۔ عصر کا وقت تھا۔ دیکھتے دیکھتے چڑیاں آ کر دانہ چگنے لگیں اور پانی پینے لگیں۔

وہ سب مل کر دانہ کھا رہی تھیں۔ کچھ گنگناتیں، چہکتیں، ہنستیں، اپنی کہتیں دوسرے کی سنتیں۔ سب مطمئن لگتی تھیں۔

پھر کوزے کے کنارے پر بیٹھ گئیں۔ گردن جھکا کر پانی پیتیں۔ اور سر اٹھا کر گویا رب کا شکر ادا کرتیں، اڑ جاتیں۔ پھر دوسری فوج آتی اور یہی عمل دہراتی۔ ہر ایک رب کے رزق سے مستفید ہو رہا تھا۔ نہ چھینا جھپٹی، نہ حرص، نہ لالچ......رب کی تقسیم پر راضی برضا۔ یہ حرص، لالچ اور چھینا جھپٹی ہم انسانوں میں ہے اس لیے تو بے کل رہتے ہیں۔

گڑیا اور فیفی بھی میرے ساتھ شوق سے کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے کے اجاڑ، خاموش لان میں اب چڑیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے بادل آ گئے اور بارش کی پھوار برسنے لگی۔ یہ منظر اتنا بھلا لگ رہا تھا کہ دن بھر کی کلفت دور ہو گئی تھی۔

میں کچن میں آ کر سب کے لیے پکوڑے تلنے لگی۔ پھوپھو نے یہ منظر دیکھا تو وہ بھی کرسی لان میں لا کر پکوڑے چٹنی میں ڈبو کر کھانے لگیں۔ صد شکر کہ آج "نظر بد" پر گفتگو بند تھی۔

مجھے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ نظر بد، بندش یا جادو ٹونے سے زیادہ ہمارے اعمال ہوتے ہیں جو ہمیں دلی سکون اور رب کی نعمتوں سے محروم کر دیتے ہیں۔ مالک کل کے آگے بھی کوئی ٹھہر سکا ہے بھلا۔ لیکن یہ احساس میں پھوپھو کو بھی دلانا چاہتی تھی۔ اپنے عمل کے ذریعے۔ نیت صاف تھی۔ سو دل میں اطمینان تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر خود کو نیند کی دیوی کے سپرد کر دیا۔

☆☆☆

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

قیمت-/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے .... -/350 روپے
3 بوتلوں کے لئے .... -/500 روپے
6 بوتلوں کے لئے .... -/1000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

آج سورج ایک نیا دن لے کر طلوع ہوا تھا۔

''پھوپھو...... آج ناشتہ میں بناؤں گی۔ سب کی پسند کا۔'' میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے لاڈ سے کہا۔

''آپی...... حلوہ پوری۔'' شرجیل نے مکا لہرایا۔

''پراٹھا، انڈہ۔'' فیضی نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''فرنچ ٹوسٹ آپی۔'' گڑیا نے لاڈ سے کہا۔

''سالن، پھلکا اور چائے۔ تمہارے انکل بھی یہی لیں گے۔'' پھوپھو سوچتے ہوئے بولیں اور میں سر ہلاتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ جب میں سب کو ناشتہ کروا چکی تو ارشاد بی بی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ آئی۔ چھوٹا بیٹا نہ آیا تھا۔ (غالباً پھوپھو کی ڈانٹ دل پر لے لی تھی)

''باجی...... پہلے صفائی کروں یا کپڑے دھوؤں۔'' اس نے نظریں جھکا کر استفسار کیا۔

''پہلے تم دونوں ناشتہ کر لو پھر کام کرنا۔'' میں نے ٹیبل پر چائے، پراٹھا، انڈا اور حلوہ پوری رکھ دی۔

ارشاد اور وسیم ہچکچا کر پیچھے ہو گئے۔ لیکن میرے چہرے کے نرم تاثرات نے ـــــ اشتہا جگا دی تھی۔ وسیم جلدی جلدی انڈا پراٹھے کے لقمے توڑ کر نگل رہا تھا۔ ارشاد البتہ خاموش تھی۔ تھوڑی دیر بعد گویا ہوئی۔

''باجی...... میں ناشتہ کر کے آئی تھی۔ اپنا حصہ میں گھر لے جاؤں؟'' غالباً اسے اپنا چھوٹا بیٹا یاد آ رہا تھا۔ جسے ابلے انڈے اور حلوہ پوری بہت پسند تھے۔ (نجانے کتنے مہینے ہو گئے تھے کھائے ہوئے) اس نے دن گننے کی کوشش کی۔

''چھوٹے کا حصہ میں نے الگ سے رکھ دیا ہے۔ جاتے ہوئے لے جانا۔'' میں نے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔ اس کی آنکھیں تشکر سے بھیگ گئیں۔ ان میں دعا بھی تھی میرے لیے اور گھر بھر کے رزق کے لیے بھی۔ میں اب مطمئن تھی (آج کوئی سالن خراب نہ ہوگا نہ ہی روٹی جلے گی اور نہ ہی شام تک سالن میں سڑاند پیدا ہوگی)

''جیا...... صبح کے پراٹھے، سالن، انڈے کیا سب ختم ہو گئے؟'' پھوپھو جب کچن میں داخل ہوئیں تو میں دن کا کھانا تیار کر چکی تھی۔ بس روٹیاں پکانی تھیں۔ ارشاد اپنا کام مکمل کر کے جا چکی تھی۔

''جی پھوپھو! جو بچ گئے تھے وہ میں نے ارشاد کو دے دیے۔'' میں نے سلاد تیار کرتے ہوئے کہا۔ پھوپھو کی آنکھوں میں حیرت اور پھر قدرے ناگواری در آئی تھی۔

''دیکھیں ناں! برتن بھی خالی اور صاف ہیں اور فریج بھی صاف ستھرا لگ رہا ہے۔'' میں نے فریج کا دروازہ کھولا۔

ڈونگوں، ڈبوں میں کب کے رکھے سالن غائب تھے۔ فریج ہلکا پھلکا اور صاف ستھرا تھا۔

میں نے سلاد اور رائتہ اندر رکھ دیا۔ کھانا زبردست تھا۔ چکن کڑاہی، سادہ چاول، سلاد، رائتہ سو پھوپھو نے کچھ نہ کہا۔

''آپی کے ہاتھ میں ذائقہ ہے۔'' فیضی نے چہک کر کہا۔

''اب آپ فروٹ ٹرائفل کھاؤ۔'' میں نے ڈونگا وسط میں رکھ دیا۔

''یاہو، سرپرائز......'' سب نے تالیاں بجائیں۔ پھوپھو بھی مزے لے کر کھانے لگیں۔

''شرجیل...... یہ سالن اور میٹھا اپنی دادی کو دے آؤ۔'' میں نے ایک پیالے میں میٹھا اور ایک میں سالن رکھ کر شرجیل سے کہا۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے پھوپھو کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے خفگی تھی۔

تاہم وہ خاموش رہیں۔ میں نے ان کی نیم رضامندی بھانپ کر شرجیل کو ٹرے تھما دی۔ وہ آدھے گھنٹے بعد آیا تو چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

''مما...... دادی بہت خوش ہوئیں۔ ہم سب کو دعائیں دینے لگیں۔ تایا نے جیا آپی کے لیے پانچ سو بھجوائے ہیں۔ امی آپی کو کال کر......

اسی وقت فری آپی کی کال آ گئی۔ پانچ برس بعد ڈاکٹرز نے خوشی کی خبر سنائی تھی۔ پھوپھو اسی وقت سجدۂ شکر بجا لائیں۔

''دادی کی دعاؤں کا کرشمہ ہے۔'' شرجیل نے کہا۔ (سیانے بچے)

شام کو انکل آئے تو وہ بھی بہت خوش ہوئے۔

میں اب روز کوکنگ کرتی اور کھانے کی ایک پلیٹ کبھی آس پڑوس، کبھی دادی جان، کبھی فقیر، ضرورت مند کو بھجوا دیتی۔ ہفتہ میں ایک دن مسجد میں کھانا بھجواتی۔ پھوپھو اعتراض کرتیں تو مجھ سے پہلے فیضی اور شرجیل کہتے۔

''اچھا ہے ناں مما، سب کو پتا چلے آپی کے ہاتھ میں کتنا ذائقہ ہے۔''

ارشاد کو ناشتے میں حصہ دیتی۔ گھر میں اب سکون تھا۔ کام سکون سے بروقت ہوتے۔ کوئی چیز ضائع نہ ہوتی۔ شرجیل کی مدد سے تعویذ اتار کر پانی میں بہا دیا تھا۔ میلے پانی کی بوتل پھینک دی۔ اس کی جگہ فریج کی صاف پانی کی بوتل رکھ دی۔ (پھوپھو کی تسلی کے لیے) فجر کے وقت ہم کزنز لان میں چہل قدمی کرتے چڑیوں کو دانہ چگتے دیکھتے۔

''ہم آپ کو بہت مس کریں گے آپی۔'' تینوں منہ لٹکا کر کہتے۔ آنے والے دنوں میں پھوپھا کو ایک آرڈر مل گیا جو ان کے کاروبار کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ ہم سب کو ڈنر کروانے کے لیے لے گئے۔ تاہم پھوپھو خاموش سی تھیں۔ مجھے لگا وہ مجھ سے خفا ہیں۔

''پھوپھو!'' میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' میں نے آہستہ سے استفسار کیا۔

''نہیں بیٹا۔'' انہوں نے میرا ہاتھ پیار سے سہلایا۔

واپسی پر شرجیل اور فیضی اپنی اپنی شاپنگ کر رہے تھے۔ تھیلے بھرتے جا رہے تھے۔ مجھے بھی انکل نے شاپنگ کروائی۔ اگلے روز میری واپسی تھی۔

''بچوں کی پسند کی مٹھائی، پھل اور اسنیکس خرید لیتے ہیں۔'' انکل بیوی کا موڈ خوشگوار دیکھ کر مزید چیزیں خریدنے لگے۔ مال سے باہر نکلتے وقت مٹھائی اور پھل کے تھیلے میں نے تھام رکھے تھے۔ اسی وقت پیچھے سے دھکا لگا۔ اور تھیلے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑے۔

''ہائے ہائے نظر لگ گئی۔'' پھوپھو نے روایتی جملہ بولا۔

وہ دو فقیر بچے تھے جو آپس میں الجھ رہے تھے۔ انکل نے آگے بڑھ کر تھپڑ مارنا چاہا۔ میں نے ہاتھ روک دیا۔ انکل نے مجھے دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کو اور تھم گئے۔

''اب یہ تھیلا تم رکھ لو۔'' میں نے تھیلا ان کو دے دیا۔

ڈبہ چھلک چکا تھا۔ اور پھل آپس میں گلے مل رہے تھے، انہوں نے شوق سے تھیلا پکڑ لیا۔ چھوٹا مٹھائی نکال کر کھانے لگا تو قدرے بڑے لڑکے نے اس کا ہاتھ روک دیا۔

''وے نکے! اماں، ابا کو پہلے دیں گے۔ یاد نہیں اماں کہتی ہیں مل بانٹ کے کھانے سے رزق بڑھتا ہے اور بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ اکیلے کھانے سے بری نظر لگتی ہے۔ اور بندہ بیمار ہو جاتا ہے۔''

دونوں چند منٹوں کی لڑائی بھلائے شیر و شکر ہو کر واپس جا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے، آپس میں مگن، گفتگو کرتے، سر ہلاتے۔ دونوں نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔

پھوپھو اور انکل نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جو بات میں کئی دنوں سے سمجھانا چاہ رہی تھی وہ ایک چھوٹے سے واقعہ نے واضح کر دی تھی۔

''چلیں سجاد! اماں سے بھی مل لیتے ہیں۔'' پھوپھو نے آہستگی سے کہا۔

انکل نے مزید مٹھائی، پھل اور اسنیکس خریدے اور گاڑی کا رخ بڑے بھائی کے گھر کی طرف موڑ دیا۔

واپسی کا سفر ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ میں نے سوچا اور کھڑکی کے باہر نظاروں سے لطف اندوز ہونے لگی۔

فرح بھٹو

کرنی دے ڈھو

مکمل ناول

ٹاک شو میں گرما گرم بحث جاری تھی۔ تین بڑی سیاسی پارٹیوں کے اہم ارکان بات بات پر ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ جبکہ ایک پارٹی کی رکن نہایت تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے مناسب وقت پر کچھ بول لیتی تھی۔ میر داد کی نظر اسی پر ٹکی تھی۔ وہ جو اس شو کا اینکر اور انتہائی ہوشیار صحافی تھا۔ ارادی طور پر بار بار اس خوبصورت اور پروقار خاتون کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

بحث اپنے عروج پر پہنچی تھی جب میر داد کے کان میں لگے آلے سے پروڈیوسر کی تنبیہ گونجی کہ فوراً سے پیشتر ایک لمبا وقفہ لیا جائے۔ تاکہ ماحول کا تناؤ کم کیا جاسکے۔ میر داد یہ سن کر مستعد ہوا اور مختلف بولیاں بولتے سیاستدانوں کو ہاتھ اٹھا کر مزید بحث سے روکا۔

”پلیز جہانداد صاحب۔ رشدی صاحب۔ یہاں ہمیں کمرشل بریک لینا ہے۔“

اسے کافی مشقت جھیلنی پڑی ان کو خاموش کروانے میں۔ پھر بھی وہ کافی دیر بعد خاموش ہوئے۔

”ناظرین یہاں لیتے ہیں ہم ایک وقفہ۔ وقفے کے بعد پھر سے حاضر ہوتے ہیں۔“ کیمرہ مین نے میر داد کو فوکس کیا اور میر داد نے پیشہ ورانہ انداز میں یہ جملے کہہ کر سکون کا سانس لیا۔ کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے سے نالاں سیاسی کارکنان اپنی اپنی کرسیوں پر آرام دہ انداز میں بیٹھ گئے۔ لیکن میر داد جانتا تھا کہ وہ اپنی پارٹی کو سپورٹ کرنے کے لیے دل میں مناسب جملے ترتیب دے رہے ہیں، اسی کے ساتھ اپنی حریف پارٹی پر کیچڑ اچھالنے کے لیے جو مواد موبائل میں بھر لائے ہیں اس کو بھی دہرانے میں مگن ہیں۔

وقفے کے دوران میر داد اور ان چاروں مہمانوں کو چائے اور اسنیکس پیش کیے گئے۔ وہ ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگا کر کچھ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اب بھی اس کی نظروں کا ارتکاز اسی صبیح چہرے پر تھا جو کالی سندھی کڑھائی والی چادر کے ہالے میں دمک رہا تھا۔ کھڑے تیکھے نقوش۔ سرخی مائل گلابی رنگ۔ اور سرمئی کشادہ آنکھیں۔ بلاشبہ وہ سیاست کے میدان کی خوبصورت ترین کھلاڑی تھی۔

میر داد کے انہماک میں اتنا اثر تو تھا کہ سیل فون سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے پر مجبور ہوئی۔ میر داد بھرپور انداز میں مسکرایا۔ وہ جواباً لب دبا کر دیکھتی رہی۔ ایک دلکش چونتیس سالہ عورت جو سیاست کی ہاٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کے لیے میر داد کی توجہ ایک معمولی بات تھی مگر اس میں غیر معمولی وہ دو بھنورا

سی آنکھیں تھیں جن کی چمک اتنے فاصلے سے بھی تحرامہ کے وجود پر حملہ کر رہی تھیں۔ اور ٹاک شو کے اختتام تک وہ ان خیرہ کرتی نگاہوں سے اچھا خاصا ڈسٹرب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''اف خدا! ایسا شان دار بنگلہ تو میں نے بس خوابوں میں ہی دیکھا تھا۔'' رطابہ سٹنگ روم کے بیچ و بیچ گول گول گھوم کر جیسے خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔

''تمہارے خواب ایسے حسین کب سے ہو گئے۔ بچپن سے لے کر آج تک تو تم خوابوں میں جھاڑو کی ڈائن اور بل بتوڑی کو ہی دیکھتی آ رہی ہو۔'' ٹیپو نے بڑا سا کارٹن لا کر زمین پر رکھا۔ اور خود تھوڑا سستانے صوفہ پر بیٹھ گیا۔

''بل بتوڑی آتی ہوگی تمہارے خواب میں۔ میرے خوابوں کا معیار ابھی اتنا نیچے نہیں گیا۔'' رطابہ فوراً چڑ گئی تو ٹیپو ہنسنے لگا۔

''یاد نہیں بچپن میں عینک والا جن دیکھ کر تمہاری راتوں کی نیند کیسے اڑ جاتی تھی۔'' وہ اپنی پینٹ جھاڑتے مزید بولا۔

''لو خواہ مخواہ۔ اب فضول مت بولو۔ اور اس گھر کو دیکھو کتنا خوبصورت ہے۔ اور یہ چیزیں کتنی قیمتی ہیں۔'' رطابہ اب فرنیچر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

''جتنا بھی خوبصورت ہے لیکن پرایا ہے۔ اور پرائی چیز پر رال نہیں ٹپکاتے۔'' ٹیپو اس بار سنجیدگی سے بولا تھا۔

''رال کون ٹپکا رہا ہے میں تو تعریف کر رہی ہوں۔'' رطابہ خفا لہجے میں بولی۔

''جو بھی ہے ہم اس بنگلے کے مالک نہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھو۔'' ٹیپو بڑے پن سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں ذرا امی کو دیکھ لوں کدھر ہیں۔''

''اونہوں۔ ہم مالک نہیں تو کیا ہوا۔ جب تک ہم یہاں ہیں یہ گھر ہمارا ہے۔'' ٹیپو کے جاتے ہی وہ گلاس وال کی طرف بڑھی جس کی دوسری طرف کشادہ گارڈن اپنی چھب دکھلا رہا تھا۔

☆☆☆

''ہیلو مس تحرامہ۔'' بھاری آواز پر وہ چونکی۔ سامنے ہی میر داد اپنی پرشوق نظریں اس پر جمائے کھڑا تھا۔ بلیک پینٹ کوٹ میں ملبوس اپنے دراز قد اور وجیہہ سراپے کے ساتھ وہ سوفٹ ڈرنک ہاتھ میں تھامے پوری طرح تحرامہ کی طرف متوجہ تھا۔

''ہیلو مسٹر میر داد۔'' تحرامہ نے تکلف سے کہا۔

''کیسی ہیں۔'' وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

''الحمدللہ۔ اچھی ہوں۔'' وہ اس دلکش مسکراہٹ سے نظریں چرا کر بولی۔

''وہ تو نظر آ ہی رہا ہے۔'' میر داد کی ذو معنی بات پر تحرامہ بھی مسکرائی۔ ''یہ کلر آپ پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔ نہ پہنا کریں۔ ہم جیسوں کی نظر لگ جائے گی۔'' وہ ایک دم بے تکلفی سے بولا۔ تحرامہ نے اسے گھورا۔

''آپ مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مسٹر۔'' تحرامہ نے اکھڑے لہجے میں کہا تو میر داد نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

''حسن کو خراج پیش کرنا میری عادت ہے۔ باخدا آپ سے فلرٹ کا کوئی ارادہ نہیں۔'' اس کی بات پر تحرامہ خاموش رہی۔

''ہمارے پروگرام کو پھر کب رونق بخش رہی ہیں۔''

میر داد نے موضوع بدل کر پوچھا۔

''جب وقت ملے گا۔ فی الحال تو مصروف ہوں۔''

تحرامہ نے ادائے بے نیازی سے کہا۔

''متوقع الیکشن میں کامیابی کے لیے آپ کو ایڈوانس مبارک باد۔'' وہ گلاس والا ہاتھ اوپر کرتے ہوئے بولا تو تحرامہ مسکرا دی۔

''تھینکس۔۔ لیکن آپ کو الیکشن کا انتظار کرنا چاہیے۔'' اس کی بات پر میر داد نے قہقہہ لگایا۔ ''فتح یاب لوگوں کو مقابلوں سے کیا لینا دینا۔ آپ کے والد محترم ہمیشہ اسی حلقے سے جیتتے ہیں۔ اور رہی آپ کی بات تو آپ کی ایم این اے کی سیٹ بھی پکی ہے۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا تو تحرامہ کی لمبی گردن کی اونچائی کچھ اور بڑھ گئی۔

''لوگ کرسیوں کے حصول کے لیے بے تاب رہتے ہیں اور کرسیاں آپ جیسوں کو بٹھانے کی منتظر رہتی ہیں۔'' میر داد نے مزید کہا۔

''پھر بھی ہر بات وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔'' تحرامہ نے اس کی بات سے محظوظ ہوتے متانت سے کہا۔

''وقت تو آپ جیسوں کا غلام ہے میڈم۔'' میر داد کی بات پر تحرامہ نے ایک جانچتی نظر اس پر ڈالی۔

''آپ کی باتوں کو چاپلوسی سمجھوں یا تجزیہ۔''

''یہی تو مسئلہ ہے۔۔ ہم پروفیشنل صحافیوں کے ساتھ۔ لوگ ہماری نیت کے حوالے سے ہمیشہ مشکوک رہتے ہیں۔ ارے بھئی پروفیشن سے ہٹ کر کیا ہم کسی سے محبت سے بات نہیں کر سکتے۔ کسی کو ذاتی طور پر پسند نہیں کر سکتے؟''

وہ تحرامہ کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پھوٹتی مخصوص چمک تحرامہ کو بے چین کر گئی۔ کیا تھا ان آنکھوں میں۔ کیوں دل ایک بیٹ مس کر دیتا تھا۔ وہ اپنے آپ میں الجھ کر میر داد کو دیکھے گئی جو ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ ''ویسے اپنی پسند کا اظہار کرنے میں آپ بھی آزاد ہیں۔ اس وقت غالباً آپ میری تعریف کرنا چاہتی ہیں۔ پلیز۔۔۔۔ میں منتظر ہوں۔'' میر داد، تحرامہ کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا تو وہ چونک کر نظریں چرا گئی۔

ہوٹل کا کشادہ ہال اس وقت سیاست دانوں اور بیورو کریٹس سے بھرا ہوا تھا۔ تحرامہ کو اپنی پوزیشن آکورڈ محسوس ہوئی۔

ایکسکیوز می۔'' وہ میر داد کے سامنے سے ہٹ کر دوسری طرف آ گئی۔ پھر عجیب سی شرمندگی نے آ گھیرا کہ یہ تہذیب کے خلاف ہے۔ آگے پہنچ کر دیکھا۔ میر داد اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ خفت زدہ ہو گئی۔ پھر پارٹی کے اختتام تک وہ دانستہ میر داد سے دور دور رہی۔

☆☆☆

''اوہ۔ اماں یہ کیا۔۔ اتنے عالی شان گھر میں ڈنر کا یہ مینیو۔'' رطابہ نے دسترخوان پر ملکہ مسور کی دال اور روٹی دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔

''اس عالی شاہ گھر کی مالکن نہیں ہو تم۔ جو تمہارے آگے انواع کے اقسام کے کھانے پیش ہوں۔ ہم غریب لوگ جہاں جائیں گے یہی کھائیں گے۔ اب شرافت سے کھاؤ جو اللہ نے دیا ہے۔'' اماں نے گھرکا تو رطابہ نے ٹیپو کو دیکھا جو مزے سے کھانا کھا رہا تھا۔ رطابہ کو رشک آیا۔ وہ اپنے حال میں مگن رہنے والا تھا۔ دال سبزی یا چٹنی روٹی جو ملتا شکر کر کے کھا لیتا تھا۔

''کاش کہیں سے من و سلویٰ اتر آتا۔ جس طرح رہنے کو اچھا گھر مل گیا۔ اچھا کھانا بھی مل جاتا۔'' وہ آہ بھر کر بولی تو اماں نے گھور کر دیکھا۔

''بھوکی نہیں مر رہی ہو۔ اچھا خاصا کھانے کو ملتا ہے لیکن تم ہمیشہ کی ناشکری ہو۔ اور اس بنگلے میں ہمارا کتنا قیام ہے اللہ جانے۔۔ ناہید باجی نے اس کی اچھی قیمت لگ جانے تک ہمیں یہاں بٹھایا ہے کوئی وراثت نہیں دے دی اس کی۔۔ اپنی حیثیت یاد رکھو اور اپنے جامے میں رہو۔'' انہوں نے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی تو رطابہ سر جھکا کر کھانا کھانے لگی۔

''ہمارے نصیب میں تھا بھی تو ہم یہاں رہنے آئے۔ اور کیا پتا ان کو ان کی مرضی کی قیمت کبھی نہ ملے اور ہم ہمیشہ کے لیے یہاں رہ جائیں۔ اس نے بھائی کے کان میں سرگوشی کی تو ٹیپو اس کی بات پر مسکرا

https://www.caretofun.net

دیا۔

’’بہت بے وقوف ہو رطابہ۔‘‘ ٹیپو نے اس کے سر پر ہلکے سے چپت ماری۔

☆☆☆

’’تحرامہ بی بی کھانا لے آؤں۔‘‘ وہ صوفہ پر ٹیک لگائے آنکھیں موندے لیٹی تھی کہ رحیمہ کی آواز سنائی دی۔

’’نہیں رحیمہ رہنے دو۔۔شام میں ہلکا پھلکا کھا لیا تھا۔‘‘ وہ سستی سے بولی۔

’’بی بی۔آپ بہت لاپرواہ ہو گئی ہو۔اپنی صحت کا کچھ خیال نہیں کرتیں۔‘‘ خاندانی ملازمہ تھی اس لیے بے تکلف بھی تھی۔

’’کیا کروں اپنا خیال رکھ کر۔‘‘ تحرامہ نے آنکھیں کھول کر سستی سے انگڑائی لی۔

’’یہ بھی ہے۔زندگی میں کوئی بدلاؤ نہ ہو تو انسان یہی سوچتا ہے۔‘‘ رحیمہ اپنی سمجھ کے مطابق سر ہلانے لگی۔تحرامہ نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔۔پھر چینل سرچ کرنے لگی۔۔ایک چینل پر انگوٹھا خود بہ خود رک گیا۔میر داد اپنی بے مثال مردانہ وجاہت کے ساتھ اسکرین پر موجود تھا۔رات نو بجے کا ٹاک شو "لائیو ود میر داد" آن ایر تھا۔اور وہ اپنی چمکتی آنکھوں اور بارعب لب و لہجہ کے ساتھ پروگرام کر رہا تھا۔

ساٹھ انچ کے ٹی وی کے آگے بیٹھی تحرامہ نے اسے اپنے ساتھ بیٹھا خیال کیا۔۔اس کی چمک دار مسکراتی آنکھیں اپنے وجود پر جمی محسوس ہوئیں۔۔اپنی کیفیت سے گھبرا کر تحرامہ نے جھٹ ٹی وی بند کر دیا۔اور ریموٹ دور اچھال کر پھر سے صوفہ پر ڈھے سی گئی۔

☆☆☆

وہ صبح صبح جاگنگ کے لیے بنگلے سے باہر قریبی پارک میں نکل آیا۔یہ ایک پوش علاقہ تھا۔اسی لیے عام علاقوں کی بہ نسبت صفائی اور ہریالی بھی بہت زیادہ تھی۔ٹیپو کو رہ رہ کر اپنے علاقے کا گندا سا میدان یاد آنے لگا جہاں جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر تھے اور وہ گندگی سے بچتا بچاتا وہاں دوڑیں لگاتا تھا۔تازہ ہوا میں سانس لیتے وہ بہت دیر تک اپنے گزرے کل کے متعلق سوچتا رہا۔جس میں کسمپرسی اور بیوہ ماں کی جدوجہد کے سوا کوئی یاد ذہن میں روشن نہ تھی۔

بابا کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کی محدود پینشن اور اپنی سلائی کے ہنر سے ان دونوں بہن بھائی کو پالنے اور پڑھانے کے مشکل مرحلے انہوں نے نہ جانے کیسے طے کیے تھے۔آج بھی ان کو سکون کا سانس نصیب نہ ہوا تھا۔

’’میں جلد ہی اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر ان کی پریشانیاں بانٹ لوں گا۔‘‘ ٹیپو نے تیز تیز واک کرتے خود سے کیے گئے عہد کو دہرایا۔ایک گھنٹہ واک اور ایکسرسائز کر کے وہ پارک سے نکل کر اپنے عارضی ٹھکانے کی طرف چلا آیا۔

’’کتنا عالی شان بنگلہ ہے۔مگر ہمارا تو نہیں۔رطابہ بھی بالکل بے وقوف ہے۔۔پرائی چیز پر فدا ہو رہی ہے۔‘‘ وہ بنگلے کے سامنے سر اٹھا کر کھڑا دل میں سوچنے لگا۔اس لین کے سارے ہی بنگلے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ٹیپو نے برابر والے بنگلے کو دیکھا جو سفید ماربل کا بنا ہوا وائٹ ہاؤس نظر آتا تھا۔گلیزڈ گلاس والز سے اندر کا کافی حصہ واضح تھا۔اچانک دوسری منزل پر بنی کھڑکی سے ایک نسوانی وجود دکھائی دیا۔تو ٹیپو ایک لمحے کو ساکت رہ گیا۔گلابی رنگ کی ریشمی نائٹی میں ملبوس شہابی رنگت اور ملکوتی حسن والی وہ نوعمر لڑکی ہرگز نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں تھی۔ایک تو خوبصورتی اور اس پر مستزاد اس کا لباس۔ٹیپو کا نوجوان دل دھڑک اٹھا۔اس نے آج تک اتنا کھلا حسن براہ راست نہیں دیکھا تھا۔

اس لڑکی نے اپنے بال پونی سے آزاد کر کے سر کو دائیں بائیں ہلایا اور ایک بھرپور انگڑائی لی۔۔ٹیپو کے ہوش اڑنے لگے۔۔اس کی نظر بھی ٹیپو پر پڑی تھی۔ وہ ایک ادا سے مسکرائی۔۔۔جیسے روشنی پھوٹی۔۔جیسے صبح مسکرائی۔۔ٹیپو سحر زدہ مثال سوچتا رہا۔اتنے میں سفید گیٹ وا ہوا اور ایک پراڈو کار اندر سے تیزی سے نکلی۔ٹیپو ہڑبڑا کر ایک طرف ہوا۔ کار کچھ ہی فاصلے سے ریورس ہو کر پھر گیٹ تک آئی۔پچھلی سیٹ کا کالا شیشہ نیچے ہوا۔ایک بارعب شخص کار کی کھڑکی سے ٹیپو کو گھورنے لگا۔ٹیپو خائف سا ہوا۔

’’کیا مسئلہ ہے بابا۔‘‘ وہ شخص بھاری آواز میں مخاطب ہوا۔ٹیپو نے نفی میں سر ہلایا۔۔اس شخص نے سر کھڑکی سے نکال کر اوپر دیکھا جہاں سے وہ حسینہ اب غائب ہو چکی تھی۔’’ہمارے بنگلے کے سامنے نظریں نیچی رکھا کرو۔۔سمجھے۔‘‘ اس شخص نے اسی لہجے میں کہہ کر ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا اشارہ کیا۔کار زن سے مٹی اڑاتی آگے بڑھ گئی۔اور ٹیپو ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

’’منعم کی دوبئی میں شادی ہے۔۔۔میں تو ادھر مصروف ہوں تم چلی جاؤ۔‘‘ بابا نے سنہری کارڈ تحرامہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’مجھے بھی کہاں فرصت ہے۔‘‘ تحرامہ نے بے دلی سے کارڈ کھول کر دیکھا۔

’’میں دیکھ رہا ہوں۔دن بہ دن تم آدم بیزار ہوتی جا رہی ہو۔کون سا ڈپریشن پال لیا ہے۔بحران کی پیدا کردہ ڈسٹربنس ابھی تک سر پر سوار ہے۔‘‘

وہ بغور تحرامہ کو دیکھتے بولے تو اس نے طنزیہ مسکرا کر سر جھٹکا۔

’’نہیں بابا۔۔آپ فکر مند نہ ہوں۔وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سر پر سوار کروں۔‘‘

’’اسی لیے کہہ رہا ہوں دوبئی گھوم آؤ۔فریش ہو جاؤ گی۔یہاں سیاست کے گورکھ دھندے میں نمٹا رہا ہوں نا۔‘‘ وہ رسان سے بولے تو تحرامہ انہیں دیکھنے لگی۔وقت کے ساتھ ان کا لہجہ اور رویہ بہت نرم ہو گیا تھا۔لیکن یہ وقت بہت دیر میں آیا تھا۔

’’اوکے۔‘‘ تحرامہ نے جیسے ہتھیار پھینکے۔ بابا مسکرا دیے۔

☆☆☆

ٹیپو روز صبح چہل قدمی کے لیے آتے جاتے اب دزدیدہ نظروں سے سفید بنگلے کی اس کھڑکی کو دیکھ لیتا تھا۔‘‘ جہاں وہ بہت خوبصورت لڑکی روز سویرے اسے دکھائی دیتی تھی۔۔غالباً نیند سے اٹھتے ہی کھڑکی کے پردے ہٹا کر کھلی ہوا میں سانس لینا اس کی عادت تھی۔اور اب ٹیپو کو اسے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔نجانے کیا کشش تھی اس میں، وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔بہرحال یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی لڑکی اس کی توجہ کھینچنے میں کامیاب رہی ورنہ وہ بہت مست ملنگ اور اپنے آپ میں گم رہنے والا تھا۔

اس کا سب سے بڑا خواب اپنی ماں کو ہر طرح کا سکھ دینا تھا۔اور دوسرا خواب آرمی جوائن کرنا تھا۔یہ دونوں خواب وہ کھلی آنکھوں سے دیکھا کرتا تھا۔اگلے ماہ فوج کی ملازمت کے لیے ٹیسٹ دینے تھے، سو ٹیپو پوری طرح تیاری میں مگن تھا۔ایسے نازک موقع پر یہ خوبصورت بلا ٹیپو کا ذہن بٹانے اور اس کے خیالات پر براجمان ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔وہ جتنا ذہن سے اس کو جھٹکتا وہ اتنا حاوی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

دبئی کا کراؤن ہال اس وقت بقعہ نور بنا ہوا تھا۔سیاہ اور کریم رنگوں کے سنگم سے کی گئی ڈیکوریشن آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔مردوں کے بے فکر قہقہوں اور نسوانی ہنسی کی آواز جا بجا چکراتی پھر رہی تھی۔تحرامہ بالکل پیچھے رکھی میز کے قریب پڑی ایک کرسی پر بیٹھی ہال کی رونق کو دیکھ رہی تھی۔اس کو تقریبات میں شامل ہونا بالکل پسند نہ تھا پھر بھی اسے اسی

محفلوں میں آنا پڑتا۔ وہ وقت گزاری کے لیے اپنے موبائل پر جھک گئی۔

"ہیلو۔" کی آواز اسے بری طرح چونکا گئی۔ نظریں بے اختیار اٹھیں اور پھر جیسے سیراب ہوگئیں۔

"کیسی ہیں آپ مس تحرامہ۔" میرداد بے تکلفی سے اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"فائن۔" آپ یہاں کیسے؟ تحرامہ نے تعجب سے پوچھا۔

"کبھی آپ بھی ہمارا حال احوال پوچھ لیا کیجیے۔"

میرداد نے شکوہ کیا تو تحرامہ کچھ شرمندہ ہوئی۔

"کیسے ہیں آپ؟"

"بہت ہینڈسم۔" وہ برجستہ بولا تو تحرامہ مسکرا دی۔

"آپ کی نظریں مجھ پر سے ہٹتی نہیں تو میں ہینڈسم ہی ہوا نا۔" میرداد نے تھوڑا جھک کر گمبھیر لہجے میں کہا۔ تحرامہ کی مسکراہٹ ایک دم سمٹی تھی۔

"خوش فہمی ہے آپ کی۔" اس کا لہجہ کمزور تھا۔ میرداد محظوظ ہو کر مسکرایا۔

"اگر خوش فہمی زندگی کے پرخار راستوں میں بہترین زاد راہ بن جائے تو خوش فہم رہنے میں کیا ہرج ہے۔ کیا آپ مجھے یہ خوش فہمی ادھار دے سکتی ہیں، کچھ اس دل کو قرار آجائے گا۔" وہ اپنی ساحر نگاہوں سے تحرامہ کو دیکھ رہا تھا۔ تحرامہ کو لگ رہا تھا کہ اب فرار ممکن نہیں۔ وہ ہار رہی تھی اپنے دل سے۔۔ جو اس ساحر کا اسیر ہوا جاتا تھا۔

"آپ چاہتے کیا ہیں۔" تحرامہ کی سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"آپ کا ساتھ۔" میرداد فوراً بولا۔ تحرامہ کا دل دھڑک اٹھا۔

"کیوں؟" بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ "میرا دل چاہتا ہے بس۔" میرداد بے بس نظر آیا۔

"پلیز تحرامہ۔۔ آئی لائیک یو سوچ۔۔۔ وہ ملتجی لہجے میں مخاطب تھا۔ تحرامہ خاموش رہی۔

"اوہ تحرامہ۔ یہاں چھپی بیٹھی ہو۔ کم آن! منعم کو برائیڈل ڈریس میں دیکھو، بالکل حور لگ رہی ہے۔" مہناز آنٹی ان کی میز پر آئیں تو میرداد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آتی ہوں۔" تحرامہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"میں جواب کا منتظر ہوں۔" میرداد کھڑا ہوگیا پھر مہناز کی توجہ دوسری طرف دیکھ کر میز پر سجے خوبصورت ـــ موتیا کے کئی پھول نکال کر تحرامہ کی طرف بڑھائے۔ تحرامہ نے ایک پل کو کچھ سوچا اور پھول لے لیے۔ میرداد کھل اٹھا۔ "تھینکس۔ اب میں چلتا ہوں۔" میرداد نے اپنا وزیٹنگ کارڈ میز پر رکھ دیا۔ اور دوسری جانب مڑ گیا۔ تحرامہ نے کارڈ اٹھا کر پرس میں رکھا اور اسٹیج کی طرف چلی آئی۔

☆☆☆

موبائل کی بپ بجی تھی۔ تحرامہ نے ہاتھ ـــ بڑھا کر فون اٹھایا اور مندی مندی آنکھیں کھول کر نمبر دیکھا۔ اجنبی نمبر رات کے ایک بجے اسکرین پر روشن تھا۔ تحرامہ نے کچھ دیر سوچا پھر کال اٹینڈ کرلی۔ "سو رہی تھیں ڈیئر۔" ہجر ان کی آواز ابھری تو تحرامہ کا حلق کڑوا ہوگیا۔ "میں سوؤں یا جاگوں تمہیں کیا۔ اور رات کے اس وقت مجھے تنگ کرنے کا مقصد۔"

"مقصد ہاہا۔ تمہاری نظر میں تو میں ہوں ہی خودغرض۔ تو ظاہر ہے کسی مقصد کے تحت فون کروں گا۔"

لیکن مجھے بس یہ دیکھنا ہے کہ مجھ سے علیحدہ ہو کر تمہیں گہری نیند آتی بھی ہے یا نہیں۔" ہجر ان نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ "الگ وہ ہوتا ہے جو ساتھ رہا ہو۔۔ اور تم میری زندگی میں کبھی شامل نہیں رہے۔ ایک کچا تعلق تھا جو ٹوٹ گیا۔" تحرامہ درشتی سے بولی۔

"ارے غصہ کیوں ہوتی ہو ڈیئر۔۔ کچا تعلق تھا یہ تو ماننی ہونا کچا ہی سہی۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔ "خیر میں نے سوچا دبئی کی سیریں شیریں ہو رہی ہیں تو ہم سے بھی مل لو۔ ہم بھی یہیں ہیں سرکار۔" اس نے دل داری سے کہا تو تحرامہ سلگ کر رہ گئی۔

"میں فضول لوگوں سے ملنا تو کیا بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اور اب میں فون بند کر رہی ہوں۔۔ دوبارہ کال ملائی تو اچھا نہیں ہوگا۔" اس نے انتہائی غصے سے کال کاٹی اور اٹھ کر بیٹھ گئی پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی دکھتی کنپٹیوں کو دبایا۔ سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔ اس سے اس کا شدت سے دل چاہنے لگا کہ کسی مہربان کندھے پر سر رکھ کر اپنا درد آنسوؤں کے ساتھ بہا دے۔ تحرامہ نے موبائل اٹھالیا اور بے اختیار ایک نمبر دبایا۔ کال جا رہی تھی۔۔ وہ جیسے ہوش میں آئی۔

"یہ میں کیا کر رہی ہوں۔" خود کو گھرکا۔۔ اور کال کاٹنے لگی کہ فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو۔" میرداد کی بھاری آواز گونجی تو تحرامہ کا دل دھڑک اٹھا۔ "کون بات کر رہا ہے۔" وہ نیند سے مخمور لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"میں تحرامہ۔" تحرامہ نے آہستہ سے کہا۔

"تحرامہ آپ اس وقت۔۔ مطلب خیریت تو ہے نا۔" وہ پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ "کک کچھ نہیں ایسے ہی جاگ رہی تھی تو۔" تحرامہ سے جواب نہ بن پڑا۔

"ہمم۔" میرداد نے پرسکون سانس خارج کی۔

"اپنی بے خواب رات میں آپ نے مجھے یاد کیا۔ میری خوش قسمتی ہے۔" وہ خوش دلی سے بولا تو تحرامہ خاموش رہی۔ "اب کچھ بولیں بھی۔ یا مجھے کال کرنے کی غلطی پر پچھتا رہی ہیں۔" اس کے لہجے سے مایوسی جھلکی۔

"نہیں تو۔" تحرامہ بے اختیار بول اٹھی۔

"گڈ۔"

وہ ایک دم خوش ہوگیا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
[illegible]	شازیہ چوہدری	250/-
ہم سفر	فرحت اشتیاق	400/-
بن روئے آنسو	فرحت اشتیاق	250/-
[illegible] جان سے	فرحت اشتیاق	500/-
دل دادہ	فرح بخاری	350/-
ہستی کا آہنگ	فرح بخاری	300/-
وہ جھلی سی دیوانی سی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
آرزو گھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	200/-
لاحاصل	عمیرہ احمد	180/-
امربیل	عمیرہ احمد	450/-
اک دیا جلائے رکھنا	[illegible]	300/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	[illegible]	120/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	[illegible]	300/-
موسم تھا بے قرار	فریدہ اشفاق	300/-
دل اسے ڈھونڈتا ہے	آسیہ رزاقی	300/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
[illegible]	زہرہ ممتاز	180/-
[illegible]	فائزہ افتخار	180/-
میری جنت	[illegible]	250/-
بھنور	[illegible]	150/-
اے وقت گواہی دے	راحت جبیں	350/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	300/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	افشاں آفریدی	400/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	400/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	300/-
میرے خواب لوٹا دو	نگہت عبداللہ	400/-

ناول منگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ -/30 روپے
منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32216361

پوری کرلیں شب بخیر۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"اب نیند کہاں پوری ہوگی آپ کی آواز جو سن لی ہے۔" میرداد نے آہ بھر کر کہا۔ "خیر کل اگر آپ اجازت دیں تو بندہ آپ کے ساتھ کچھ وقت بتانا چاہتا ہے۔"

اس کی فرمائش پر تحرامہ سوچ میں پڑ گئی۔ "اوکے" اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"جسٹ گریٹ۔ تو پھر کراون ہوٹل میں شام پانچ بجے آپ مجھے اپنا منتظر پائیں گی۔" وہ چہکا تو تحرامہ مسکرا دی۔

"ان شاء اللہ۔ اللہ حافظ۔" وہ خوش دلی سے بولی تھی۔ پھر کال کاٹ کر بستر پر لیٹتے ہوئے ایک الوہی مسکراہٹ اس کے ساتھ رہی۔

☆☆☆

وہ میز پر آمنے سامنے بیٹھے جیسے آنکھوں کی زبان میں ہی دل کی باتیں کر رہے تھے۔ تحرامہ نے بلیک ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جس میں اس کا سراپا غضب ڈھا رہا تھا۔ سرمئی شال کندھے کے ایک طرف ڈالے وہ بہت پروقار دکھائی دے رہی تھی۔ سنجیدہ مگر پرسوز حسن۔۔ میرداد نے بھی اتفاقاً بلیک ڈریس شرٹ کے ساتھ سرمئی پینٹ پہن رکھی تھی اور اب اس حسن اتفاق پر زیر لب مسکرا رہا تھا۔

"تیری قربت میں بیٹھے تو مجھے
زندگی سانس کیسے لیتی ہے"

میرداد نے شعر پڑھا۔

تحرامہ مسکرا دی۔ "آپ بہت کم گو ہیں تحرامہ۔" اس نے چند منٹ کی خاموشی کے بعد جیسے شکوہ کیا۔

"اور آپ بہت باتونی ہیں۔ نا صرف زبان سے بلکہ اپنی آنکھوں سے بھی گفتگو کرتے ہیں۔" تحرامہ نے اس کی مسلسل خود پر مرکوز نگاہوں پر چوٹ کی۔ "ہاہا۔ میرداد نے ایک قہقہہ لگایا۔"

جہاں زبان سے کام نہ چلتا ہو وہاں آنکھوں سے عرضی دیتا ہوں۔" وہ کہنی میز پر رکھ کر آگے جھک آیا تھا۔ "لفظوں کے کھلاڑی ہیں اینکر صاحب!" تحرامہ شوخ ہوئی۔

"لفظوں سے ہی رزق کماتا ہوں یہ کیسے۔ لیکن اس وقت آپ کی توجہ کا طالب ہوں اسی لیے زبان کے ساتھ آنکھیں بھی التجا کر رہی ہیں۔" میرداد نے بے بس سی شکل بنائی۔

"کس قسم کی توجہ۔" تحرامہ الجھن کا شکار ہوئی۔

"میرے دل ناچیز کو آپ کی توجہ کی فوری ضرورت ہے جو آپ کی ہمراہی کی خواہش میں ہمک رہا ہے۔" میرداد نے واضح الفاظ میں کہا تو تحرامہ کا دل دھڑکا۔

"یہ اچھی خواہش تو نہیں۔" وہ لب دبا کر مسکرائی تھی۔

"آہ۔۔ میں خوب جانتا ہوں مگر یہ نادان مانتا نہیں۔ سینے سے نکال کر آپ کو دے دیتا ہوں اسے اچھے سے سمجھایئے۔" میرداد نے ٹھنڈی سانس بھر کر دایاں ہاتھ دل پر رکھ دیا تو وہ سرخ ہوگئی۔

"رکھیے اپنے پاس اور خود ہی سمجھایئے۔"

"سمجھنے والا ہوتا تو کب کا سمجھ چکا ہوتا۔" میرداد نے گہری سانس لے کر کہا۔ "خیر آپ کا قیام کب تک ہے یہاں۔" وہ بات بدل کر بولا تو تحرامہ بھی سکون سے بیٹھی۔

"ہمم۔۔ جب تک ادھر رہنے کا موڈ ہوگا۔ ویسے آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔" اس نے مبہم جواب دے کر پوچھا۔

"چند پروگرامز کی ریکارڈنگ کرنے کو ٹھہرا ہوا ہوں۔ آپ اگر چاہیں تو آپ کی واپسی تک ٹھہر سکتا ہوں۔" میرداد نے اپنی جگمگاتی آنکھیں تحرامہ پر ٹکا دیں۔

"میں تو سال بھر کے لیے دوبئی میں ہوں۔" تحرامہ نے شریر مسکراہٹ سے کہا۔ "اچھا۔ تو میں بھی سال بھر کے لیے یہیں ہوں۔" میرداد نے فوراً فیصلہ لیا۔

"میں عمر بھر کے لیے یہاں ہوں۔" تحرامہ نے مزید شرارت کی۔

"تو میں بھی بوریا بستر سمیٹ کر یہاں آجاتا ہوں۔" میرداد بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ تحرامہ اسے دیکھنے لگی۔ جیسے جانچ رہی ہو۔

"میرے الفاظ کو شک کی نگاہ سے مت دیکھیں تحرامہ۔ آئی رئیلی لو یو۔" میرداد نے میز پر رکھا تحرامہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تو تحرامہ پگھل کر رہ گئی۔ اور یہی وقت تھا جب اس کے دل کی بنجر زمین پر میرداد کی محبت پھوار بن کر برسی۔

"ایکسکیوزمی سر۔" اتنے میں ویٹر آیا تو تحرامہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ پھر خوش گوار ماحول میں میرداد کے ساتھ کھانا کھاتے تحرامہ کل رات والی ٹینشن بالکل بھلا چکی تھی۔ واپسی پر میرداد نے اسے ایک خوبصورت گھڑی گفٹ کی جو تحرامہ نے کچھ پس و پیش کے بعد رکھ لی تھی۔

☆☆☆

ٹیپو نے فوج میں بھرتی کے لیے سب ٹیسٹ پاس کر لیے تھے۔ یہ خبر نہیں تھی۔ یہ ایک بہت بڑی خوش خبری تھی۔ جس نے ٹیپو کے ساتھ اس کی بیوہ ماں اور بہن رطابہ کو بے انتہا خوشی بخشی تھی۔ ان کی آنکھوں میں بسا خواب مجسم ہو کر ان کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ خوش کیوں نہ ہوتیں، ٹیپو کی تو کیفیت ہی نرالی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر خوشی کے مارے ہاتھ میں وہ کاغذ پکڑے بیٹھا رہا جس میں اسے تمام امتحانات پاس کرنے کا مژدہ بھیجا گیا تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب پورا ہو گیا تھا۔ اور لبوں پر ہر دم رہنے والی سب سے بڑی دعا قبول ہوئی تھی۔ وہ خوش کیوں نہ ہوتا۔

اب اس کے حالات سدھرنے والے تھے اس کی بیوہ ماں کی پریشانیاں ختم ہونے والی تھیں۔ اس کی کمر جو رات بھر سلائی کرنے سے دہری ہوئی جاتی تھی اب سکون پانے والی تھی۔

تحرامہ اور میرداد کی یہ حسین ملاقات اگلی کئی ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ان دنوں دبئی تحرامہ کے لیے جنت بن گیا تھا۔ وہ ناشتہ کر کے ہوٹل سے نکل جاتی اور میرداد کے ساتھ سارا دن گزار دیتی۔ اس کی ہم راہی میں لمحے خوشبو بکھیرتے گزرتے تھے تو اس کی گفتگو تتلیوں کی طرح تحرامہ کے گرد چکرایا کرتی۔ وہ آنکھوں سے حال دل کہتا اور تحرامہ دل سے سنا کرتی۔ زندگی کی نامہربانیاں کہیں پس پشت چلی گئی تھیں۔ برسوں بعد وہ کھل کر سانس لینا سیکھ رہی تھی۔ اس نے میرداد کو اپنی ساری محرومیوں کا ازالہ سمجھ لیا تھا۔ وہ تھا بھی تو کسی نجات دہندہ جیسا۔ نرم خو۔۔ محبت سے لبریز اور جان چھڑکنے والا۔

تحرامہ کے دل کے وہ زخم جن کو مرہم نصیب نہ تھا، اب جیسے شافع علاج پا گئے تھے۔۔۔ وہ روایتی جاگیردار اور سیاسی گھرانے سے وابستہ تھی جہاں بالخصوص عورت کے لیے حرص اور سنگ دلی کا عجب ہی ملاپ دیکھنے میں آیا ہے۔ چاہے دولت ہو یا عزت۔۔۔ عورت کو ہی ان پر قربانی کی آری سے کاٹا جاتا ہے۔ بڑی تین بہنیں اسی روایت کی بھینٹ چڑھی تھیں۔ خود سے دوگنی عمر کے مردوں کی تیسری چوتھی بیوی بن کر ایک عجیب زندگی گزار رہی تھیں۔

وسیع و عریض زمینداری اور روپے پیسے کو اپنے ہی خاندان تک محدود رکھنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ بے جوڑ شادیاں کر کے جان چھڑالی جاتی تھی۔۔ بہترین اسکول کالجز میں پڑھنے والی لڑکیوں کو ان کی زندگی کے اہم موقع پر گونگا بہرا بنا کر ان چاہے مرد کو سونپ دیا جاتا۔ لیکن تحرامہ ان روایتوں سے باغی نکلی۔ وہ اپنی تینوں بہنوں سے بالکل الگ مزاج کی تھی۔ چھوٹی اور بہت من موہنی صورت کی بنا پر وہ بابا کی کچھ لاڈلی رہی۔ اسی لاڈ نے اس کے من مانی کرنے والے مزاج کو تقویت دی۔۔۔ مگر زندگی کی راہ میں ایسے موڑ آئے کہ اس کا مزاج بدل گیا۔

باغی لڑکی سر اٹھا رہی تھی۔ اس کی ہمراہی کی خواہش اس کو ہر نفع نقصان سے بے نیاز کر رہی تھی۔

☆☆☆

فوج کی ٹریننگ پر جا رہا تھا اور اماں اور رطابہ کے ساتھ اس کھڑکی والی حسینہ کی یاد کو بھی اپنے سامان کے ساتھ باندھ کر اپنے ساتھ لیے جا رہا تھا۔۔ جس سے ٹیپو کو عجیب سی انسیت پیدا ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ ٹیپو کی وارفتہ نگاہی سے غافل نہیں تھی پھر بھی ادائے بے نیازی سے اسے نظر انداز کرتی تھی۔ جیسے اسے اپنے بے پناہ حسن کی کشش کا اندازہ تھا۔ ٹیپو اسے بڑی سی کار میں کالج آتے جاتے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا لیکن اس کے علاوہ وہ کہیں نہیں نکلتی تھی۔ ٹیپو کے دل میں یہ حسرت ہی رہی کہ کبھی وہ اسے نظر بھر کر دیکھ لے۔ اور اب تو یہ حسرت شدت پکڑتی جا رہی تھی۔ وہ بہت دنوں کے لیے اس شہر سے دور جا رہا تھا۔ اس حسینہ کے دیدار سے محروم ہونے جا رہا تھا جس کو دیکھ کر اس کی صبح سہانی ہو جاتی تھی۔ یہ احساس ہی ٹیپو کے لیے سوہانِ روح تھا کہ اب وہ ہر روز اسے دکھائی نہیں دے گی۔ وہ یہ سوچتا تو سینے میں دم اٹکتا محسوس ہوتا۔ نوعمری کی پہلی پہلی شدید کشش کو وہ اپنی پہلی محبت سمجھ بیٹھا تھا۔ وہ کسی طرح اس ظالم حسینہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ بس ایک بار، صرف ایک بار وہ اسے اپنے دور جانے کے متعلق آگاہ کرنا چاہتا تھا۔۔۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ ٹیپو کے لیے تو وقتی طور پر ہی سہی اس کا نہ دیکھنا ایک قیامت تھا۔ وہ شدید بے چینی کا شکار تھا۔ جوں جوں ٹریننگ پر جانے کی تاریخ نزدیک آتی جا رہی تھی۔ اس کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بولایا بولایا پھرتا اس بات سے بے خبر یہ خواہش اسے خون کے آنسو رلانے والی تھی۔

☆☆☆

تجھ میں ہے چاند سی کشش سائیں
میں سمندر کی بے قراری ہوں

پاؤں دھرتی خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ آج وہ میرداد کے ساتھ ساحل پر آئی تھی۔۔۔ اور عرصہ بعد بہت عام سے حلیہ میں گھر سے باہر نکلی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر شرٹ پہنے وہ بالوں کو پونی اسٹائل میں باندھے اپنی عمر سے کئی برس چھوٹی اور حسین نظر آ رہی تھی۔ میرداد اس لباس میں بھی اس کو سراہ رہا تھا۔ حالانکہ اطراف میں آزاد حسن بکھرا پڑا تھا۔ لیکن میرداد کی نظریں صرف تحرامہ کا طواف کر رہی تھیں۔

"تم نہیں جانتیں تحرامہ۔۔۔ میں تمہارا اسیر ہو گیا ہوں۔۔۔ یوں لگتا ہے تمہاری محبت میرے دل میں برسوں سے پنپ رہی ہے۔" میرداد نے تحرامہ کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ان چند دنوں میں وہ میرداد کے بہت نزدیک آ گئی تھی۔

"شاید تم مجھ سے اتنا پیار نہیں کرتیں۔ میرے وجود کا ادھورا پن تمہیں نہ جھنجھتا ہو گا۔" میرداد نے مایوس لہجے میں کہا تو تحرامہ تڑپ اٹھی۔

"میں بھی تو اندر سے ادھوری ہوں میر۔ تم مجھے اپنا رہے ہو۔ میں تم سے مکمل ہو رہی ہوں اور تم مجھ سے مکمل ہو جاتا۔" تحرامہ کی بات پر میرداد کی آنکھوں کے جگنو چمک اٹھے۔ اس نے تحرامہ کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔

تم سوچ بھی نہیں سکتیں تمہارے الفاظ نے مجھے کس قدر خوشی بخشی ہے تحرامہ۔ جیسے ساتوں آسمان مجھ پر مہربان ہو گئے ہیں۔" وہ بے انتہا خوش نظر آ رہا تھا۔ تحرامہ نازسے مسکرا دی۔ اس کی تڑپتی سسکتی آرزوؤں کو کنارا مل گیا تھا۔

☆☆☆

وہ جاگنگ سے واپسی پر خاصا پرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ آج اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اس حسینہ کو اپنی طرف متوجہ ضرور کرے گا۔ خوش نصیبی سے وہ کھڑکی میں ہی کھڑی تھی مگر کچھ پریشان اور ہراساں سی۔ وہ کمر کے بل جھکی کچھ تلاش کر رہی تھی۔ ٹیپو آگے بڑھ آیا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔ اس کے اور ٹیپو کے درمیان باؤنڈری وال کا فاصلہ تھا اور پانچ فٹ اونچی کھڑکی تھی۔ "ایکسکیوز می۔" ٹیپو نے آواز لگائی تو وہ ایک دم سیدھی ہوئی۔ اس کے ریشمی براؤن بال جھٹکے سے لہرائے اور شہابی چہرہ چاند کی طرح چمکنے لگا۔ ٹیپو تو اس خیرہ کرتے حسن میں کھو سا گیا۔ اچانک باؤنڈری وال سے ایک لڑکا باہر کودا اور ناک کی سیدھ میں دوڑنے لگا۔ ٹیپو نے چونک کر اس بھاگتے لڑکے کی پیٹھ دیکھی۔ اندر بنگلے میں ایک دم شور بلند ہوا اور گیٹ پورا کھل گیا۔ اس لڑکی نے ہراساں ہو کر کھڑکی بند کی۔ گیٹ سے اسی دن والا بارعب شخص ہاتھ میں پسٹل اٹھائے سخت غصے میں برآمد ہوا۔ اور ٹیپو کی طرف جارحانہ انداز سے بڑھا۔ "بے حیا لڑکے میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" اس کے ارادے انتہائی خطرناک لگ رہے تھے جیسے ٹیپو کو جان سے مارنا چاہتا ہو۔ ٹیپو خوفزدہ ہو کر اپنے گھر کی طرف پلٹا۔

"او دھر رک بے غیرت۔" پیچھے سے وہ شخص غرایا اور ایک فائر کی آواز کے ساتھ گرم سنسناتی گولی ٹیپو کے بائیں کندھے کے نیچے بازو پر آ لگی اور وہ تڑپ کر زمین پر گر گیا۔ "امی۔" تکلیف میں بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

سائیں یہ لڑکا وہ نہیں۔۔۔ ہمارے بنگلے میں دوسرا لڑکا گھسا تھا۔" ایک ملازم نے بنگلے سے باہر آ کر مالک کو بتایا۔

"کیا مطلب؟" مالک چیخا۔

"وہ دوسرا لڑکا تھا جی۔۔۔ نیلی شرٹ اور کالی پینٹ والا۔"

"تو حرام خور! میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو ڈھونڈو اسے۔" مالک غصے سے پاگل ہو گیا۔۔۔ کچھ ملازم سر پٹ دوڑے۔ "اس لڑکے کی ہمت کیسے ہوئی ہمارے بنگلے میں گھسنے کی۔" وہ شخص کف اڑا رہا تھا۔۔۔ پھر غضیلی سرخ نظروں سے اوپر کھڑکی کو دیکھا اور کچھ سوچ کر اندر بڑھ گیا۔ ٹیپو نے شدید درد سے اس کو اندر جاتے دیکھا اس میں اٹھ کر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔۔۔ اس کے بازو سے خون بہے جا رہا تھا۔ صبح سویرے کا وقت تھا۔۔۔ آس پڑوس میں اگر لوگ دیکھ بھی رہے تھے تو اس کے قریب آ کر اس کی مدد کرنے کی جرأت شاید نہیں رکھتے تھے۔

☆☆☆

اماں ناشتہ بنا کر ٹیپو کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں جس نے جاگنگ سے واپس آنے میں کافی دیر کر دی تھی۔

"اماں ناشتہ دیں جلدی۔" رطابہ کالج کے لیے تیار کھڑی تھی۔

"ٹیپو نے بہت دیر لگا دی۔" وہ فکرمندی سے بولی تھیں۔ "کچھ دیر پہلے گولیاں بھی چل رہی تھیں۔ شہر کے حالات خراب لگ رہے ہیں تم بھی آج کالج مت جاؤ۔" انہوں نے نوالہ منہ میں ڈالتی رطابہ کو کہا۔

"اماں! ہم اب پرانے محلے میں نہیں رہتے جہاں شہر کے حالات کا گولیاں چلنے سے پتا چلتا تھا۔ یہ پوش علاقہ ہے۔" "سارے شہر میں ہنگامے ہو رہے ہوں تب بھی ادھر پتا نہیں لگتا۔ رطابہ نے لاپروائی سے ناشتہ ختم کیا۔

"اوکے اماں! میں تو چلتی ہوں۔" "اللہ کی امان میں۔۔۔" اماں اس کے پیچھے آئیں۔ "اف فو اماں گیٹ پر انٹرلاک لگا ہوا ہے میں خود سے دروازہ بند کر کے بھی جا سکتی ہوں آپ روز خواہ مخواہ پیچھے آتی ہیں۔" رطابہ نے جھنجلا کر کہا۔

"میری تسلی اسی طرح ہوتی ہے۔ اور یہ انٹرول لاک یا جو بھی ہے میری دعا تجھ تک نہیں پہنچا سکتا جو میں جاتے وقت دیتی ہوں۔"

اماں نے گیٹ سے آدھی باہر کھڑی رطابہ پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی۔

"ارے یہ کون زخمی پڑا ہے۔" رطابہ ایک دم چونک کر باہر نکلی۔۔۔ اماں بھی باہر نکل آئیں۔۔۔ ٹیپو کا مخصوص جاگنگ سوٹ دیکھ کر دونوں کے دل پر ہاتھ

پڑا تھا۔ رطابہ نے تیزی سے پیچھے جھک کر اسے سیدھا کیا تھا۔ پھر چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔

”ٹیپو! میرے بھائی۔“

”ارے میرا بچہ۔۔۔ یہ کیا ہوگیا۔۔ یا اللہ۔“ اماں نے صدمہ سے سینے پر ہاتھ مارا۔ ٹیپو کی آنکھیں بند اور سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ رطابہ اس کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر رونے لگی۔

”یہ کیسے ہوا؟“ کس نے تمہیں گولی ماری؟“ وہ ہراساں سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پریشان نظروں سے بڑے بڑے بنگلوں کے باہر کھڑے ملازمین کی طرف دیکھا جو دور کھڑے بے حسی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

”ارے کوئی سواری کرواؤ میرے بچے کو اسپتال پہنچانا ہے۔“ اماں نے روتے ہوئے ٹیپو کے بازو سے بہتے لہو کو اپنی چادر سے روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ”بھیا ہمیں ہاسپٹل جانا ہے۔ پلیز ہماری مدد کر دو۔“ اس علاقے میں رکشہ ٹیکسی ملنا آسان نہیں تھا سو رطابہ فوری طور پر ایک بنگلے کے ڈرائیور کے پاس دوڑی جو بے نیازی سے کار کو صاف کر رہا تھا۔

”ایمبولینس کو فون کرواتا خون ہمارے صاحب کی کار کو خراب کر دے گا۔“ اس کا جواب رطابہ کو ساکت کر گیا۔

”اتنی سنگ دلی۔ خدا پوچھے گا تم سے تو۔“ اس نے بیگ سے سیل نکال کر نمبر ملایا۔ پھر ایمبولینس سے اسپتال پہنچنے تک وہ دونوں رو رو کر اللہ سے ٹیپو کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہیں۔

☆☆☆

اسپتال میں بھی کافی مشکل سے ٹیپو کو طبی امداد ملی۔۔۔ کئی سوال تھے جن میں سے ایک کا جواب بھی دونوں ماں بیٹی کے پاس نہ تھا۔۔۔ ڈاکٹرز نے گولی بازو سے نکال لی تھی مگر خون بہت ضائع ہو گیا تھا۔۔۔ خوش نصیبی سے رطابہ کا خون بھائی سے میچ کر گیا۔ سو ایک بوتل خون اس نے دیا۔ اس کا بس چلتا تو جسم کا سارا لہو اپنے پیارے بھائی کو دے دیتی۔ ٹیپو کافی دیر بعد پوری طرح ہوش میں آیا۔۔۔ اس کی رنگت چند گھنٹوں میں پیلی پھٹک ہو گئی تھی۔ اماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رو پڑیں۔

”یہ کیسے ہوا۔۔۔ کس نے تمہیں گولی۔“ ان کی بات بیچ میں ہی رہ گئی تھی جب دو تین مضبوط جسے کے آدمی ان کے سر پر آن کھڑے ہوئے۔ ایک ٹیپو پر جھک گیا۔۔ اور کان میں بولنے لگا۔ ٹیپو کی رنگت متغیر ہو گئی۔ پھر وہ تینوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ اور ایک پولیس والا بیان لینے آ پہنچا۔

”آپ پر کس نے فائر کیا۔ کیا معاملہ تھا۔“ اس کے پوچھنے پر ٹیپو کچھ دیر خاموش رہا۔ ”میں جاگنگ سے واپس آ رہا تھا تو نجانے کس نے پیچھے سے گولی ماردی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”آپ نے نہیں دیکھا کس نے فائر کیا اور کیوں؟“

”نہیں۔“ ٹیپو نے یک لفظی جواب دیا۔

”آپ کی کسی سے کوئی دشمنی، کسی پر کوئی شک۔“ وہ مزید پوچھنے لگا۔

”نہیں۔“ ٹیپو نے نحیف آواز میں انکار کیا۔

”اوکے۔“ پولیس والا بیان لے کر چلا گیا۔

”یہ لوگ کون تھے ٹیپو۔“ اماں نے پوچھا تو ٹیپو نے اپنی سرخ آنکھیں چھت پر جمادیں۔ رطابہ ایک طرف کھڑی فکر مند نظروں سے بھائی کو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

بات تھی یا قیامت اس کا سانس رک گیا تھا اور وہ ہونقوں کی طرح ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔

”کیا کہا آپ نے!“ اسے لگا اس کی سماعتوں نے غلط سنا ہے۔

”آپ کے بھائی کا بازو ناکارہ ہو چکا ہے سو ہمیں اس کا بازو کاٹنا ہوگا۔“

ڈاکٹر نے دوبارہ سادہ الفاظ میں دہرایا تو رطابہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے کئی قطرے بہہ نکلے۔

”نہیں ڈاکٹر اس کا سلیکشن ہو گیا ہے آرمی میں۔۔۔ بس دو چار دنوں میں ٹریننگ پر جانا ہے۔۔۔ اور آرمی جوائن کرنا اس کا خواب ہے۔۔۔ آپ اس کے بازو کے ساتھ اس کا خواب کاٹ دینا چاہتے ہیں۔۔۔ نہیں پلیز ایسا ظلم مت کیجیے۔“ رطابہ نے سسک کر ڈاکٹر کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”میری بہن! بہت ضروری ہے۔ آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ ڈاکٹر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”میری ماں جیتے جی مر جائے گی۔۔۔ جوان بیٹے کو اپاہج نہیں دیکھ پائے گی۔“ رطابہ روانی سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ بڑبڑائی۔ ”اور آپریشن کے پیسے؟“ ایک اور سوال اس کے لبوں پر آیا۔

”ہاسپٹل کے سب چارجز پے ہوتے رہیں گے۔ جب تک میں یہاں ایڈمٹ ہوں۔“ رطابہ کے ذہن میں ٹیپو کی بات گونجی۔ ٹیپو نے اسے اپنے ساتھ ہونے والی واردات کہہ سنائی تھی۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ اس دن جو آدمی آئے تھے اسے دھمکانے آئے تھے۔ کہ وہ اپنی زبان بند رکھے ورنہ۔ اس ورنہ سے آگے ٹیپو نے بہت بے بس نظروں سے رطابہ کو دیکھا تھا۔ رطابہ کے اصرار پر بھی اس نے اس دھمکی کے متعلق بتا کر نہ دیا۔۔۔ وہ سوچتے ہوئے ٹیپو کے پاس چلی آئی اس کو یہ روح فرساں خبر سنانی تھی۔

☆☆☆

”تم کافی بہت اچھی بناتی ہو۔“ میر داد نے مگ ہونٹوں سے ہٹا کر تعریف کی۔

”تھینکس۔۔۔ میں کافی ہی نہیں کافی کچھ اچھا بنا لیتی ہوں۔“ تحرامہ مسکرائی۔

”اس میں کوئی شک۔ اچھے بھلے صحافی کو دیوانہ بنا لیا اپنا۔“ میر داد نے گمبیر لہجے میں کہا تو تحرامہ جھینپ گئی۔

”تحرامہ مجھ سے نکاح کرلو ابھی اسی وقت۔“ اچانک میر داد نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میر داد۔“ تحرامہ متحیر زدہ رہ گئی۔

”پلیز ڈیئر! اب تمہارے بنا رہا نہیں جائے گا۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔“ یکا یک وہ مایوس نظر آیا۔

”نہ نہیں میر داد۔۔۔ میں بھی تمہاری ہمراہی چاہتی ہوں۔۔۔ مگر اتنی جلدی۔۔۔ پاکستان چل کر بابا کو منا تو لینے دو۔“ وہ تذبذب کا شکار تھی۔

”وہ اسی صورت مانیں گے تحرامہ۔ جب تم ان سے کہو گی کہ تم نے اپنی مرضی سے نکاح کر لیا ہے۔ لامحالہ ان کو رخصتی کرنی ہی پڑے گی۔ ورنہ شاید وہ کبھی راضی نہ ہوں۔“ میر داد کی بات تحرامہ کے دل کو لگی۔ ”ویسے تم اب خود مختار ہو تمہیں اپنی زندگی کے فیصلے لینے میں کوئی جھجک تو نہیں ہونی چاہیے۔“ تحرامہ کی خاموشی پر وہ کچھ خفا ہوا۔

”نہیں میر داد! وہ میرے بابا ہیں۔ ان کی رضامندی ضروری ہے۔ خیر تم جو چاہتے ہو وہ کرو۔۔۔ میں راضی ہوں۔“ تحرامہ ہلکی آواز میں کہہ کر میر داد کو دیکھنے لگی۔ جس کے انگ انگ میں خوشی کا سمندر موجزن ہو گیا تھا۔ ”اوہ۔ میری جان بہت شکریہ۔ تمہارے مثبت جواب نے مجھے آسمان پر کھڑا کر دیا ہے۔“ وہ جیسے جھوم اٹھا تھا۔ تحرامہ کھل کر مسکرا دی کہ دلی تمنا تو اس کی بھی یہی تھی۔

☆☆☆

نکاح میں میر داد کے کچھ قریبی دوست اور ان کی فیملیز نے شرکت کی۔۔۔ اپنے تئیں یہ ایک خفیہ نکاح تھا اور تحرامہ نے میر داد کو بہت رد و کد کے بعد ان چند فیملیز کی اس میں موجودگی کی آمادگی دی تھی۔۔۔ دل میں سو خدشے اور ہزار خوشیاں لیے وہ میر داد کے نام ہو گئی۔۔۔ زندگی کے ایک بالکل ناقابل یقین کام کو انجام دے دیا گیا تھا۔

میر داد بے حد خوش تھا تو تحرامہ کی خوشی بھی تولی نہ جا سکتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ہمراہی میں جیسے بادلوں پر چل رہے تھے۔۔۔ شب زفاف میر داد نے محبت کے ڈھیروں پھول تحرامہ پر اس طرح

http://www.coretofun.net

پچھاور کیے کہ وہ اس کی اسیر ہو کر رہ گئی۔

"کیا اب بھی کوئی شک و شبہ رہ گیا میری خوش نصیبی پر۔" اگلی صبح وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر سوچ رہی تھی اور فاصلے پر کھڑی خوش قسمتی اس کی بات پر مسکرائی تھی۔

☆☆☆

ٹیپو کی زندگی ویرانیوں کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ اس کا سب سے بڑا خواب چکنا چور ہو کر اس کی آنکھوں میں کھب گیا تھا آمنہ بیگم کی حالت بہت خراب تھی، جوان بیٹا یوں مفلوج ہو جائے گا یہ کس نے سوچا تھا۔۔۔ وہ مایوسی کی عمیق گہرائی میں جا اتری تھیں۔

"پورا مہینہ اتنا تکلیف دہ گزرا تھا کہ ان کی بوڑھی کے تمام ماہ و سال پر بھاری تھا۔۔۔ ڈاکٹروں نے نقلی بازو لگوانے کا کہا تھا اور شاہ صاحب اس کا خرچہ اٹھانے کو تیار تھے مگر ٹیپو فی الحال راضی نہیں تھا۔۔۔ وہ تو لگتا تھا ہواؤں سے بھی روٹھا ہوا ہو۔ بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔۔۔ سارا دن اندھیرا کیے کمرے میں پڑا رہتا۔۔۔ رہ رہ کر اپنی کم مائیگی اور بے بسی پر رونا آتا۔

شاہ صاحب نے دولت اور طاقت کے بل پر سب کچھ اپنے حق میں کر لیا تھا۔ وہ مجرم ہوتے ہوئے بھی ہر طرح سے باعزت بری تھے۔۔۔ ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا یوں وہ جب چاہتے دوسروں کی زندگی کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتے۔۔۔ وہ سوچتا اور اس کا خون کھول اٹھتا۔ اور وہ آنکھیں میچ کر مٹھی بند کر کے خود سے ایک عہد دہراتا۔۔۔ شاہ صاحب کو برباد کرنے کا عہد۔۔۔ ان کا جینا حرام کر دینے کا عہد۔

☆☆☆

"تم میری اولین محبت ہو تحرامہ۔" میرداد نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "اولین محبت۔۔۔ بتاؤ مت تمہارے اتنے برسوں کے کیریئر میں کوئی لڑکی تمہاری چاہت تو نہیں بنی ہو گی۔" تحرامہ نے اٹھلا کر کہا۔

"ہم۔۔۔ کیریئر بنانے سے بہت پہلے ٹوٹے خوابوں کے ساتھ تمہارے تصور نے آنکھوں میں جگہ بنالی تھی۔" وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا تحرامہ نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"وہ کیسے۔۔۔ کیا ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔" اس کے سوال پر وہ مبہم سا مسکرایا۔ "ہاں میں بارہا مل چکا ہوں تم سے۔۔۔ سپنوں کی حسین وادی میں۔" اس کے جواب پر تحرامہ نے اس کے سینے پر مکا مارا۔

"جھوٹے۔"

"میں جھوٹا نہیں ہوں تحرامہ۔"

میرداد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر درشتی سے کہا۔ "اوکے اوکے، کول۔۔۔ صحافی ہو پر بچے ہو۔" وہ نپٹنا کر بھی لطیف طنز کرنے سے باز نہ آئی۔

"سیاستدانوں سے زیادہ جھوٹا اور فریبی نہیں ہوں۔" وہ عجیب انداز میں بولا۔

"ہر سیاستدان جھوٹا ہوتا ہے اور نہ ہی فریبی، اپنی معلومات درست کر لو۔" تحرامہ کی خاندانی سیاست پر چوٹ پڑی تھی۔ سو وہ بھی خراب موڈ سے بولی۔

"ہاہا۔۔۔ کمنٹ آف دا ایر۔ تمہاری بات سنہرے حروف سے لکھنے لائق ہے۔" وہ چہرہ اوپر کر کے ہنسنے لگا۔

"تمہارا کاروبار سیاست اور سیاستدانوں سے ہی چلتا ہے۔۔۔ اتنی نفرت کرتے ہو تو صحافت چھوڑ دو۔"

تحرامہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاہا۔ یہ اچھی کہی۔۔۔ میں صحافت چھوڑ دوں تم لوگ دوغلا پن نہیں چھوڑو گے۔"

اس کا لہجہ سلگا ہوا تھا۔ تحرامہ بے طرح الجھی۔

"کیسا دوغلا پن۔۔۔ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ کیسی عجیب باتیں کر رہے ہو۔"

"ہم۔۔۔ ایسے ہی تمہیں شریک حیات سمجھ کر دل کا بوجھ ہلکا کر رہا تھا۔۔۔ لیکن تم بیوی سے زیادہ پولیٹیکل دشمن ہو۔۔۔ سو معافی چاہتا ہوں۔" وہ

سگریٹ ... انداز سے بولا۔ تحرامہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی پر مصلحتاً خاموش رہی۔

"اب چند دن رہ گئے ہیں میری واپسی میں۔۔۔ تم اس طرح میرا دل جلا کر مجھے رخصت کرو گے۔" وہ میرداد کے کندھے پر سر رکھ کر روہانسی ہو کر بولی تو میرداد نے اسے اپنے قریب کر لیا۔

"تم تو میری جان ہو۔۔۔ میں بھلا تمہارا دل کیوں جلاؤں گا۔۔۔ تم خود جذباتی ہو گئی ہو سچ سن کر۔۔۔ بہرحال چلو آؤٹنگ پر چلتے ہیں۔ ان چند دنوں کو یادگار بنالیں پھر یہ لمحات میسر ہوں نہ ہوں۔" میرداد نے اٹھتے ہوئے کہا تو تحرامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ بعض اوقات وہ بہت عجیب باتیں کرتا تھا۔

☆☆☆

زندگی کہیں کھو گئی تھی جسے باوجود کوشش کے وہ ڈھونڈ نہیں پا رہا تھا۔ اماں اور رطابہ کے اصرار پر اس نے نقلی بازو لگوا لیا تھا۔ ان کے پریشان چہرے وہ دیکھ نہیں سکتا تھا اسی لیے نا چاہتے ہوئے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ رطابہ کی خواہش پر یونیورسٹی میں ایڈمیشن بھی لے لیا تھا۔ دل کی خواہش تو پوری نہ ہو سکی تھی لیکن اماں کا سہارا بہرحال بننا تھا جو اس واقعے کے بعد ایک دم بہت بوڑھی اور تھکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اس بنگلے میں رہنا اب اس کے لیے بہت اذیت ناک ہو گیا تھا۔

وہاں آتے جاتے وہ کوشش کرتا کہ "شاہ مینشن" کی طرف نگاہ نہ پڑے۔ جسے دیکھ کر اس کے اندر خون کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔ آنکھوں سے لہو ٹپک پڑتا تھا۔ یہ تو وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ اس دن اس لڑکی کا بوائے فرینڈ اس سے ملاقات کی غرض سے آیا تھا۔ جس کے دھوکے میں شاہ مراد نے ٹیپو کو گولی ماری۔ اسے بہت افسوس ہوا کہ پہلی بار دل کسی پر آیا اور وہ بھی کمزور کردار کی لڑکی نکلی۔ اب تو اس لڑکی کے لیے بھی اس کے دل میں صرف اور صرف نفرت تھی۔

☆☆☆

وہ اس وقت ایئرپورٹ کے ویٹنگ ایریا میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تحرامہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ رات کو دو بجے بابا کا فون آیا تھا۔ اور وہ بے حد غصے میں تھے۔ تحرامہ کو فوراً وطن لوٹنے کا کہا تھا۔ ان کو یقیناً کہیں سے سن گن مل گئی تھی۔ تحرامہ رات سے پریشان بیٹھی تھی۔ میرداد نے فوراً اس کے جانے کا انتظام کیا تھا۔۔۔ وہ اسے ساتھ لگائے تسلیاں دے رہا تھا۔

"دیکھو تحرامہ! ہم کوئی عام لوگ نہیں ہیں۔۔۔ کہ ہماری سرگرمیاں نوٹس میں نہ آئیں۔ میرے ہی قلم قبیلے کے لوگ ہر جگہ نظر رکھے ہوئے ہیں۔۔۔ اور یہ کوئی بڑا ایشو بھی نہیں۔۔۔ ہم نے نکاح سے پہلے یہ ممکنہ باتیں سوچ رکھی تھیں۔ اور ان کا سامنا کرنے کو بھی تیار تھے۔۔۔ اب قدم اٹھایا ہے تو ثابت قدمی سے چلنا بھی ہو گا۔۔۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ بابا کو نکاح کا بتا دینا۔ آخر تمہارا بھی تو حق ہے اپنی زندگی پر۔۔۔ اپنے ذاتی فیصلے اپنی مرضی سے لینا کوئی گناہ نہیں۔" میرداد اس کو حوصلہ دے رہا تھا۔

"تمہارے بابا نے تو دو بیویوں سے فارغ عجران شاہ سے تمہاری قسمت پھوڑنی چاہی، وہ تو اس کی لالچی اور فریبی فطرت نے خود ان کو رشتہ ختم کرنے پر مجبور کیا۔ اب دوبارہ تمہیں کسی اور عجران کے حوالے کر دیتے تو؟ تم نے اپنی مرضی کا فیصلہ کر کے بہت اچھا کیا۔ اب تم بچی نہیں خود مختار عورت ہو۔ تمہارے بابا کا تم پر اپنے فیصلے مسلط کرنا بنتا ہی نہیں۔" وہ غصے سے بولا تو تحرامہ نے لب بھینچ کر سر ہلایا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو، بہت کر لی بابا نے ہم بیٹیوں پر حکومت۔ ہمیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میں ان سے پہلے بھی اختلاف کرتی آئی ہوں مگر پہلے مجھے کوئی ہم نوا اور ہم قدم نہیں ملا۔ اب تو تم ہو میرے ساتھ۔۔۔ اب میں خود کو مضبوط محسوس کرتی ہوں۔" وہ تنی سے بولتے ذرا سا

اس کا ہینڈ کیری اسے دے کر پیار سے بولا تو تحرامہ کی آنکھیں چھلک گئیں۔

"آئی لو یو میر۔۔۔ مجھ سے رابطے میں رہنا۔"

"آئی لو یو ٹو مائی وائف۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔"

وہ اس کی پیٹھ تھپتھپا کر اس سے الگ ہوا تو تحرامہ نے نا چاہتے ہوئے بھی قدم آگے بڑھائے۔

☆☆☆

"تم نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا اور ایک لمحے کو اپنے خاندان کے وقار اور اپنے باپ کی عزت کا خیال نہیں کیا۔" وہ مٹھیاں بھینچے تحرامہ کو گھور رہے تھے۔

"مجھے اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے کا حق ہے بابا۔ مجھے جو اپنے لیے مناسب لگا میں نے کیا۔" تحرامہ اطمینان سے بولی تھی۔

"تمہاری مرضی۔ وہ چالاک صحافی جو دو ٹکے کے پروگرام کر کے خود کو توپ چیز سمجھتا ہے اسے تم نے ہمارے برابر لا کھڑا کیا ہے۔" بابا کا غم و غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ تحرامہ مصلحتاً خاموش رہی۔

"اتنے نازک موقع پر جب سیاست کی جوڑ توڑ چل رہی ہے تم نے ہمارے حریفوں کو ہماری پگڑی اچھالنے کا موقع دے دیا ہے۔ تمہارا میرداد کے ساتھ اسکینڈل اخبارات اور میگزینز کا ہاٹ ٹاپک بن چکا ہے۔" انہوں نے کئی اخبارات میز پر پھینکے۔ جن میں مع تصاویر میرداد اور تحرامہ کی لو اسٹوری کو سرخی بنایا گیا تھا۔

"یہ بھی دیکھو اپنی بے حیائی کے ثبوت۔" انہوں نے ایک اور میگزین کھول کر دکھایا جس کے صفحات پر تحرامہ اور میرداد کی دبئی بیچ پر لی گئی تصاویر تھیں۔ تحرامہ کو جھٹکا سا لگا۔۔۔ باپ کے سامنے اسے حیا سی آگئی تھی۔

"تم نے میرے سر پر خاک ڈال دی ہے تحرامہ۔" وہ صوفے پر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ تحرامہ کے دل کو کچھ ہوا۔۔۔ کسی زمانے میں طاقت اور جلال کے پیکر بوڑھے باپ کو یوں ٹوٹ کر بیٹھتے دیکھ کر تحرامہ کا دل بھی ہانپ جاتا تھا۔

"بابا۔" وہ بے چین ہو کر ان کی طرف بڑھی۔

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ باپ اتنا عزیز ہوتا تو ایسا قدم اٹھاتیں؟" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولے۔ تو تحرامہ برف کی طرح ٹھنڈی پڑ گئی۔

☆☆☆

گھر کے ماحول میں عجیب تناؤ سا تھا۔ بابا کا اصرار تھا کہ تحرامہ فوراً میرداد سے خلع لے لے۔ تحرامہ مر کر بھی اس بات پر راضی نہیں تھی۔ بابا نے جس مخصوص حلقے کی ٹکٹ پر کھڑا ہونا تھا اب چچا سائیں اس پر خود کھڑے ہو رہے تھے کہ تحرامہ کی وجہ سے لوگوں میں مختلف چہ مگوئیاں پھیل گئی تھیں اور خدشہ تھا کہ حریف اس کمزوری کو اپنی طاقت بنا کر اپنا ووٹ بینک بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ برسوں سے اس حلقے سے ان کا خاندان جیتتا آیا تھا اور ٹکٹ بڑے سردار کی حیثیت سے بابا کو ملتا تھا۔ اب تحرامہ کی وجہ سے یہ روایت بدل رہی تھی۔ بابا کا بس نہ چلتا تھا وہ کیا کر دیں۔ وہ میرداد کو سامنے لا کر زمین میں دفن کر دینا چاہتے تھے۔

اور میرداد سے تو تحرامہ کے پاکستان آنے کے بعد رابطہ ہی نہ ہو پا رہا تھا۔ تحرامہ کال ملا ملا کر تھک چکی تھی۔ نجانے کیا مسئلہ ہوا تھا۔ وہ پریشانی سے سوچتی۔ ادھر زندگی اس پر تنگ ہوتی جاتی تھی اور ادھر ساتھ دینے کے دعوے کرنے والا منظر سے غائب تھا۔

وہ واپس دبئی جانا چاہتی تھی مگر بابا نے تو گھر سے نکلنا بھی دوبھر کر رکھا تھا۔ خاندان والوں نے الگ کہرام مچایا ہوا تھا۔۔۔ وہ عجیب حالات میں گھر گئی تھی۔

☆☆☆

وقت نے پہنایا ہے مجھے بے بسی کا پیراہن
وجود پر ہوا ہے تنگ زندگی کا پیرہن
آنے والے دن عجیب ۔۔۔ آزمائش لے
کر آئے تھے۔

وہ کچھ دن سے طبیعت میں بوجھل پن محسوس کر رہی تھی۔ سوا اپنی قریبی ڈاکٹر دوست کو حال بتایا۔

اس نے پریگننسی ٹیسٹ کروالیا اور رپورٹ پازیٹو آئی۔ تحرامہ کتنی دیر وہ کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے گم صم بیٹھی رہ گئی۔ یہ اگر خوش خبری تھی تو اس خبر پر خوشی کا اظہار کرنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اور جسے یہ خبر خوش کرتی وہ تو تمام رابطے توڑے بیٹھا تھا۔ تحرامہ کا دل ابھی بھی ماننے کو تیار نہ تھا کہ میرداد نے اسے دھوکا دیا ہے۔ وہ جو اس کی روح میں بستا تھا بھلا ایسا ہو سکتا تھا؟ اس کی بہنوں کو پتا چلا تو بابا کو بھی خبر پہنچ گئی اور پھر سے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ بابا کا فشار خون آخری حدوں کو چھونے لگا۔ "اس گناہ کی پوٹلی کو ختم کرو۔ ورنہ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ مجھے تم جیسی نافرمان بیٹی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نکل جاؤ۔" وہ شدت جذبات سے سرخ پڑ گئے تھے۔ تحرامہ نے بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا بابا۔ یہ بچہ میری جائز اولاد ہے اور اسے ختم کر کے میں گناہ گار نہیں ہو سکتی۔۔۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی نظروں سے دور ہو جاؤں تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔"

وہ ہموار لہجے میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے فیصلے سے بابا کو دھچکا لگا تھا یعنی وہ میرداد کی نشانی کو ان پر فوقیت دے رہی تھی۔۔۔ وہ اشتعال میں آکر اٹھے اور تحرامہ کی طرف بڑھے لیکن اسی وقت ان کے قدم لڑکھڑائے اور وہ زمین پر گر گئے۔ تحرامہ تیزی سے ان کے پاس آئی اور ان پر جھک گئی جو ہوش سے بیگانہ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

بابا پر انجائنا کے اٹیک کے ساتھ ہی فالج کا حملہ ہوا تھا۔ ان کا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا تھا۔ انتہائی نگہداشت میں دو راتیں اور تین دن گزار کر ۔۔۔ وہ اسپتال کے کمرے میں شفٹ ہوئے۔ تحرامہ نے یہ دن رات سولی پر کاٹے تھے وہ رو رو کر ان کی صحت یابی اور زندگی کے لیے دعا کر رہی۔ دونوں بہنوئی اور تایا چچا وغیرہ کا رویہ اس کے ساتھ بہت برا ہو گیا تھا۔ وہ سب اسے جن نگاہوں سے دیکھتے اور طنزیہ باتیں کرتے تحرامہ کا جی چاہتا کہ مر جائے۔۔۔ بہنیں الگ اسے بابا کی حالت کا ذمہ دار ٹھہرا رہی تھیں۔

جس دن بابا پورے ہوش میں آئے تو وہ بے اختیار خوش ہو کر ان کے پاس آئی۔۔۔ اسے سامنے دیکھ کر بابا کا تنفس تیز ہو گیا اور وہ اشارے سے تحرامہ کو نظروں سے ہٹنے کا کہنے لگے۔ یہ دیکھ کر زمامہ فوراً آگے بڑھی اور اسے کندھوں سے پکڑ کر کمرے سے باہر دھکیل دیا۔ پھر اس کی بہن نے گھر آکر اس پر خوب بھڑاس نکالی۔

"مار دو گی انہیں جان سے۔ تب تمہیں چین ملے گا۔۔۔ نکل کیوں نہیں جاتیں ہم لوگوں کی زندگی سے۔ ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ تماشہ بنا دیا ہے ہماری فیملی کو۔ جس سے نکاح کیا ہے وہ تو منہ چھپا کر بیٹھ گیا ہے بزدل۔ تم ہمارے سر پر بیٹھ کر ہمیں بدنام کر رہی ہو۔۔ جاؤ اپنے اس ہوتے سوتے کے پاس۔" زمامہ نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا تو وہ ششدر رہ گئی۔

"زمامہ۔" وہ نم آواز میں پکاری۔

"پلیز چلی جاؤ۔ ہم بیٹھے ہیں بابا کو سنبھالنے کے لیے۔ تم نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اب اسی کو آگے نبھاؤ۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دبئی سے واپس کیوں آئیں۔ وہیں رہ جاتیں ہم فاتحہ پڑھ لیتے تم پر۔ کتنا ذلیل کروایا ہے اس دو ٹکے کے صحافی سے تمہارے خفیہ نکاح نے۔ بابا اپنے ساتھ تمہیں سیاست میں لے کر چلے۔۔۔ پہلی بار کسی خاندان کی لڑکی کو سیاست میں آنے کا موقع دیا اور تم نے فیملی کے مردوں کے خیالات پر مہر ثبت کر دی کہ وہ اچھا ہی کرتے ہیں جو اپنی عورتوں کو باہر کی دنیا سے دور رکھتے ہیں۔" وہ مزید زہر اگلتی رہی جس سے تحرامہ کا وجود نیلا ہو گیا تھا۔ شکستہ دل کے ساتھ وہ یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

اپنی عزیز دوست کے گھر ملتان آنے تک اس کے حوصلے بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ وہ ندا سے گلے مل کر کتنی دیر روتی رہی۔ ندا نے بھی اسے کھل کر رونے دیا تھا۔

''اس نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا ندا۔ ایسی کون سی دشمنی تھی اسے مجھ سے۔'' تحرامہ نے بھولے پن سے پوچھا تو ندا نے تاسف سے اسے دیکھا۔

''معلوم نہیں تحرامہ۔ معاذ بھائی تو بتا رہے تھے وہ بہت لوئل بندہ ہے۔ آج تک اس کے کردار میں کوئی جھول کسی نے نہیں دیکھا۔ میڈیا کے افراد اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔'' ندا نے اپنے بڑے بھائی کا حوالہ دیا جو خود کسی چینل کا پروڈیوسر تھا۔

''ان کا کوئی رابطہ ہے اب میر داد سے؟'' تحرامہ نے امید سے ندا کو دیکھا۔

''جب ان کے چینل پر جاب کرتا تھا تب تو ہیلو ہائے تھی لیکن اب کا معلوم نہیں۔ میں پھر بھی پتہ کروں گی۔'' ندا نے تسلی دی۔ تحرامہ مایوس ہوئی تھی۔

''خیر تم اتنے دنوں بعد آئی ہو۔ اور باتوں میں ہی لگی ہو۔ میں زبردست سا ڈنر بنواتی ہوں تمہارے لیے۔'' ندا اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی تو تحرامہ نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔ زندگی کا یہ موڑ اسے کمزور کر رہا تھا۔ ناامیدی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

ندا نے تحرامہ کو اپنے پاس ہی ٹھہرا لیا تھا...... حالانکہ تحرامہ کا وہاں اپنا ذاتی فلیٹ بھی تھا...... جو اس کے نانا نے اسے گفٹ کیا تھا...... اس کا ارادہ دو چار روز بعد فلیٹ میں شفٹ ہو جانے کا تھا لیکن ندا کے اصرار پر وہ بے بس ہو گئی۔ ندا اسے اس ذہنی کیفیت کے ساتھ اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

تحرامہ کی آنکھیں دوست کی اتنی محبت پر نم ہو جاتی تھیں۔۔۔ اپنی بہنوں کے ناروا سلوک یاد آتے۔ ندا ایک ویل آف فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والدین کی وفات ہو چکی تھی۔۔۔ ایک بھائی شادی شدہ لاہور میں رہتا تھا۔ ندا ماں باپ کے بعد بھی بھائی کے ساتھ لاہور نہ گئی۔ اس کا بوتیک کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ پھر وہ ایک این جی او کے ساتھ بھی منسلک تھی۔

ایک شادی میں ناکامی کے بعد وہ اب اکیلے ہی زندگی بسر کر رہی تھی۔ تحرامہ کے آنے سے اسے دوہراہٹ کا احساس ہوا تھا۔۔۔ وہ اپنی مصروفیت سے نکل کر کافی وقت تحرامہ کی دل جوئی میں گزار رہی تھی۔ تحرامہ ہی جانا چاہتی تھی اسے لگتا تھا میر داد کسی انہونی کا شکار ہو گیا ہے ورنہ اس طرح اسے کیوں تنہا چھوڑ دیتا۔۔۔ وہ ہزار وسوسے لیے اس کی خیریت کی دعا کرتی تھی۔

ندا اس کو اس حالت میں سفر سے روک رہی تھی کہ ڈاکٹر نے تحرامہ کو بیڈ ریسٹ بتایا تھا۔۔۔ وہ مجبور ہو کر بیٹھ گئی۔۔۔ اب سارا دن اس کا مشغلہ بس میر داد کو یاد کر کے اداس رہنا تھا۔ اس دن بھی ندا اسے اس حالت میں دیکھ کر سخت سنا رہی تھی کہ ٹی وی اسکرین پر میر داد کا چہرہ نمودار ہوا تو تحرامہ حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ ''ندا یہ دیکھو میر۔ وہ خیریت سے ہے وہ ٹھیک ہے۔'' تحرامہ جوش میں بے ربط سا بول رہی تھی۔

''وہ خیریت سے ہی ہے تحرامہ۔''

''وہ تم سے بات نہیں کرے گا تحرامہ۔'' ندا نے گہری سانس لے کر کہا۔

''کیوں؟'' تحرامہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیونکہ وہ تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔۔۔ میرے بھائی نے اس کے پاکستان آتے ہی اس سے رابطہ کیا۔ اس سے تمہارے متعلق بات کی۔ وہ مان رہا ہے اس نے تمہارے ساتھ نکاح کیا۔ لیکن وہ کہہ رہا ہے اب وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔ بھائی نے اسے مزید بہت کچھ کہا مگر وہ کوئی بات کہنے سننے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے بس یہی کہا تمہیں بھی طلاق نہیں دے گا۔ معاذ بھائی کو بہت غصہ آیا۔ وہ میر داد کو ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے مجھے کئی روز پہلے یہ بتایا لیکن میں تمہاری طبیعت کے پیش نظر نہیں بتا رہی تھی۔'' ندا اس سے نظریں چرا کر بات کر رہی تھی۔۔۔ تحرامہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔

''تم دل پر نہیں لینا تحرامہ۔۔۔ جانتی ہو نا اس کنڈیشن میں ڈپریشن تمہارے لیے کتنا برا ثابت ہو سکتا ہے۔'' ندا نے آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ تحرامہ نے لب بھینچ کر سر ہلایا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روئے مگر وہ ضبط کر رہی تھی۔

''بہت ہی کم ظرف انسان نکلا میر داد۔۔۔ تم جیسے ہیرے کی ناقدری کی۔ یہ تو تمہاری اندھی محبت ہے کہ تم نے اس کا عیب نظر انداز کر دیا۔ وہ تمہیں طلاق نہ دے کر تمہیں اذیت دینا چاہتا ہے۔ تم فکر مت کرو ہم کورٹ سے خلع لے لیں گے۔'' ندا کی بات پر تحرامہ نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

''اس نے مجھ سے محبت کی ہو یا نہیں مگر میں نے اس سے محبت کی ہے۔ میں خلع نہیں لوں گی۔'' تحرامہ نے بھیگے لہجے میں کہا تو ندا مصلحتاً خاموش ہو گئی۔

''او کے او کے جو تم کہو گی ویسا ہی ہو گا۔'' وہ اس کا بھیگا چہرہ صاف کرنے لگی۔۔۔ تحرامہ کی نظریں اب بھی ٹی وی کی بند اسکرین پر جمی تھیں۔

☆☆☆

میری پیاس بھی نہیں بجھی میر داد من ذرا سا تر ہوا وہ اوس کا ایک قطرہ تھا میری تشنگی بڑھا گیا

اس کی زندگی سے سکون کا لفظ نکل گیا تھا۔۔۔ وہ انتہائی بے چینی کا شکار تھی۔۔۔ بے وجہ ٹھکرائے جانے کی اذیت کوئی اس سے پوچھتا۔ دل چاہتا تھا ایک بار صرف ایک بار میر داد اسے اس ناروا سلوک کی وجہ بتا دے۔۔۔ وہ ہر وقت اس کے بند نمبر پر کال ملاتی رہتی۔۔۔ ندا نے اس کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی۔۔۔ تحرامہ پہلے ہی تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھی جس نے اسے نڈھال کر دیا تھا جو کھانی الٹ کر باہر نکل آتا۔۔۔ ہر وقت سر چکراتا اور سستی محسوس ہوتی تھی۔ بددلی ایسی تھی کہ کچھ کرنے کو دل نہ کرتا۔

ایک ایسے ہی دن جب وہ بے انتہا بددل ہو کر میر داد کا نمبر ملائے جا رہی تھی کہ اچانک کال جانے لگی۔۔۔ تحرامہ کا دل دھڑک اٹھا۔

''ہیلو۔'' کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ اتنے دن بعد میر داد کی آواز سن کر تحرامہ کے آنسو نکل آئے۔

''میر۔'' وہ کراہی تھی۔

''کہو تحرامہ۔ کیا بات ہے۔'' میر داد نے اجنبیت سے پوچھا۔

''کیا بات کروں میر۔۔۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی زندوں میں نہیں ہوں۔۔۔ تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا میر۔ میری محبت کو دنیا کے آگے تماشہ بنا دیا۔''

وہ کمزور آواز میں چیخی۔

''تمہیں کیا معلوم تماشہ کیا ہوتا ہے اور وہ کیسے بنتا ہے۔'' میر داد نے گہری سانس لی۔ ''سنو تحرامہ۔۔۔ یہ پہلی اور آخری بار ہے کہ میں تم سے تفصیلی بات کر رہا ہوں۔ تم نے معاذ کے ذریعہ مجھے پریشرائز کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایک بات ذہن میں بٹھا لو کہ مجھے نہ تم میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ اس آنے والے بچے میں۔'' میر داد نے سفاکی سے کہا تو تحرامہ متحیر رہ گئی۔

''کیوں میر داد تم تو پیار کرتے ہو مجھ سے پھر۔''

''میرا پیار میری نفرت سے زیادہ طاقتور نہیں ہے تحرامہ۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں مگر تم ہی وہ ہستی ہو جس نے میری زندگی میں سب سے زیادہ کانٹے بوئے ہیں۔ اور اب وہی کانٹے میں تمہارے اور تمہارے بابا کے وجود میں چبھونا چاہتا ہوں۔'' وہ کڑوے پن سے بولا تو تحرامہ الجھ گئی۔

''کک کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔۔۔ میں تو تمہاری وجہ سے اتنی صعوبتوں سے گزری ہوں۔ زندگی زہر سے بڑھ کر زہریلی ہو گئی ہے۔ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی سنگسار کی جا رہی ہوں۔'' وہ سسکتی رہی۔

"تم ہی تو ہو میری سب سے بڑی گناہ گار۔ پندرہ سولہ سال پیچھے جاؤ۔ اور یاد کرو جب تم نوعمر خوبصورت لڑکی ہوا کرتی تھیں۔۔۔ ایک بیوقوف لڑکا۔۔۔ روز صبح تمہاری ایک جھلک دیکھنے کو تمہارے بنگلے کے باہر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔۔۔ اس کا گناہ صرف اس کی معصوم محبت تھی۔۔۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جس لڑکی کے معصوم حسن کا وہ دیوانہ ہوا ہے وہ تو دنیا کے رنگ چکھے بیٹھی ہے۔۔۔ ایک دن جب وہ لڑکا اپنی خاموش محبت کو اظہار کی زبان دینے کے ارادے سے اس لڑکی کی طرف بڑھا تو وہ لڑکی جو پہلے ہی اپنے بوائے فرینڈ کو ملاقات کے بعد گھر سے بھگا رہی تھی۔ اس پر ذرا توجہ نہ دے سکی۔۔۔ لیکن اس کا سفاک باپ جو بنا سوچے سمجھے بنگلے سے پستول تانے باہر نکلا۔ اس بے قصور لڑکے کو اپنا نشانہ بنا دیا۔۔۔ یہی نہیں بلکہ اس زخمی لڑکے کو اکیلا زمین پر تڑپتا چھوڑ کر وہ اندر چلا گیا۔۔۔ اور جب کافی دیر بعد اس لڑکے کو اسپتال پہنچایا گیا تو اسپتال میں آ کر تمہارے باپ کے بھیجے گئے غنڈوں نے اس غریب لڑکے کو دھمکیاں دیں کہ زبان کھولنے پر اس کی بہن کے ساتھ۔" میرداد کہانی سناتے ایک دم خاموش ہوا تھا اور تحرامہ کے سامنے سولہ سال پرانا منظر تازہ ہو گیا۔ اس کے اندر دھماکے ہونے لگے تھے۔

"اس قصے کا تم سے کیا تعلق۔" اس نے الجھ کر پوچھا۔ لیکن میرداد نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"پھر اس لڑکے کا بازو کاٹ کر اس کا مستقبل تاریک کر دیا گیا۔ اور پھر برسوں بیت گئے قصوروار بے قصور پھرتے رہے اور بے گناہ غم ڈھوتے رہے۔ اس کی ماں اس کی خوشیاں دیکھنے سے قبل اس دنیا سے چلی گئی۔" وہ ایک لمحہ کو بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ "میں پوچھ رہی ہوں اس سب سے تمہارا کیا لینا دینا ہے۔"

تحرامہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیونکہ وہ لڑکا میں ہوں تحرامہ۔" میرداد نے بوجھل لہجے میں کہا تھا تحرامہ جیسے گنگ ہو گئی۔ "تم بڑے لوگ کیا جانو ایک غریب بیوہ عورت کا دکھ جس کا اکلوتا بیٹا ــــ اپاہج ہو جائے۔۔۔ اس کے برسوں سے دیکھے گئے خواب زمین میں دفن ہو جائیں اور ان کے ساتھ وہ خود بھی۔۔۔ آج میں اس مقام پر پہنچ کر اپنی ماں کو کتنی ہی آوازیں دیتا ہوں کہ ماں آ کر دیکھو میں۔۔۔ تمہارا نیچو کتنا خوشحال اور مطمئن ہے مگر وہ مجھے پلٹ کر جواب نہیں دیتی۔۔۔ وہ میرے مستقبل سے مایوس ہو کر یہ جہان چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اب جب خدا نے مجھے سب کچھ دے دیا تو وہ موجود نہیں ہے۔" میرداد عرف نیچو کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"اس سب کی وجہ ہو تم ہو۔۔۔" وہ پھر سے پھنکارا تھا۔

"تحرامہ۔ میرا حساب کتاب تمہاری طرف بہت زیادہ نکلتا ہے لیکن میں نے ــــ بہت کم میں تمہیں اور تمہارے باپ کو چھوڑا ہے۔۔۔ اور بس اب میں چاہتا ہوں تم اپنی باقی عمر پچھتاوے کے زخم چاٹتی رہو کہ تم نے شادی کے لیے بہت غلط شخص کا انتخاب کیا ہے۔۔۔ زندگی بھر کے لیے خدا حافظ۔" میرداد نے زہر بھرے انداز میں کہہ کر فون کاٹ دیا۔ تحرامہ گم صم سی موبائل اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

☆☆☆

اس فون کال کے بعد وہ دنوں بے قرار رہی۔۔۔ میرداد کو دل سے نکالنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کے اتنے نفرت آمیز لہجے کو سن کر بھی وہ اس سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکی تھی۔ میرداد اپنے طور پر حق پر تھا اس کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ لیکن تحرامہ قصوروار نہیں تھی۔ اس کے بھاگ تو ہمیشہ سے خراب رہے تھے۔ نوعمری میں کلاس فیلو کے بھائی کو پسند کیا۔ وجہ صرف ان کی پرسکون اور آزاد خیال فیملی تھی۔ ان کے گھر کے مردوں کا نرم اور مشفقانہ رویہ تھا۔ جو تحرامہ کو اپنی فیملی کے مردوں میں کبھی نظر نہ آیا۔ ان کے خاندان کے مرد عورت کو صرف جاگیر کی نظر سے دیکھتے تھے جس پر قبضہ کیے رکھنا ان کا حق تھا۔ ان کے لہجوں میں عورت کے لیے بڑی تحقیر ہوا کرتی تھی۔ خوامخواہ کا رعب اور روک ٹوک۔

تحرامہ کو ماہ وش کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو اسے پتہ چلا کہ وہ کس گھٹن میں جی رہی ہے۔ ماہ وش اور اس کے پاپا بالکل دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ اس کا بھائی بھی اس کے ساتھ ہنسی مذاق میں مگن تھا۔ اتنا دوستانہ ماحول تحرامہ نے کب دیکھا تھا۔ وہ تو گرویدہ ہو گئی۔ درید کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی نظر آئی تو وہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔ وہیں سے ان کی وابستگی کی شروعات ہوئی۔ وہ فیملی کے گھر پھر نہیں جا سکی تھی لیکن اس کا فون پر درید سے رابطہ تھا۔ وہ کالج کے گیٹ پر بھی بہن کو لینے کے لیے آتا تو تحرامہ کو کار میں بیٹھے دور سے دیکھ لیتا۔ لیکن یہ اس کے لیے ناکافی تھا۔ وہ تحرامہ کو ملنے پر اکساتا پر تحرامہ کے لیے ممکن نہیں تھا باہر بے وجہ نکلنا۔ پھر انٹر کے بعد چھٹیوں میں تو وہ اس کی ایک جھلک سے بھی گیا۔ یہ بات اس کو تڑپا گئی اور وہ اس دن تحرامہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود نجانے کیسے اس کے کمرے کی کھڑکی تک آ گیا۔ تحرامہ اسے دیکھ کر بوکھلا گئی۔ ابھی وہ اپنی کارکردگی کی شاباشی بھی نہ لے پایا تھا کہ ایک ملازم کو خبر ہو گئی۔ اور کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا تحرامہ نے درید کو واپس جانے کو کہا۔ وہ کود کر ذیلی دیوار پر گیا اور آہستہ سے چلتا اسی طریقے سے باہر چھلانگ لگائی۔

تحرامہ نے دروازہ نہیں کھولا تھا وہ کھڑکی سے لپک کر درید کو دیکھ رہی تھی کہ بابا پستول ہاتھ میں لیے گیٹ سے باہر نکلے اور ایک فائر ہوا۔ تحرامہ دہل کر کمرے میں آ گئی۔۔۔ تو اسے اطمینان تھا کہ درید کافی دور نکل گیا تھا پھر بھی وہ ڈرتے ڈرتے کھڑکی سے جھانکنے آئی تو ایک لڑکے کو زمین پر تڑپتے پایا۔۔۔ یہ لڑکا روز ہی ان کے گھر کے سامنے کھڑا ہو کر تحرامہ کو دیکھتا تھا پر تحرامہ نے اس کو کبھی قابل توجہ نہ جانا تھا۔

تحرامہ اس منظر پر زیادہ غور نہ کر سکی کہ اس کے کمرے کا دروازہ ایک بار پھر دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ تحرامہ نے دروازہ کھولا تو بابا غصے سے اندر آئے تھے۔

"کیا کر رہا تھا وہ لڑکا یہاں۔ کب سے جانتی ہو اسے۔" وہ پیچھے سے دروازہ بند کر کے اس کے قریب آئے۔

"مم میں اسے نہیں جانتی۔۔۔ کک کوئی چور تھا شاید۔" تحرامہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ہی کمرے میں آیا سارا گھر چھوڑ کر۔" بابا اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" تحرامہ نے تھوک نگلا۔

"آج سے تمہارا کمرہ چینج کروا دیتا ہوں۔ کھڑکی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔" وہ تن فن کرتے واپس چلے گئے۔ تحرامہ نے گہرا سانس لیا۔ پھر اس نے درید سے رابطہ کیا مگر اس نے تحرامہ سے بات نہیں کی۔ تحرامہ نے بہت کوشش کی۔۔۔ ماہ وش بھی کال اٹینڈ نہیں کرتی تھی۔

دو ماہ بعد کالج کھلے تو ماہ وش اس سے بہت بے رخی سے ملی۔ تحرامہ نے اس کا رویہ نظر انداز کر کے ڈھیٹ بن کر ہیلو ہائے کی۔

"اس دن میرے بھائی نے تمہارے بابا کو ایک بے قصور لڑکے پر فائر کرتے دیکھ لیا جسے تمہارے بابا نے درید کی غلط فہمی میں گولی ماری تھی۔ اسی لیے وہ خوفزدہ ہو گیا ہے۔ وہ میرا اکلوتا بھائی ہے۔ ہمیں اس کی جان پیاری ہے تحرامہ۔ تم سے تعلق اس کی جان لے لے گا اس کا پیچھا چھوڑ دو۔۔۔ تمہارے بابا ویسے بھی درید کے ساتھ تمہاری شادی نہیں کریں گے۔" ماہ وش جو دونوں کی رازدار تھی، خشک لہجے میں بولی تو تحرامہ چپ ہو گئی۔

"درید مجھے بھول سکتا ہے کیا؟"

تحرامہ کی آواز رندھ گئی۔

"وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے اس سے زیادہ کر سکتا ہے۔" ماہ وش نے جتایا تھا۔ تحرامہ اس کے

بعد کچھ نہیں بولی تھی۔ اس دن کے بعد اس کی ماہ وش سے دوستی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی تھی۔ درید بھی کالج بہن کو لینے آتا تب بھی تحرامہ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ تحرامہ کی پہلی پسندیدگی پہلی خواہش ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اس نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔ جب گلابی تولیے میں لپٹا وہ ننھا وجود تحرامہ کی بانہوں میں دیا گیا تو وہ بے اختیار رو پڑی۔ بچے کے نقوش میں میرداد کی جھلک واضح تھی۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے منہ بسور رہا تھا۔ تحرامہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ”مبارک ہو تحرامہ۔“ ندا نے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

”میرے بھانجے کا نام بھی سوچا ہے یا نہیں۔“ ندا نے اسے اداس دیکھ کر ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔ ”اتنی ٹینشن میں نام کیا سوچتی۔ تم خالہ ہو کوئی بھی نام رکھ دو۔“

تحرامہ نے آہستہ سے بچے کو کاٹ میں لٹایا۔ ”اچھا بھئی سوچتے ہیں ننھے شہزادے کا نام۔“ ندا نے سیل فون سے بچے کی تصاویر اتارتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھو کتنا پالا لگ رہا ہے۔“ ندا نے تصاویر دکھائیں۔

”ماشاء اللہ۔ یہ مجھے واٹس ایپ کرو۔“ تحرامہ نے کہا تو ندا نے فوراً تصویریں اس کے سیل پر بھیجیں۔ تحرامہ نے ان میں سے دو تصویریں منتخب کیں اور ”ہمارا بیٹا“ کا کیپشن لکھ کر ایک نمبر پر بھیج کر دیں۔ دو منٹ بعد ہی میسج سین ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ننھے عماد کے آنے سے زندگی ایک دم بہت مصروف ہو گئی۔ وہ تحرامہ کو ایک پل کے لیے خود سے غافل نہ ہونے دیتا۔ رات کو اسے نیند آتی نہ دن کو چین سے سوتا تھا۔ لگتا تھا تحرامہ کی بے خوابی اس نے چرائی تھی۔ روتا تو مسلسل روتا۔ تحرامہ گھبرا کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی۔ ڈاکٹر تسلی دیتی کہ بچہ صحت مند ہے۔ بس ابھی روٹین بننے میں وقت لگے گا۔ وہ عماد کو لے کر بہت حساس تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی۔ ندا کی اپنی مصروفیات تھیں۔ اس کے باوجود وہ عماد کو تحرامہ سے لے کر خود بہلانے کی کوشش کرتی تاکہ تحرامہ کچھ آرام کر لے۔ اس کو بھی عماد کی صورت کھلونا مل گیا تھا۔ وہ اس پر جان چھڑکتی تھی۔ اس کے ہر پوز کی تصویریں اتارتی اور تحرامہ کو واٹس ایپ کر دیتی۔ تحرامہ ان پکچرز کو میرداد کے نمبر پر بھیج دیتی۔ میسج فوراً سین ہو جاتا تھا۔ پر جواباً خاموشی چھائی رہتی۔ اسے جواب کی طلب بھی نہیں تھی۔ اس کے دل کی خوشی میرداد سے شیئر ہوتی تھی یہی بہت تھا۔

ایک باپ کی حیثیت سے بیٹے کو دیکھنا اس کا حق تھا۔ تحرامہ روز عماد کی کئی تصاویر اسے بھیجتی تھی۔ ہنستے ہوئے، منہ بسورتے ہوئے۔ حلق پھاڑ کر روتے ہوئے۔ نیچے لکھ دیتی۔ ”ہمارا بیٹا روتے ہوئے۔“ ”ہمارا بیٹا ہنستے ہوئے۔ ہمارا بیٹا کھیلتے ہوئے۔“

دن مہینوں میں بدلنے لگے عماد اب بیٹھنے لگا تھا۔ جب اس نے دودھ کا پہلا دانت نکالا تو تحرامہ اپنی انگلی سے اس کو چھوتے بہت خوش ہوئی۔

”ہمارے بیٹے کا پہلا دانت“ —— لکھ کر میرداد کو تصویر بھیج دی۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل چلنا شروع ہوا تو تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتا تھا۔ تحرامہ اس کو بار بار پکڑتی اور وہ ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتا۔ اس کی ویڈیو بنا کر تحرامہ نے میرداد کو بھیجی۔ یہ پہلی ویڈیو بھی بھیج کردہ سین ہو جانے کے بعد بھی میرداد کی طرف سے کسی ستائشی جملے کی منتظر تھی چاہے وہ اسٹیکر کی صورت میں ہی ہوتا۔ لیکن اس کا انتظار انتظار ہی رہا۔ میرداد نے جوابی میسج نہیں بھیجا تھا وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ لیکن اس نے تصاویر بھیجنا نہ چھوڑی تھیں۔

☆☆☆

بابا کی موت کی خبر اس نے ٹی وی پر سنی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کے اپنوں نے اسے اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

”ندا! مجھے بابا کا آخری دیدار کرنا ہے۔ مجھے ابھی جانا ہے۔ وہ انہیں دفنا بھی دیں گے اور مجھے بتائیں گے بھی نہیں۔“ تحرامہ نے سسکتے ہوئے چہرے سے کہا تو ندا نے سر ہلایا۔ وہ دونوں جس وقت وہاں پہنچیں میت کو باہر لا کر رکھا جا رہا تھا تاکہ آخری آرام گاہ تک پہنچا سکیں۔ تحرامہ کے لیے آسانی ہو گئی۔ وہ گھر کی عورتوں سے ملنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ چہرہ اور جسم اچھی طرح چادر سے لپیٹ کر وہ بابا کی میت پر جھک آئی۔ مرد ایک طرف ہٹ گئے تھے۔

”بابا۔“ بے آواز بہتے آنسو صاف کرتے اس نے پکارا۔ بابا کا سفید اور کمزور چہرہ کفن میں لپٹا تھا۔ اس کا دل تار تار ہو گیا۔ وہ سسکنے لگی۔ ندا نے اس کو کندھوں سے تھام کر پیچھے کیا۔ خاندان کے مرد اسے پہچان گئے تھے لیکن اتنے مجمع میں جذباتی ہو کر وہ خود کو دنیا کے سامنے بدنام نہیں کروا سکتے تھے۔ تحرامہ نے بھی ان کو آزمائش میں نہیں ڈالا اور چپ چاپ وہاں سے نکل آئی۔ یہ الگ بات کہ دل پر بھاری بوجھ سا پڑ گیا تھا۔ اور بابا کی موت کا ذمہ دار اپنا وجود لگ رہا تھا۔

☆☆☆

کتنے ہی دن اسے سنبھلنے میں لگے تھے۔ عماد اپنی بے ساختہ حرکتوں سے اس کی توجہ کھینچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے جب اپنے منہ سے پہلا صاف لفظ بولا تو تحرامہ کو جھٹکا لگا۔ وہ ”بابا“ بول رہا تھا۔ پھر تو یہ اس کا معمول بن گیا۔ وہ بابا بابا کی رٹ لگائے رکھتا۔ ”میرے ساتھ رہتا ہے تمہارا نام لیتا ہے۔ ہمارا بیٹا عماد۔“ یہ جملہ لکھ کر اس نے ویڈیو بنا کر بھیجی تو دل بہت اداس تھا۔ اس نے اس بار یہ بھی نہیں دیکھا کہ میرداد نے سین کیا بھی یا نہیں۔ وہ اب تھکنے لگی تھی۔ میرداد ایک پتھر تھا اور نا چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے امید لگائے بیٹھی تھی۔ جو آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

دن اسی طرح گزرتے رہے۔ تحرامہ نے ندا کے ساتھ بوتیک کے کام میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہ گھر بیٹھے آن لائن سارا کام کرتی۔ عماد اب دو سال کا ہو گیا تھا۔ اب اس کا ایک معمول بن گیا تھا سو تحرامہ کو بھی کچھ وقت مل جاتا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنا ذہن بٹا کر بہت کچھ بھول جانے کی شعوری کوشش میں لگی تھی۔ لیکن یہ کوشش بار آور ثابت نہ ہوتی تھی۔ نو بجے رات کو وہ ٹی وی دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ میرداد اپنے مخصوص انداز میں موجود ہوتا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہتی۔

محبت جو حد سے بڑھ کر تھی۔ جسے نہ پہلے میرداد کا عیب نظر آیا تھا نہ اب اس کی سنگ دلی نظر آئی تھی۔ عماد بھی اس پروگرام پر ماں کی بھرپور توجہ کا عادی ہو گیا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں مما اس کو بھی فراموش کر دیتی تھیں اکثر۔ وہ بھی ٹک کر بیٹھتا تو ٹی وی دیکھ لیتا تھا۔ ایک بار تو جا کر اسکرین پر اپنے ننھے ہاتھ رکھ کر بغور میرداد کو دیکھنے لگا۔ تحرامہ اٹھ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے پکڑتی عماد نے اپنے لب میرداد کے چہرے پر رکھ دیے۔ تحرامہ وہیں ساکت ہو گئی۔ عماد نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کھلکھلا کر واپس آیا۔ اور اپنے کھیل میں مگن ہو گیا۔ تحرامہ سوچ میں پڑ گئی۔ محبت اور خون کی کشش دونوں ہی یکساں طاقتور نظر آئیں۔

☆☆☆

ندا کی این جی اوز کے حوالے سے بھوربن میں ورکشاپ تھی۔ اسے ویسے بھی کام سے تھوڑا آرام چاہیے تھا سو اس نے تحرامہ کو بھی ساتھ چلنے کا کہا۔ تحرامہ خود اکتائی ہوئی تھی۔ سو فوراً تیار ہوئی اور ندا کے ساتھ بھوربن آ گئی۔ بہت دنوں بعد اس نے قدرتی نظاروں میں کھل کر سانس لیا تھا۔

عماد بھی یہاں آ کر بہت خوش تھا۔ ندا صبح سے دوپہر تک ورکشاپ میں مصروف ہوتی اور شام میں ان کے ساتھ مری کی سیر کو نکل آتی۔ موسم چونکہ

زیادہ سرد نہیں تھا اسی لیے عماد کھل کر مستیاں کر رہا تھا۔۔ وہ پارے جیسا بچہ زیادہ دیر تک کر نہیں بیٹھتا تھا۔۔ سو تحرامہ کو اس کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں صبح سے شام کرنا مشکل ہوتا۔ وہ اسے لے کر نیچے آجاتی۔ وہاں عماد زیادہ خوش رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسے لے کر لابی سے گزر رہی تھی کہ ریسپشن پر کھڑے میرداد کو دیکھ کر لمحہ بھر کو پتھر کی ہوگئی۔ وہ چابی لے کر جیسے ہی سیدھا ہوا اس کی نظر بھی تحرامہ پر پڑی۔ لیکن چند سیکنڈز بعد ہی وہ نظر پھیر گیا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی اور ایک مرد بھی تھا۔۔ تحرامہ کو عماد آنچل پکڑے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ عجیب کیفیت میں عماد کے ساتھ باہر گارڈن میں آگئی۔

تین برس بعد اس نے میرداد کو سامنے دیکھا تھا۔ اور اس سے نظریں ہٹانا مشکل ہو رہا تھا اور میرداد نے کیسے تحرامہ سے ایک دم نگاہیں پھیری تھیں۔ اس کا دل اداس ہوگیا۔

"میں خوامخواہ اس شخص کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھ کر بیٹھی ہوں جبکہ اسے تو اپنے بیٹے میں بھی دلچسپی نہیں جو نظر بھر دیکھ لیتا۔" وہ بددل ہو کر سوچتی رہی۔

☆☆☆

تمام شب جاگنے اور آنسو بہانے کے نتیجے میں دوسری صبح تحرامہ کی آنکھیں متورم اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے دوا لی لیکن طبیعت کی سستی رفع نہ ہوئی۔۔ وہ لنچ کمرے میں ہی منگوا لیتی اگر عماد باہر جانے کو نہ مچلتا۔

"مما نیچے"۔ وہ بضد تھا۔ ناچار تحرامہ اس کے ساتھ باہر چلی آئی۔۔ ڈائننگ ہال میں وہ ایک میز منتخب کر کے بیٹھی تھی کہ سامنے میرداد پر نظر پڑی جو ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ تحرامہ کا دل ویسے ہی برا ہو رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر تو ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ عماد کو سوپ پلاتے وہ نا چاہتے ہوئے بھی ادھر دیکھ لیتی۔

میرداد سامنے ہی تھا جبکہ لڑکی کی پیٹھ تحرامہ کی طرف۔۔ آج میرداد تحرامہ اور عماد کو غور سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ لڑکی نے یہ بات نوٹ کی۔ باتیں کرتے ذرا سا پیچھے مڑی اور میرداد کی توجہ کا ماخذ دیکھا۔۔ تحرامہ کو اس بے وفا شخص پر پہلی بار بھرپور غصہ آیا تھا جو اس کی زندگی اجیرن کر کے خود مزے اڑا رہا تھا۔ عماد آدھا ادھورا کھا کر حسب عادت کرسی سے نیچے اتر گیا۔

اب اس کو ہال میں دوڑنا بھاگنا تھا۔۔ ویسے تحرامہ اس کے پیچھے جاتی لیکن آج [illegible] بیٹھی تھی۔ عماد مڑ مڑ کر ماں کو دیکھ رہا تھا۔۔ وہ میز کے پاس جا کر تھوڑی دیر رکتا پھر جیسے ہی لوگ کو پکارتے یا نام پوچھتے وہ دوڑ کر ماں کے پاس آجاتا۔ یہ کھیل اس کے لیے دلچسپ تھا۔۔ اب کی بار وہ میرداد کی ٹیبل کے پاس رکا تھا۔۔ اور پھر جیسے اس کے ننھے ذہن نے اس کا چہرہ پہچان لیا وہ بغور میرداد کو دیکھنے لگا۔ میرداد منہ میں نوالہ لے جاتے وہیں ساکت ہوا۔ عماد نے بانہیں پھیلا لی تھیں۔۔۔ وہ میرداد کی گود میں آنا چاہ رہا تھا۔

میرداد نے فوراً ایک ہاتھ سے اسے اٹھالیا۔۔ عماد اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کھلکھلایا۔ میرداد نے عماد کو سینے سے بھینچ لیا اور بے تحاشہ چومنے لگا۔ تحرامہ نے یہ منظر متحیر ہو کر دیکھا تھا۔ پھر وہ تن فن کرتی اٹھی اور میرداد کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔

"عماد ادھر آؤ۔۔ تحرامہ نے میرداد کے گلے سے لگے بیٹے کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

"نہ نئیں۔" عماد نے گردن نفی میں ہلائی اور میرداد سے لپٹ گیا۔ تحرامہ کا غصہ آسمان چھونے لگا۔

"عماد! مما کے پاس آؤ فوراً۔ وہ بہ زور اس کو میرداد سے چھڑانے لگی تو اس کے بائیں ہاتھ کے ناخن عماد کو چبھ گئے۔۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

"تحرامہ" میرداد نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے میرا بچہ دو۔" تحرامہ نے سرخ چہرے سے کہا۔۔ میرداد نے ہال پر نظر ڈالی لوگ اسی طرف متوجہ تھے۔۔ وہ تھوڑا سنبھل گیا۔

"عماد بیٹا مما کے پاس جاؤ۔" میرداد نے نرمی سے عماد کو خود سے الگ کرنا چاہا مگر وہ اور سختی سے لپٹ گیا۔ اسے باپ کا لمس بھا گیا تھا۔

"تم چلو میں اسے لے کر آتا ہوں۔" میرداد نے رسان سے کہا تو تحرامہ اسے گھورنے لگی۔

"مجھے میرا بیٹا ابھی واپس دو۔ خود غرض انسان۔ تم جیسے شخص کے پاس ایک پل بھی اسے نہیں چھوڑوں گی۔" وہ ضدی لہجے میں پھنکاری۔ میرداد نے گہری سانس لی۔

"بہت ہی بدتمیز عورت ہیں آپ۔۔۔ اور میرداد آپ اتنی بدتمیزی کیوں برداشت کر رہے ہیں۔ اس کا بیٹا اس کو دے دیجیے۔" وہ لڑکی اچانک اٹھ کر بولی تھی۔ تحرامہ نے نفرت انگیز نظر اس پر ڈالی۔

"مجھے بدتمیز کہہ رہی ہو۔ بے حیا تو تم خود کو جو کسی کے شوہر کے ساتھ ڈیٹ مار رہی ہو۔"

"وہاٹ ڈو یو مین۔" لڑکی چیخی۔ "اور تم کیا ہو اپنے بچے کو ٹرین کر کے لائی ہو کہ ہر ٹیبل پر جا کر وہ مردوں کو متوجہ کرے اور تم بہانے سے وہاں پہنچ جاؤ۔" وہ تحرامہ کے سامنے آکر بولی تو تحرامہ اس الزام پر ششدر رہ گئی۔

"ماریہ۔ جسٹ شٹ اپ۔" میرداد نے غضب ناک انداز میں کہا۔

"تم نے مزید ایک لفظ بھی تحرامہ کے خلاف کہا تو اچھا نہیں ہوگا۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔ "لیکن تمہارا کیا واسطہ ہے اس سے۔" لڑکی کو اپنی بے عزتی شدت سے محسوس ہوئی۔

"یہ میری بیوی ہے ماریہ۔" میرداد نے انکشاف کیا تو وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔۔ تحرامہ آنکھوں میں آنسو لیے دوڑتے ہوئے ہال سے باہر آگئی۔ اپنے کمرے میں آکر وہ بیڈ پر گری اور سسکنے لگی۔

دروازے پر مسلسل ہوتی دستک نے اسے اٹھنے پر مجبور کردیا۔۔ بھیگا چہرہ صاف کر کے وہ دروازے تک آئی۔۔ میرداد گود میں عماد کو لیے کھڑا تھا۔ عماد تحرامہ کی طرف لپکا تو تحرامہ نے خفگی سے اسے نظر انداز کیا اور واپس آکر بیڈ پر بیٹھ گئی۔۔ میرداد نے اندر آکر عماد کو گود سے اتارا تو وہ تیزی سے آکر تحرامہ سے لپٹ گیا۔

"اب بچے سے کیوں ناراض ہو۔۔ دیکھو وہ تمہیں کتنا پیار کر رہا ہے۔" میرداد نے عماد کو دیکھا جو ماں کے گال چوم رہا تھا۔

"یہ بھی تمہاری طرح خود غرض ہے۔ پتا نہیں کب مجھے چھوڑ کر کسی اور کا ہو جائے۔" وہ بھاری لہجے میں بولی۔

"نہیں، یہ میرے جیسا نہیں۔ اپنی ماں پر گیا ہے۔ پہلے پیار کرتا ہے پھر فوراً دل سے اتار دیتا ہے۔" میرداد آکر تحرامہ کے پاس بیٹھ گیا۔

"جھوٹے لوگ الزام بھی خوب لگاتے ہیں۔۔ مجھے چھوڑ کر لائف انجوائے کر رہے ہو۔ اور کہتے ہو میں کردار کی کمزور ہوں۔"

تحرامہ کا دل بھرا ہوا تھا۔

سو غصے سے بولی۔

"میں نے کب کہا ایسا؟" وہ معصوم بنا۔ "تم اپنی دشمنی نبھاؤ۔ اپنے انتقام پر قائم رہو۔ یہی تمہاری زندگی کا مقصد ہے۔۔۔ میں اور میرا بیٹا جائیں بھاڑ میں۔"

"یہ میرا بیٹا، میرا بیٹا" کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ واٹس ایپ پر تو ہمارا بیٹا کا کیپشن لگاتی ہو۔" میرداد نے مجسم مسکراہٹ سے کہا۔

"اوہ۔ تو تم نوٹس لیتے ہو۔ بڑی بات ہے۔" تحرامہ نے کلستے ہوئے طنز کیا۔

"تم نوٹس دلوانے کے لیے ہی تو عماد کی تصاویر بھیجتی ہو۔ مجھے عماد کی صورت دکھا کر اپنی یاد میں تڑپانا چاہتی ہو۔" میرداد نے تحرامہ کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"خوش فہمی ہے تمہاری۔۔ تمہارے جیسا منتقم مزاج اور پتھر دل شخص کسی کی یاد میں کیا تڑپے گا۔" وہ خائف ہو کر تھوڑا دور سرکی۔

''سچ کہتی ہو۔ میں واقعی بڑا منتقم مزاج اور سنگ دل ہوں۔ لیکن اب موم کی طرح نرم پڑتا جا رہا ہوں۔'' میر داد پھر قریب آیا تھا۔

''تمہاری اور عماد کی محبت مجھے پگھلا رہی ہے تحرامہ۔'' وہ اس کے کندھے پر بازو پھیلا کر بولا۔ اس کے وجود سے اٹھتی مخصوص خوشبو نے تحرامہ کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔

''اونہہ منہ دیکھے کا پیار۔ اتفاق سے ہم سامنے نظر آ گئے تو محبت جھاڑ رہے ہو۔''

تحرامہ خود کو سنبھال کر اس کا ہاتھ کندھے سے ہٹایا۔

''تحرامہ! میں واقعی صلح چاہتا ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ جو زیادتیاں کی۔ ان پر بہت شرمندہ ہوں۔ قصور تمہارا بھی نہیں تھا۔ بس مجھ پر بدلے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ حالانکہ تمہیں خود سے دور کر کے میں بھی چین سے نہیں رہا۔ چاہے تم یقین کرو یا نہ کرو۔ میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ میرا گمان غلط تھا۔ نفرت محبت پر کبھی حاوی نہیں ہو سکتی۔'' میر داد نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

''مجھے معاف کر دو پلیز۔'' اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ تحرامہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند چھانے لگی۔۔ اس نے اپنے ہاتھ پر رکھا میر داد کا ہاتھ دھندلائی آنکھوں سے دیکھا۔۔ ذہن کے پردے پر گزرے تین سالوں کی اذیت گھوم گئی۔ بے چینی کا ایک ایک لمحہ۔۔ بے یقینی کا ایک ایک پل۔۔۔ کبھی کبھی معاف کرنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اچانک دو ننھے ننھے ہاتھ تحرامہ اور میر داد کے ہاتھوں پر آ ٹھہرے۔

''مما۔'' میٹھی سی آواز گونجی۔۔ تحرامہ اور میر داد نے بیک وقت عماد کو دیکھا جو اب دونوں کے ہاتھوں پر زور زور سے اپنے ہاتھ مار رہا تھا۔ اس کی معصومیت پر دونوں کے دل پگھلے۔ قصور ان دونوں میں سے کسی کا بھی تھا۔۔ لیکن سزا صرف عماد کو مل رہی تھی۔ وہ والدین کی علیحدگی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل بھگتنے کو اکیلا تھا۔

اس کو باپ کی شفقت کی ضرورت تھی۔ اور ماں کی ممتا کی بھی۔

وہ دونوں کے ہوتے ہوئے کیوں احساس محرومی کا شکار رہتا۔ میر داد اور تحرامہ کی سوچ ایک نہج پر تھی۔

''بولو تحرامہ! مجھے معاف کر دیا نا۔''

میر داد امید سے اسے دیکھا۔ تحرامہ نے ہلکا سا سر اثبات میں ہلایا۔ میر داد ایک دم خوش ہو گیا۔

''بہت شکریہ تحرامہ۔ اب میرا وعدہ ہے کہ زندگی میں آئندہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں تمہیں اور عماد کو اتنا پیار دوں گا اتنا کہ۔''

''پہلے تمہارے ساتھ وہ لڑکی کون تھی۔'' میر داد کی بات آدھی رہ گئی تحرامہ نے مشکوک لہجے میں پوچھا تھا۔

''وہ تو میری ایک کولیگ ہے۔''

''نیوز سیکشن میں ہوتی ہے۔'' میر داد نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

''میڈیا میں رہنے کا یہ مقصد نہیں کہ تم لڑکیوں کو ساتھ لے کر گھومتے رہو۔ یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں۔'' تحرامہ نے بیویوں والا رعب جھاڑا تو میر داد نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

''اچھا سرکار۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔'' اس نے اپنے کان پکڑ لیے۔ عماد یہ دیکھ کر کھلکھلایا۔ تحرامہ بھی لب دبا کر مسکرا دی۔ کڑی دھوپ کا سفر تمام ہوا تھا۔ اب اسے ہمیشہ محبت کی چھاؤں میں رہنا تھا۔

نوشین فیاض

زیر طلب

دروازہ کھول کر اس نے اندر جھانکا۔ سجی سنوری روبی دلہن کے روپ میں اس کے سامنے تھی۔ روبی پر نظر پڑتے ہی وہ جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔

خوب صورت تو وہ پہلے بھی کم نہیں تھی لیکن ولیمے کی دلہن کی تو چھب ہی الگ ہوتی ہے۔ سحر زدہ ہو کر وہ بے اختیار اندر آیا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر امیر کی طرف دیکھا۔

"چلیں؟" آئینے کے سامنے وہ عین اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہوا تو جیسے شفاف پانی کی سطح پر تصویر بن گئی۔

"ایسا کرتے ہیں یہیں رہ جاتے ہیں۔ بس تم اور میں......"

"اور ولیمہ۔ آپ جانتے ہیں، جانا پڑے گا امیر! آپ پھول نہیں لائے اور پھر" کچھ کم ہے" کر کے تنگ مجھے کریں گے۔" اپنے مخصوص انداز میں کہتے وہ اس کی طرف مڑی۔ وہ جانتی تھی کہ امیر پھولوں سے اس کی گہری دلی وابستگی جانتے ہوئے آج کے اہم موقع پر پھول لانا بھول ہی نہیں سکتا۔

ان کے تعلق کے بعد پہلی سالگرہ پر امیر نے جیسے اسے پھولوں میں تول دیا تھا۔ اور صرف پہلی بار ہی کیوں ہر بار اور ہر اہم موقع پر وہ امیر کے دیے پھولوں پر سوتی تھی۔

"جتنی خوب صورت ہو، اس سے کہیں ظالم ہو۔ چاہتا ہوں اور خوب صورت اور ظالم ہو جاؤ اس لیے پھول لینے جا رہا ہوں۔" اس کی بندیا چوم کر وہ میک اپ روم سے باہر نکل آیا۔

دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ روبی عمر میں امیر سے چند سال بڑی لیکن تھی بے حد خوب صورت۔ دونوں ایک اکیڈمی میں پڑھتے تھے۔ روبی لڑکوں میں نک چڑھی اور مغرور کے نام سے مشہور تھی۔

پہلے پہل تو امیر اسے دیکھتا اور پھر دیکھتا رہتا۔ اس کی خواہش بس یہیں تک تھی۔ پھر محبت بڑھی تو اس نے ہزار جتن کر کے نمبر حاصل کیا، پھر لاکھ جتن کر کے اس سے بات کی اور کروڑ جتن کر کے محبت کا یقین دلایا اور پانے کے لیے تو شمار کی حد سے نکل کر جتن کیے۔

والدین کی اکلوتی اولاد۔ امیر نام کا ہی نہیں دھن دولت کا بھی امیر تھا۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی وہ لڑکی جس کا واحد اثاثہ اس کی ذات تھی، اس کی خوب صورتی اور اس کی ڈگریاں تھیں بمعہ عمر میں زیادہ ہونے کی وجہ سے امیر کے والدین کے لیے ناقابل قبول تھی۔

امیر نے دس سال لگا دیے تھے انہیں منانے میں اور ضد کی پکی تو وہ بھی تھی جو دس سال تک امیر کی زبان پر بھروسا کر کے بیٹھی رہی تھی۔ ابھی پچھلے ماہ ان دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ ایک ماہ کینیڈا میں گزار کر وہ دو دن پہلے ہی واپس آئے تھے اور آج ان کے ولیمے کا فنکشن تھا۔

اس ایک مہینے کی رفاقت نے امیر کی محبت اور جنون کو مزید بڑھایا ہی تھا ———— روبی کو پا لینے کے بعد بھی اس کی محبت سیراب نہیں ہوئی تھی۔ جتنا وہ اس کے قریب گئی اس کے اندر محبت کی آگ بھڑکتی ہی جا رہی تھی۔ جانے کیوں ایسا لگتا تھا کہ ابھی تک وہ اس کی ذات، اس کے دل تک رسائی حاصل نہیں کر پایا تھا۔ جیسے وہ کل بھی اس کے لیے ناقابل تسخیر تھی اور آج بھی اسے مل کر نہیں ملی۔ شاید سب محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

پھولوں سے بھرے شاپر اٹھا کر پارلر کی سیڑھیاں چڑھتے وہ اپنی دیوانگی پر مسکرا رہا تھا۔ میک اپ روم کی دیوار کے ساتھ چلتے اس نے کھلی ہوئی گلاس ونڈو سے اندر جھانکا۔

رشنا روبی کے گلے لگی کھڑی تھی۔ رشنا وہ دعا تھی جس نے غیبی ہاتھ بن کر قدم قدم پر ان کی مدد کی تھی۔ روبی کی کلاس فیلو اور ان دونوں کی دوست، رازدار۔ روبی کو ہال میں لے جانے کے لیے امیر نے ہی اسے یہاں بلایا تھا۔

"اللہ۔ روبی پہچانی نہیں جا رہیں تم تو۔ امیر کے پیار کا رنگ تمہیں اتنا بدل دے گا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

اس سے الگ ہوتے رشنا نے کہا تو اس نے ایک مسکراتی نظر آئینے پر ڈالی۔ اس کی یہ مسکراہٹ امیر کے قدموں کی زنجیر بن گئی۔ وہ جہاں تھا وہیں زمین میں گڑ گیا۔ پہلی نظر سے اب تک اس نے اس مسکراہٹ کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔

"جسے تم محبت کے رنگ کا بدلاؤ کہہ رہی ہو، وہ سب پیسے کا کمال ہے۔" وہ ہنسی۔

امیر نے چونک کر اس کی ہنسی دیکھی۔ آج پہلی بار وہ اسے ایک جیتی جاگتی جذبوں سے بھرپور لڑکی لگی تھی ورنہ وہ جب بھی ہنستی بولتی تھی، اس کے انداز میں ایک تکلف سا ہوتا تھا جسے ـــ اتنے عرصے وہ اس کی ذات کا خاصہ سمجھ بیٹھا تھا۔

"اس پارلر کے بارے میں جانتی ہو؟ یہاں اداکارائیں تیار ہوتی ہیں۔ امیر نے پورا پارلر آج صرف میرے لیے بک کروایا ہے۔ یہاں کا میک اپ۔ جانتی ہو، کس کلاس کا ہوتا ہے؟ میرا یہ ولیمے کا ڈریس۔ لاکھوں میں قیمت ہے اس کی اور ہاں۔ یہ......" اس نے گلے میں سجے نفیس ہار کو نزاکت سے چھوا۔ "اصلی ہیرے جڑے ہیں اس میں۔ میرے جوتے کی قیمت میں تو ہمارے طبقے کی لڑکی کا شادی کا جوڑا آ جاتا ہے اور تمہیں ابھی بھی یہ محبت کا رنگ نظر آتا ہے۔ ہاؤ سلی۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "محبت میں یہ سب نہیں ہوتا۔ کوئی رنگ روپ نہیں رہتا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر امیر کا انتخاب کیا تھا اور دیکھ لو، وقت نے ثابت کر دیا میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔"

بہت وقت کے بعد اسے کھل کر بولنے کا موقع ملا تھا۔ اپنی جیت کا جشن منانے کا موقع ملا تھا۔ سو اپنی جیت کے نشے میں وہ بولتی جا رہی تھی۔

"میں جانتی تھی، سیرت سے زیادہ صورت میں متوجہ کرنے اور تسخیر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اسی لیے میں نے خود کو ہمیشہ سجا کر، سنوار کر رکھا۔ میں جہاں رہی ہوں، ہمیشہ لوگوں کے حواس پر چھائی رہی ہوں لیکن میں نے بھی کسی کو اپنی ذات پر حاوی ہونے نہیں دیا کیونکہ مجھے محبت نہیں چاہیے تھی۔ ضرورتیں فقیروں کی بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں۔ مجھے اپنی خواہشیں پوری کرنی تھیں۔ تب ہی تو اتنے دیوانوں میں امیر میرا منظور نظر ٹھہرا۔ تم جانتی ہو، امیر میری سوچ سے بھی زیادہ امیر ہے۔ اس کی کلاس کا اندازہ مجھے اس کے ساتھ گزارے اس ایک ماہ میں ہو گیا ہے۔ اپنے اس انتخاب پر میں ہمیشہ خود کو چاہوں گی۔" بات ختم کر کے اس نے صوفے کی پشت پر سر ٹکا لیا۔

"اور امیر کو؟"

"تم ابھی تک محبت پر اٹکی ہو؟ محبت کیا ہوتی ہے بی بی؟ وہ مجھ سے پیار جتاتا ہے تو میں پیار سے جواب دیتی ہوں۔ اسے خود پر اختیار دیتی ہوں، اس کی خوشی کے لیے اپنی نیند قربان کر کے وقت بے وقت دو چار میٹھی باتیں کر لیتی ہوں۔ ابھی محبت کی کمی رہ گئی ہے کیا؟ ویسے بھی......" اس کی طرف جھک کر اس نے رشنا کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں کروں یا نہ۔ تم تو کرتی ہو نا اس سے محبت؟"

رشنا نے سر جھکا لیا۔ اب کی بار روبی کا قہقہہ بڑا جان لیوا تھا۔ "محبت اس کی طلب نہیں۔ اگر ہوتی تو اتنے سالوں سے میرے پیچھے خوار نہ ہو رہا ہوتا بلکہ تمہاری محبت جان لیتا اور "تم" سے محبت کرتا۔ پر ایک عام سی لڑکی کی محبت کا وہ کرتا کیا؟" وہ پھر ہنسی۔

امیر نے ان گنت بار روبی کی اس خالص ہنسی کی خواہش کی تھی اور اب جب وہ بات بے بات ہنس رہی تھی تو اسے اپنے بائیں پہلو میں درد کا، چبھن کا احساس ہو رہا تھا۔ بہت مشکل سے سہی پر اس نے غلط وقت پر صحیح فیصلہ کر لیا تھا۔ زہر تھا تو کیا۔ پینا تو پڑنا تھا۔ تب ہی ہر سچ ایک جھٹکے میں پی کر اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔

"السلام علیکم۔ کیسے ہو امیر؟"

رشنا کے بشاش لہجے پر وہ اس کے صبر کا معترف ہوا تھا۔ جانے کب سے وہ یہ زہر پی رہی تھی جب ہی لمحہ بھر میں خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ کچھ بول نہیں پایا۔ اپنی دھن میں اس نے اس خاموشی کو محسوس بھی نہیں کیا۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری جوڑی ہے آپ دونوں کی۔"

"مجھے ہمیشہ لگتا تھا کچھ کم ہے اور آج جب میں نے وہ کمی پکڑ ہی لی ہے تو میں اسے ختم کر کے آتا ہوں۔ ڈرائیور کو فون کر رہا ہوں تم دونوں ہال میں چلی جانا۔ مجھے وقت لگے گا تمہارے تحفے کی تیاری میں۔"

رشنا کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اس نے ایک آخری بار روبی کو پہلو سے لگایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے اس نے گزرے ماہ و سال اردگرد رقص کرتے دیکھے تھے۔

"دیکھا۔ اتنا سب کر کے بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ مان لو، محبت ہمیشہ قربانی مانگتی ہے۔ جیسے تم نے امیر کی محبت میں اپنا آپ دان کر دیا اور آج خالی ہاتھ، خالی دل کھڑی ہو۔"

"نہ میرے ہاتھ خالی ہیں نہ میرا دل۔" رشنا نے اس کی بات کاٹی۔

"اوہ پلیز۔ میں امیر نہیں ہوں جسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم نے اس کی محبت، اس کی رضا کے لیے اپنی خواہشیں، اپنا دل قربان کر دیا اور یہ موت ہی تو ہے۔ اس کے علاوہ محبت کی حقیقت کچھ بھی نہیں اور تم چاہتی ہو میں بھی محبت کرتی اور کسی مڈل کلاس عاشق سے محبت میں شادی کر لیتی۔ پھر ساری زندگی محبت کے نام پر ضرورتوں اور خواہشوں پر سمجھوتا کرتی رہتی۔ محبت کچھ بھی نہیں لٹل گرل۔ دیکھو اگر تمہارے والدین ترکے میں تمہارے لیے دولت چھوڑ جاتے تو آج تم ماموں، پھوپھو کے گھر ان کے ٹکڑوں پر نہ پل رہی ہوتیں۔ تمہاری اپنی ایک پہچان ہوتی، کلاس ہوتی۔ تب شاید امیر تمہیں اتنی آسانی سے نظر انداز نہ کر پاتا۔"

اندر سے آتی آوازوں نے امیر کے لیے وہاں کھڑے رہنا محال کر دیا تھا۔ اسے رشنا کی برداشت پر حیرت ہو رہی تھی۔

☆☆☆

ولیمے کے فنکشن میں امیر نہیں آیا تھا۔ اس کا ابھی تحفہ تیار نہیں تھا۔ ایک دنیا اس کی روبی کے لیے دیوانگی سے واقف تھی سو کوئی مسئلہ نہیں بنا۔ یوں بھی اس جگہ تک آنے کے لیے روبی نے جو کچھ سن لیا تھا، اس کے بعد اب جب وہ سب حاصل کر چکی تھی تو ان باتوں کی اہمیت یوں ہی ختم ہو جاتی تھی۔

ولیمے کے بعد وہ اپنے گھر جانے کے بجائے امیر کے گھر ہی آ گئی تھی۔ امیر کا پاگل پن اس کے حسن کی سب سے بڑی زیبائش تھا۔ اس کے بغیر وہ کیسے گھر جا سکتی تھی۔ کامدانی دوپٹہ اتار کر اس نے بیڈ پر ڈال دیا اور شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کا حسن بلاخیز تھا جسے مہنگے پارلر سے ہوئے میک اپ نے دو آتشہ کر دیا تھا۔ یوں ہی تو امیر اس کا دیوانہ نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنے حسن کا خراج چاہیے تھا۔ اس لیے مخملی صوفے پر بیٹھ کر اس کی آرام دہ پشت پر سر ٹکائے اس کا انتظار کرنے لگی۔ اسی انتظار میں وہ نیند کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔ یہ اس کی زندگی کی آخری پرسکون نیند تھی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی تھی۔ مخملی رات کے سرکتے لمحے بتا رہے تھے کہ اب سحر ہونے کو ہے۔ وہ حیران تھی۔ امیر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ دل میں ہزار وسوسے سر اٹھانے لگے تھے۔ اس نے جھٹ فون نکال کر اس کا نمبر ملایا۔ نمبر بند تھا۔ خوف نے دل پر پہلا پنجہ مارا تھا۔

یہ گھر امیر نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ اس محل نما گھر میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا سو اسی لباس میں اٹھ کر اس نے اپنے لیے کافی بنائی۔ صبح ہوئی، دن ڈھلا، پھر رات آئی، گزر گئی لیکن امیر نہیں آیا۔ امیر کے گھر والوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا اور اپنے گھر وہ کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی زندگی میں وہ کبھی خود سے اتنی لاپروا نہیں رہی تھی جتنی ان دو دنوں میں رہی تھی۔ کچھ نہ کرتے بھی اسے آئینہ دیکھنے کا دھیان نہیں رہا تھا اور جب آئینے پر نظر پڑی تو وہ خود حیران رہ گئی۔ الجھے بکھرے بال، متورم آنکھیں اور ملگجا حلیہ۔ وہ دو دنوں میں ہی اپنی عمر سے کہیں بڑی نظر آنے لگی تھی۔ ہار سنگھار کے سب لوازمات موجود تھے تو پھر اس نے خود پر دھیان کیوں نہیں دیا۔ امیر اس کے لیے اس کے روپ سے بڑھ کر اہم ہو گیا تھا؟ کیا وہ سچ میں امیر کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔

اس خیال نے اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو سجاتی سنوارتی، ڈور بیل نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ تیزی سے وہ باہر بھاگی۔ اس کا کوریئر آیا تھا۔ اس نے بے تابی سے پیکنگ کھولی۔ سب سے پہلے نکلنے والی چیز امیر کا خط تھا۔

"جان امیر حق مہر کے پچاس لاکھ، پچاس تولے سونا اور اس کوٹھی کے کاغذات تمہارے نام کر کے دے رہا ہوں۔ یقین ہے تمہیں خوشی ہو گی۔"

اس کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب امیر اس کا تھا اور امیر کا سب اس کا تھا تو حق مہر ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے مزید پڑھا۔

"گزشتہ ایک ماہ میں میں نے اپنی زندگی کی ہر خوشی پالی ہے۔ اب مزید کسی خوشی کی نہ خواہش ہے نہ ضرورت۔ ویسے بھی میں خوشی بھی پا سکوں یا نہ سکوں، سکون ضرور حاصل کر لوں گا کیونکہ میں نے محبت پالی ہے۔ رشنا کے ساتھ اپنی زندگی شروع کرنے جا رہا ہوں۔ کہاں یہ میں بھی نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ پرواز ہی پھر وہ تب بھی میرے پاؤں کی دھول تک نہیں پا سکو گی۔"

ابھی تو اسے ادراک محبت ہوا تھا۔ اعتراف باقی تھا، اظہار باقی تھا۔ دو دن پہلے یہ سب ہو گیا ہوتا تو محبت کی چوٹ سے بچ جاتی شاید۔ لیکن محبت اپنے ساتھ کھیلنے والوں کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا کرتی۔ کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا تھا۔

☆☆☆

دور فضاؤں میں اڑتے جہاز کی سیٹ پر امیر کے کندھے سے سر ٹکائے رشنا سوچ رہی تھی محبت کیسی انوکھی اور خوب صورت شے ہے۔ ولیمے کے فنکشن کے دوران اسے امیر نے فون کر کے بلایا تھا اور جب اس نے پارک کے سب سے تاریک گوشے میں اس سے کہا۔

"میں مرتے دم تک روبی سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتا اور سچ یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ رہ بھی نہیں سکتا۔ ہاں میں خود غرض ہوں جو یہ سوچ رہا ہوں کہ تم مجھے سمیٹ کر رکھ سکتی ہو لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں تمہارے علاوہ یہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اگر میں تمہیں آدھا ادھورا قبول ہوں تو میرے ساتھ چلو۔"

تب اس نے اس اندھیرے سے اپنی زندگی کے سارے جگنو چن لیے تھے۔ محبت بار بار کسی در پہ دستک نہیں دیتی۔ اس لیے اس نے دیر نہیں کی۔ محبت تو اس نے امیر سے تب بھی نہیں چھوڑی تھی جب وہ روبی کا ہو چکا تھا تو اب کیسے چھوڑ دیتی جب وہ اس کا رہا ہی نہیں تھا۔ اسے یقین تھا وہ اپنی محبت سے امیر کو پورا کر لے گی۔ محبت کالا جادو تو نہیں جو فوراً اثر کرے۔ یہ مقدس راتوں میں مانگی گئی اس دعا کی طرح ہے جو چاہے تو تب ہی قبولیت کی سند پا لے یا پھر انتظار کی سولی پر چڑھا دے اور کبھی بھی مرتے دم تک پیاسا رکھے۔ اس کی محبت دیر سے قبول ہوئی تھی اور امیر مقبول دعا کے بعد بھی پیاسا رہ گیا تھا۔ اسے اب امیر کو اپنی محبت سے سیراب کرنا تھا۔ اسے یقین تھا وہ ایسا کرے گی۔

حیا بخاری

جس دن اسے رہنے دو

سرسبز لہلہاتے کھیتوں کے بیچوں بیچ لال اینٹوں سے بنے اس شان دار مکان پر موت کا سا سکوت طاری تھا۔ حالانکہ اس گھر کے بڑے بیٹے کو فوت ہوئے دو ماہ سے اوپر ہو چکے تھے لیکن ایسا سکوت تو اس وقت بھی نہ چھایا تھا جب اس کا جنازہ اس گھر سے رخصت ہوا تھا۔ آج نہ جانے کیوں عجیب سی دل ہولا دینے والی خاموشی پھیلی ہوئی تھی اس گھر کی فضا میں۔

مصطفیٰ جمال مروت کو زندگی میں پہلی بار گھر کے اندر قدم رکھتے ہوئے نہ جانے کیوں عجیب سا احساس ہوا، کچھ کھو دینے کا۔ کسی بہت بڑے نقصان ہو جانے کا۔

وہ پٹھان تھے۔ پٹھان قوم کی یہ خاصیت ہے کہ ان کا اللہ پر اعتقاد بہت پختہ ہوتا ہے اور ان کا پکا ایمان ہوتا ہے کہ ہر چیز اللہ پاک کی ہے اور ہر چیز کو اسی کی طرف کبھی نہ کبھی لوٹ کر جانا ہے۔ اسی لیے یہ لوگ نہ تو موت سے ڈرتے ہیں اور نہ ہی کسی اپنے کی موت پر زندگی کو ختم تصور کرتے ہیں۔

مصطفیٰ جمال مروت بھی ایسے ہی تھے۔ بڑے بھائی کی موت نے انہیں صدمہ ضرور دیا تھا مگر یہ

مکمل ناول

ہمت اور حوصلہ بھی دیا تھا کہ اب وہی اپنے گھر کے سربراہ تھے اور اپنے خاندان کے لیے اب جو بھی کرنا تھا، ان کو کرنا تھا۔

تب ہی بھائی کو کندھا دیتے وقت بھی انہیں یہ خلا محسوس نہیں ہوا تھا۔ جو آج گھر کی چوکھٹ پار کرتے وقت انہیں یک لخت گھیر گیا تھا۔ انہوں نے کندھوں پر دھری سفید چادر اتاری اور کچے پکے صحن کو عبور کرتے برآمدے میں آ گئے۔

"بہت دیر کر دی آپ نے؟" نگینہ نے سلام کرتے ہوئے انہیں پانی کا گلاس تھماتے ہوئے پوچھا۔

"آج زمینوں کے سلسلے میں کچہری جانا تھا۔ لالا نے ایک دو لوگوں پر شوفا (مقدمہ) کر رکھا تھا، بس وہیں دیر ہو گئی۔" انہوں نے پانی پیتے ہوئے گھر کے صحن میں لگے برگد کے گھنے درخت کے اس پار دم توڑتی سورج کی کرنوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"عرف کہاں ہے؟" ان کا سوال سن کر نہ جانے کیوں نگینہ بری طرح گڑبڑائی تھیں۔

"کیا ہوا؟" انہوں نے فوراً پوچھا۔

"کچھ نہیں خان جی۔ بس یوں ہی۔"

"عرف کہاں ہے پھر۔" انہوں نے سوال دہرایا۔

"نیا نیا صدمہ ہے خان جی! ازرغو نے بھی اسے خود سے لپٹائے کمرے میں ہی بند رہتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں بہل جائیں گی۔ آپ کے لیے کھانا لاؤں؟" انہوں نے فوراً بات بدلی۔

"نہیں۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ اب بس رات کا کھانا ہی کھاؤں گا۔ میری گرم چادر لے آؤ اندر سے۔" انہوں نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ پھر کہیں جانا ہے کیا؟" وہ گلاس اٹھاتے ہوئے بولیں۔

"ہاں۔ بیٹھک پر محفل کا پروگرام ہے، ثوبت کا بھی۔ تو کھانا وہیں کھاؤں گا۔ تم چادر لے آؤ، میں تب تک وضو کر لوں۔ نماز ادا کرنے کے بعد ہی جاؤں گا بیٹھک۔" نگینہ کو کہہ کر وہ صحن میں لگے نلکے کی طرف بڑھ گئے، وہ سر ہلا کر اندر چلی گئیں۔

☆☆☆

کمرے میں جس قدر تاریکی نے ہولناکی پیدا کر رکھی تھی۔ اتنی ہی سیلن زدہ تیز بو نے سانس لینا دشوار کر رکھا تھا۔

"امی! یہ کمرا کس کا ہے؟" دس سالہ بچی نے اندھیرے میں ہاتھوں سے ماں کا چہرہ محسوس کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ نہ جانے کیوں آج پھر اسے ماں کے گال نم محسوس ہوئے تھے، مگر آج وہ ان آنسوؤں کو دیکھ نہیں سکتی تھی۔

"آپ پھر رو رہی ہیں امی؟" وہ پہلا سوال بھلا کر پوچھنے لگی۔

"نہیں تو بیٹا۔" انہوں نے تیزی سے چہرہ رگڑا، دوپٹے کے پلو سے۔

"امی! بابا نہیں رہے تو کیا ہوا؟ خان بابا تو ہیں نا ہمارے ساتھ۔" بچی نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں ماں کا چہرہ تھاما اور اس کی ماں کو بس یہی ڈر تھا۔ اس کی بیٹی اپنی عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ سمجھ دار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رویوں تک کو بھانپ لیتی تھی اور اسی چیز سے وہ خوف زدہ تھیں۔

"گل پرو...... سو جاؤ، مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ جانتی تھیں صرف ان کی نیند اور آرام جو ان کی گل پری کے لیے بہت معنی رکھتا تھا، اس وقت اس معصوم بچی کا ذہن بدل سکتا تھا۔

"جی امی!" اور واقعی وہ فرماں برداری سے لیٹ گئی تھی۔ ماں نے اس کے ساتھ لیٹتے ہوئے اسے خود میں چھپا لیا تھا۔

"گل پری! تمہیں نیند آ جائے گی نا یہاں؟" ان کا لہجہ نم تھا۔

"امی! ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ پھر کل صبح ہوتے ہی خان بابا سب ٹھیک کر دیں گے۔" اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ واقعی نیند کے خمار سے بوجھل تھا۔

"پھر امی۔" اس کے نرم کومل سے لب ان کے رخسار چھو گئے۔

"امی جہاں آپ ہوتی ہیں۔ وہاں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔" سوتے سوتے وہ ان کے کان میں جیسے پیار بھرا "نوحہ" گھول گئی تھی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو چھلکے اور ان کے گھنے بالوں میں جذب ہو گئے۔ دسمبر اور بھیگنے لگا تھا۔

☆☆☆

بیری کے اونچے تنومند درخت سے لٹکتا جھولا بالکل موسم کی طرح لہک رہا تھا۔ صبح سے چلتی ٹھنڈی تیز ہوا نے گرمی کی حدت کو مات دے دی تھی اور وہ جھولے پر بیٹھی جیسے ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ریس لگانے کے لیے تیار تھی۔

"آپی! ہمیں بھی جھولا دو نا۔" پانچ سے سات سال کی درمیانی عمر کی لڑکیاں بیریاں کھا کھا کر اکتا چکی تھیں، سو اب ان کو بھی جھولا چاہیے تھا۔

"یار! تم لوگ کیا کرو گے جھولا جھول کر۔ وقت ضائع ہوتا ہے ایسے بے کار کاموں میں۔" اس نے مزید اونچا اڑنے کے لیے پاؤں زمین پر مارے اور اس کے کھلے کالے بال ہوا میں لہرا سے گئے۔

"آپی! ابھی تو ہم کہہ رہے ہیں کہ آپ کا ٹائم بہت ضائع ہو گیا۔ اب جھولے سے اتر بھی جائیں۔" یہ بارہ سالہ شانزہ تھی۔ بے حد شریر اور ذہین۔ اس کی بات پر وہ دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

"میری تو اچھی باتیں سیکھنے کی عمر گزر گئی نا۔ تمہاری عمر میں، میں تھوڑی نا ایسے وقت ضائع کرتی تھی۔" اس نے جھولے کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے دونوں بازو رسیوں کے گرد سے نکال کر گود میں دھر لیے۔

"تو پھر ہمیں بھی اچھی باتیں سکھائیں نا۔ یوں بیری کھا کھا کے تو ہم تین چار دن تک کچھ کھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔" شانزہ آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھی، اسے اندازہ ہو گیا تھا۔

"اچھا یار! بیٹھ جاؤ تم لوگ۔" وہ ہاتھ جوڑتی جھولے سے نیچے اتر آئی۔ بچیاں ایک ساتھ جھولے پر پل پڑیں۔ وہ ان کو الجھتا چھوڑ کر اس طرف آ گئی، جہاں پرانا کنواں تھا۔ کنویں کے پکے کونے اب جگہ جگہ سے اکھڑنے لگے تھے۔ جب سے ٹیوب ویل کا دور آیا تھا، یہ جگہ ویران ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی چند بزرگ اس پرانے کنویں کے پاس، گھنے پیڑوں کے سائے تلے چارپائیاں بچھاتے اور پرانی یادیں تازہ کرتے۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی کنویں کے قریب آ گئی۔ یہاں ہوا نسبتاً زیادہ ٹھنڈی تھی۔ کنویں کے اردگرد خودرو گھاس تھی۔ اس نے چپل اتار دی اور ننگے پیر ٹھنڈی گھاس پر چلنے لگی۔ تھوڑی دور جا کر وہ کھجور کے درخت تلے پڑے بڑے سے پتھر پر بیٹھ

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

ملالِ ذات
آمنہ ریاض

قیمت -/300 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

تی۔ پچھلے دس سالوں سے یہ پھر، یہ درخت اور یہ منظر اس کے بہترین دوست تھے۔ اس کی نظریں سامنے کنویں پر جمی تھیں۔ جس پر لگے رہٹ کے لوہے کو زنگ لگ چکا تھا۔ کنویں کا پانی چھوٹے تالاب اور پھر کھیت تک پہنچانے والی پختہ نالیاں شکست و ریخ کے عمل سے گزر رہی تھیں۔ سب منظر سادہ تھے، سب کچھ بوسیدہ تھا وہاں۔

اور پھر اچانک ہی منظر بدلا تھا۔ وہ نو، ساڑھے نو سال کی ننھی سی پری تھی جو جھولے سے اتر کر بابا، بابا پکارتی ادھر ہی دوڑی چلی آرہی تھی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھے گئی، اس سے پہلے کہ وہ لڑکی اس کے قریب آتی، کنویں کے بالکل پاس اسے کسی کے مضبوط ہاتھوں نے اچک لیا تھا۔

''بابا۔'' وہ کھلکھلائی تھی۔

''گل پرو! بابا کی جان۔'' تیل لگے کالے بالوں میں سیدھی مانگ نکالے وہ خوب صورت چہرے والا نوجوان اسے بانہوں میں لیے آنکھیں بند کر کے جھوم گیا۔

تب ہی اس نے دور سے ایک اور مضبوط جسم کے مالک آدمی کو اپنی طرف آتا دیکھا تھا۔

''عرف! کتنی بار منع کیا ہے کنویں کی طرف نہ آیا کرو۔'' اس نے محبت سے اس بچی کے گال چومتے ہوئے کہا تھا۔ وہ تینوں خوش تھے، مسکرا رہے تھے۔

''عرف!'' کسی نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔ سامنے ہی اس کے خان بابا تھے، اس مضبوط آدمی سے بالکل مختلف، کمزور اور شرمندہ سے۔

''کتنی بار منع کیا ہے بیٹا! کنویں کی طرف مت آیا کرو۔'' عرف کے گال پر بہتے آنسو دیکھ کر وہ نظریں چرا گئے تھے۔ عرف نے تیزی سے اپنے گال صاف کیے۔

''میں خود نہیں آتی خان بابا! نہ جانے کون سی طاقت مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے۔'' وہ ابھی تک اسی منظر کے حصار میں تھی۔

''میں جانتا ہوں بیٹا! کچھ لوگ ہماری زندگی ہوتے ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے بیٹا کہ ......'' وہ ایک لمحہ کے لیے رکے۔ پھر اسی سمت دیکھنے لگے جس طرف عرف دیکھ رہی تھی۔

''زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور ہوتا ہے جو ہماری بے معنی زندگی کو بھی قیمتی بنا دیتا ہے۔ اس لیے ہمارا آگے بڑھ جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔ سب کچھ بھلا دو بیٹا، اپنی ماں کے لیے ہی سہی۔'' انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ دھیرے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پتا ہے خان بابا!'' اس نے دوپٹے سے سر کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس کی خوب صورت شہری آنکھوں میں نمی تھی۔

''انسان مر جاتا ہے ...... یادیں نہیں مرتیں اور پھر ہمارے پاس بس دو چیزیں بچتی ہیں خان بابا! ایک صبر اور دوسری تڑپ۔

صبر ہمارے اختیار میں ہے اور تڑپ پر ہمارا کوئی بس نہیں چلتا اور آپ جانتے ہیں خان بابا؟'' اس نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس بس یہی دو چیزیں ہی بچی ہیں۔'' وہ وہاں سے چلی گئی اور خان بابا دیر تک وہ منظر کھوجنے کی کوشش کرتے رہے، جو صرف عرف جیسی کمال مروت کو نظر آتا تھا۔

☆☆☆

''آیان کہاں ہے؟'' بلیک مرسڈیز سے قدم باہر دھرتے ہی انہوں نے پریشان لہجے میں پوچھا تھا۔ نجمہ جو پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھی۔ پائپ پھینک کے دوپٹے سے گیلے ہاتھ پونچھتی تیزی سے ان کی طرف بھاگی۔

''کیا ہوا گل بی بی! خیریت تو ہے نا۔'' ڈرپوک سی نجمہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے، جب دیکھو ڈر کے مارے کانپ رہی ہوتی ہو۔'' انہوں نے اس کی کمزوری پر ماتھا پیٹا اور اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں، نجمہ ان کے پیچھے تھی۔

''آیان کہاں ہے؟'' اندر داخل ہوتے ہی پہلا ٹکراؤ نظام الدین سے ہوا تھا۔

''کیا ہوا گل بی بی۔'' انہوں نے نظام الدین کو گھورا تھا۔

''آیان بچہ اپنے کمرے میں ہے۔'' نظام الدین نے فوراً جواب دیا۔ گل بی بی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ نجمہ ان کے پیچھے ہی تھی اب تک۔

''گل بی بی! ہوا کیا ہے؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟'' نجمہ نے ہانپتے ہانپتے سوال کیا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق گل بی بی نے جواب نہیں دیا۔ گل بی بی بنا دستک دیے کھلے دروازے سے اندر چلی آئیں۔

آیان جو بیڈ پر الٹا لیٹا لیپ ٹاپ پر مصروف تھا ان کو جو یوں اندر آتے دیکھا تو فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

''کیا ہوا گلالئی؟'' وہ تیزی سے بیڈ سے اتر کر ان کے پاس پہنچا جو ہانپتی ہوئی ایک طرف رکھے صوفے پر تقریباً لیٹ چکی تھیں۔ آیان ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا زوے (بیٹا)۔'' انہوں نے جوتے اتار کے ایک طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ نجمہ نیچے کارپٹ پر بیٹھ کر ان کے پیر دبانے لگی۔

''اچھا۔ چلیں پھر رہنے دیں۔'' آیان اچھی طرح جانتا تھا اس کے اصرار کا مطلب گل بی بی اصل بات بتانے کے بجائے مزید سنسنی پھیلاتیں۔

''ارے ایسے کیسے رہنے دوں۔'' اس کی ترکیب کام کر گئی تھی، وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

''تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کیا ہو گیا ہے۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''میں اسی لیے سوچتا بھی نہیں گلالئی۔'' وہ بھی آخر ان ہی کا پوتا تھا۔

''اس ایک ماہ میں پورے پانچ کلو وزن بڑھ گیا ہے میرا۔'' اپنے تئیں انہوں نے جیسے بم پھوڑا تھا لیکن آیان کا ردعمل نارمل ہی تھا۔

''یہ تو خوشی کی بات ہے گلالئی۔ پریشانی والی بات کیا ہے، وہ بتائیں مجھے۔'' اس نے بیڈ سے لیپ ٹاپ اٹھا کر گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے اطمینان پر ان کا تو منہ ہی کھلا رہ گیا۔

''تمہارے لیے یہ بات کیا پریشانی کا باعث نہیں۔'' وہ واقعی حیران تھیں۔

''ہرگز نہیں، بلکہ اچھا ہے نا۔ میری گلالئی مزید گلابوں سی ہو جائیں گی۔'' اس نے ایک ہاتھ ان کے کندھے کے گرد پھیلا کر انہیں خود سے قریب کیا تھا۔

''نہ جی نہ۔ مجھے نہیں ہونا گلابو کی طرح۔ استغفراللہ۔ خود بعد میں نظر آتی ہے دو من کا پیٹ پہلے۔'' انہوں نے فوراً خیالوں ہی خیالوں میں خود کو پڑوسیوں کی ملازمہ گلابو جتنا موٹا دیکھا اور جھرجھری لیتے کان کان پکڑے۔

''توبہ ہے دادی! میں گلابو کی نہیں گلابوں کی طرح کہہ رہا ہوں، پھولوں کی طرح۔'' وہ شرارت سے مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔ اس کے بائیں گال کا ڈمپل بے حد واضح ہوا تھا۔ گل بی بی نے اس کی شرارت بھانپ لی تھی۔

''یہ جو کوہاٹ تل ہے نا تمہارے چہرے کی۔ یہ ہر بات بتا دیتی ہے مجھے۔'' انہوں نے اس کے ڈمپل پر انگلی رکھتے ہوئے اتنے پیارے ڈمپل کو سرنگ قرار دے دیا تھا۔

''لڑکیاں جان دیتی ہیں اس تل پر۔'' وہ بھلا کہاں ہارنے والا تھا۔

''ہاں بھئی۔ سونا چاندی نظر آ گئے ہوں گے واضح۔''

''اف گلالئی! آپ کیا معدنیات کے ادارے میں جاب کرتی تھیں۔'' وہ ہنس رہا تھا۔

''اچھا اب بتائیں کرنا کیا ہے؟'' وہ اب

اصل بات کی طرف آ ہی گیا تھا۔

”مجھے بس وہ مشین چاہیے جو کل تم مجھے لیپ ٹاپ پر دکھا رہے تھے۔ سائیکل کے جیسی مشین۔“

”اس کا کیا کرنا ہے آپ کو؟“ وہ جی بھر کے حیران ہوا۔

”ظاہر ہے چلاؤں گی، اب تندور تو ہے نہیں کہ روٹیاں لگاؤں۔“ وہ چڑ گئیں۔

”اچھا ٹھیک ہے، دیکھتا ہوں۔“

”دیکھنا کیا ہوں؟“ گلالئی تیز ہوئیں۔

”اچھا بابا! آج یا کل لیتا آؤں گا۔“ وہ لیپ ٹاپ پر جھکتے ہوئے بولا۔

”ویسے اس ڈبے پر تم سارا دن کیا کرتے رہتے ہو؟“ آیان علی سید ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ گلالئی کی توجہ اب لیپ ٹاپ کھینچ چکا تھا، سو اب مزید آدھا گھنٹہ ان کے سوالات کے جوابات دینا لازمی تھا۔

”دفتر کے کاموں سے فارغ ہو کر آن لائن ناولز پڑھ لیتا ہوں یا پھر گروپس اور پیجز۔“ اس نے اس بار سنجیدگی سے جواب دیا۔

”گروپس اور پیجز۔“ گلالئی حیران ہوئیں۔

”آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا گلالئی!“ وہ زچ ہوا تھا۔

”لو، مجھے کیوں سمجھ میں نہیں آئے گا۔ خیر سے بارہ جماعتیں پاس ہوں، آٹھ سرکاری اسکول سے اور چار تعلیم بالغاں سے اور ہمارے دور میں تو آٹھویں پاس ڈاکٹر ہوا کرتے تھے تو مجھے تو اس سے بھی اونچی چیز سمجھو۔ اب بتاؤ صاف صاف۔“ انہوں نے اپنی اہلیت ثابت کر دی تھی۔

”یار! آن لائن فیس بک ایک سوشل پلیٹ فارم ہے، جہاں سب لوگ آئی ڈیز میرا مطلب ہے اپنے نام کا اندراج کرا کر مختلف لوگوں سے ملتے، گپ شپ لگاتے اور مختلف لوگوں اور چیزوں کے بارے میں گروپس اور پیجز بنا کر بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا فارغ وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ وہ بیٹھے بیٹھے ہی بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں اور میں چونکہ ڈائجسٹ شوق سے پڑھتا ہوں تو ان کے متعلق سب گروپس اور پیجز پر میں بھی اپنا قیمتی وقت گزارتا ہوں بس۔“ اس نے تیز تیز لہجے میں سب بتا کر لمبی سانس لے کر خود کو ہلکا پھلکا کیا تھا۔

”ارے بابا! تم اس ڈبے پر بھی ڈائجسٹ پڑھتے ہو۔ یہ جو ہر مہینے اتنے پیکٹ آتے ہیں، کیا وہ کم تھے۔“ گل بی بی کا منہ حیرت اور صدمے سے کھلا رہ گیا۔

”ہاں، تو اس میں برائی کیا ہے؟“ اس نے بھنویں اچکائیں۔

”ایک ہی پوتا دیا، خدا نے وہ بھی لڑکیوں کی عادات والا۔“ دادی نے افسوس کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

”اچھا۔“ شرارتی مسکراہٹ نے اس کے گال کا ڈمپل مزید گہرا کر دیا تھا۔

”ویسے گلالئی! ایک بات تو بتائیں۔ آپ کا پسندیدہ لباس کیا ہے؟“

”یہ بھی پوچھنے والی بات ہے — جینز کے ساتھ کرتا۔“

”اور شوز؟“

”جوگرز۔“ گلالئی ذرا سا اترائی تھیں۔

”پسندیدہ گیم؟“ آیان مزید مسکرایا۔

”کرکٹ۔“

”مزید پسندیدہ چیزیں؟“

”بہت سی ہیں، گھڑ سواری، ریسلنگ، شکار کرنا اور بہت ساری ایسی چیزیں اور کام مجھے پسند ہیں۔ لیکن تمہارا مطلب کیا ہے؟“ گل بی بی اس کے گہرے ہوتے ڈمپل کو دیکھ کر چونکی تھیں۔

”میرا مطلب یہی ہے دادی کہ جب آپ کو مردوں والے شوق ہو سکتے ہیں تو میں کیوں لڑکیوں والے شوق نہیں پال سکتا۔“ اس نے پیار سے دادی کے دونوں گالوں پر کوچی کوچی کو کیا تھا۔ انہوں نے اس کی بات پر منہ بنایا، آیان سید کا قہقہہ جان دار تھا۔

☆☆☆

اونچے نیچے، کچے پتھریلے راستے پر چلتے چلتے اس کی ٹانگیں درد کر رہی تھیں۔ اوپر سے ٹوپی نما برقعے نے جان جوکھوں میں ڈال رکھی تھی۔ تب ہی وہ زیادہ اپنے گھر اور کھیتوں سے باہر نہیں نکلتی تھی کہ اماں اسے دور کہیں لے جاتیں تو چادر کے بجائے شٹل کاک برقعہ پہنا دیتیں۔

”کیا ہے امی؟ اگر میں چادر لے لیتی تو کیا ہو جاتا۔ خواہ مخواہ کی یہ چھت۔“ اس نے تنگ آ کر برقعے کو ادھر ادھر کھینچا تھا۔

”میں نے نہیں کہا تھا یہاں آنے کے لیے۔ تم نے ہی ضد کی تھی۔“ زرغونہ نے سادہ لہجے میں جواب دیا۔

”میں یہاں آنے — کی نہیں۔ امی! میں اس برقعے کی بات کر رہی ہوں۔“ ان کی بات نے اسے مزید چڑا دیا۔

”تو میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اتنی دور میں تمہیں جب بھی لاؤں گی، برقعے میں ہی لاؤں گی۔“

”تو یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ چادر میں کیوں نہیں لا سکتیں۔“ قریب سے گزرتے تین مردوں نے (جنہوں نے کندھوں پر چادریں ڈال رکھی تھیں) مڑ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ زرغونہ نے اس کے کندھے کو پکڑ کر ذرا سا دبایا اور اسے اپنے آگے چلنے کے لیے ہلکا سا دھکا دیا۔

”دھکے کیوں دے رہی ہیں؟“ وہ بھلا کبھی ماں کا مطلب سمجھی تھی جو اب سمجھتی۔ زرغونہ کا دل کیا، وہیں کھڑے کھڑے سر پیٹ لیں لیکن وہ بے بس تھیں، کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح صبر کرنے کے سوا۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کی عرف جس قدر بچپن میں سمجھ دار تھی، بدلتے حالات اور اپنوں کے رویوں نے اسے اسی قدر لاپروا اور ضدی بنا دیا ہے۔ نرم، کومل سی عرف جمال مروت نے رشتوں کی بے حسی بہت کم عمری سے محسوس کی، تو خود کو بس ماں تک اور بابا کی یادوں تک محدود کر دیا تھا لیکن اس محدود دائرے نے اسے کچھ بدل دیا۔ حساس سی عرف کی جگہ لاپروا سی گل پرونے لے لی تھی۔ کسی کو اس کی پروا ہوتی تو لاکھ بسم اللہ، ورنہ در فٹے منہ کہہ کر اپنی راہ لے لیتی اور اسی بدلاؤ نے اسے من مانی کرنا بھی سکھا دیا تھا۔

”امی۔“ سامنے قبرستان نظر آ رہا تھا، اس نے ایک دم سے خاموش ہو جانے پر ماں کو پکارا تھا۔

”ہاں۔“ وہ چونکیں۔

”بابا۔“ ان کی توقع کے عین مطابق وہ ان کا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف قدرے اونچائی پر بنی قبروں کی طرف دوڑ گئی۔ انہوں نے بڑا سا گھیر دار نقاب الٹ دیا۔ عرف باپ کی قبر سے لپٹ چکی تھی۔

”تمہارے بابا سچ کہا کرتے تھے عرف! کچھ رشتے فانی نہیں ہوتے۔ انسان مر بھی جائے وہ رشتہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ جیسے ایک بیٹی سے باپ کا رشتہ۔“ انہوں نے نرمی سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

بابا کی قبر سے لپٹی وہ کتنی ہی دیر یوں ہی پڑی رہی۔ ان سے دل کی باتیں کہتی رہی اور یہ ہمارے معاشرے کی ایک سنگ دل روایت ہے کہ جینے والوں کو بھی اس قدر اکیلا کر دیا جاتا ہے کہ مر جانے والے ہی پھر انہیں بہترین رازدار لگتے ہیں۔

اس نے جو قرآنی آیات زبانی یاد تھیں، بار بار ان کی تلاوت کر کے اپنے بابا کے لیے دعا کی تھی۔

”چلو پری! دیر ہو رہی ہے۔“ زرغونہ نے اسے مخاطب کیا تھا۔

”ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی امی!“ نہ جانے اسے یہاں کیسا سکون ملتا تھا کہ واپس جانے کو دل ہی نہ کرتا۔

”تو اچھا ہے نا، اندھیرا ہو گیا تو راستے کا تو پتا ہی ہے تمہیں۔ اوپر سے بارش کے بعد ہونے والے

کیچڑ سے اور مشکل ہو جائے گی۔" ساری رات برسنے والی بارش نے واقعی جل تھل کر دیا تھا اور راستے کا تو خود اسے بھی اندازہ تھا، سو اس بار اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

"سر! سب مائننگ ایکوپمنٹس (کان کنی کے اوزار) سائیٹ پر پہنچا دیے ہیں۔ کام کب اسٹارٹ کرنا ہے۔" ان کی کمپنی کو بنوں اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں کان کنی پر ریسرچ کا کام ملا تھا۔ کام اگلے ہفتے ہی شروع ہونا تھا مگر یہ چونکہ اس کی کمپنی کا پہلا پروجیکٹ تھا تو وہ جلد از جلد پیپر ورک کر لینا چاہتا تھا تاکہ بعد میں کھدائی اسی ریسرچ کو مدنظر رکھ کے کی جائے اور وقت کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکے۔

"تم لوگ علاقے کے لوگوں سے مل کر اس ایریا کی آب و ہوا اور موسمی تاریخ کے بارے میں معلوم کرو۔ میں ان شاء اللہ کل یا پرسوں تک آپ لوگوں کو جوائن کرتا ہوں پھر دیکھتے ہیں۔" اس نے اپنے اسسٹنٹ کو کچھ مزید ہدایات دیں اور خود لیپ ٹاپ پر مصروف ہو گیا۔

ساتھ بیٹھے — حیدر نے ذرا سی بلائنڈز گرل نیچے کر کے کھڑکی سے باہر روڈ پر جھانکا اور چونک گیا۔

"سر!" اس کی اچانک پکار پر اس نے سر اٹھا کر حیدر کی طرف دیکھا۔

"گلالئی!" حیدر نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں، گلالئی ٹھیک ہیں الحمدللہ۔" وہ اس کا اشارہ نہ سمجھ کر دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"سر! آئی مین گلالئی یہاں آ رہی ہیں۔" اس کی بات پر وہ بری طرح اچھلا تھا۔

"یہاں کہاں؟" اس نے آگے بڑھ کر نیچے جھانکا۔

"ہمارے آفس۔"

"یہاں کیسے آ سکتی ہیں۔ آفس کا پتا تو ہے ہی نہیں ان کے پاس۔" وہ اب بھی بے یقینی سے باہر جھانک رہا تھا۔

"سوری سر! کل انہوں نے مجھے فون کیا تھا، باتوں باتوں میں ......" حیدر واقعی پشیمان تھا۔

"او مائی گاڈ حیدر! تم جانتے بھی ہو ان کی عادت کو پھر بھی۔ لاسٹ آفس بھی ان کی وجہ سے چھوڑا میں نے۔ وہ دو دو بار چکر لگاتی تھیں کہ میرا پوتا ٹھیک تو ہے۔ کوئی مار تو نہیں گیا، کتنا مذاق بنا تھا میرا۔" وہ واقعی پریشان تھا۔

"اچھا سر! آپ فکر نہ کریں، میں ابھی ان کو واپس چھوڑ کر آتا ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ آیان نے سکھ کا سانس لیا مگر اگلے ہی پل اس نے حیدر کو واپس اندر آتے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ حیران ہوا۔

"گلالئی آ نہیں رہیں۔" حیدر شکستہ انداز میں سر جھکاتے ہوئے بولا۔

"شکر۔" اس نے سیٹی کے سے انداز میں لب سکیڑے۔

"گلالئی آ چکی ہیں۔" اگلا فقرہ سنتے ہی اسے جھٹکا لگا تھا۔ دادی دروازے میں کھڑی اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

"ارے گلالئی!" وہ فوراً خود پر قابو پاتا ان کی طرف بڑھا۔

"مجھے کہتیں، میں ڈرائیور بھیج دیتا۔" اس نے محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنی کرسی پر بٹھایا۔

"ہاں، بس میں دیکھنے آئی تھی کہ میرا پوتا"

"گلالئی!" آیان نے فوراً ان کی بات کاٹی۔

"میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔" وہ بے بس لہجے میں بولا۔

"ہاں، تو میرے لیے تو وہی — چھوٹے بچے ہی ہو۔" انہوں نے محبت سے اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مگر گلالئی! یہ آفس ہے، یہاں یہ سوال پوچھ کر۔۔۔"

"اچھا بس۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرایا۔

"آج تو میں ایک ضروری کام سے آئی تھی۔" چھوٹے سے لیدر ہینڈ بیگ سے اپنا اسمارٹ فون نکالتے ہوئے انہوں نے اس کی جانب بڑھایا۔

"کیا ہوا؟" اس نے فون کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پھر خراب ہو گیا؟"

"لو، میرا ابھی پہلے بھی فون خراب ہوا ہے جو اب ہو گا۔" گلالئی نے فخریہ کہا۔

"تو ......" وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"اچھا اب جلدی سے مجھے بھی اس پر وہ آئی ڈی بنا دو، جو تم نے بنائی ہوئی ہے۔ ویسے بھی خط لکھ لکھ کے میں بھی بور ہو گئی ہوں۔ دیکھوں تو سہی اس میں کیا ہے جو تم کھاتے پیتے، سوتے جاگتے اسی بک پر بیٹھے رہتے ہو۔" آیان کو چکر آنے لگے۔

"لیکن گلالئی! آپ کیا کریں گی؟"

"پتا ہے ناں سالار سکندر لوٹ آیا ہے خواتین ڈائجسٹ میں۔ بس اسی کے بارے میں، میں بھی بحث و مباحثہ کر لوں گی۔ تم اتنا مت سوچو، بس جلدی سے مجھے آئی ڈی بنا کر دو اور وہ سب بھی سمجھا دو جو تم مجھے گھر پر بتا رہے تھے۔" وہ مکمل وہ ورقے [illegible]۔ انہوں نے آرام سے گروپس اور پیجز کی منی خواری کی بھی اور اس بار دونوں ہاتھوں سے سر پکڑنے والا اکیلا آیان نہیں تھا۔ حیدر نے بھی بے ساختہ اس کا ساتھ دیا تھا۔

☆☆☆

"پلوشہ کو دیکھنے لوگ آ رہے ہیں۔" پریشہ نے جیسے بم پھوڑا تھا۔ عرف بری طرح اچھلی۔

"کیا کہا تم نے؟" اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔ کچھ دن پہلے کسی شہر میں بسنے والے خالو کے بیٹے کی شادی میں گئے تھے نا ہم۔ بس وہیں کسی نے اس کو بھی پسند کر لیا تھا۔" پریشہ نے قدرے بڑی سبز پتوں والی مولی منتخب کرتے ہوئے کہا اور پھر سب کو یکجا کر کے زور سے پکڑ کر کھینچا۔ موٹی تازی مولی اس کے ہاتھ میں تھی، دائیں طرف صاف پانی کے چھوٹے سے نالے سے وہ مولی دھونے لگی۔

"پھر کب تک ہو گی شادی؟" اس کے چہرے پر ایک دم سے جوش چھانے لگا۔

"تمہیں بڑی جلدی ہے۔" پلوشہ اس بے تابی پر کھلکھلائی۔

"ہاں تو کتنی مدت بعد میں کوئی شادی دیکھوں گی۔ آٹھ سال کی تھی جب امی کسی رشتہ دار کی شادی میں لے کر گئی تھیں۔" اس نے بتایا۔

"میں تو بھی پلوشہ سے تمہاری بنتی نہیں ہے، اس لیے خوش ہو رہی ہو۔" اس نے دانت نکالتے ہوئے عرف کو چڑایا اور مولی کھانے لگی۔

"میں تو اس سے بھی بنا کر رکھتی، پلوشہ کو ہی میں اچھی نہیں لگتی۔" اسے یوں مولی کھاتے دیکھ کر اس کا دل متلانے لگا۔

"نہ کھاؤ ایسے، پھر منہ سے بو آئے گی۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔

"آنے دو۔ تم تھوڑا دور بیٹھ کر بات کر لینا۔" اس نے لاپروائی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ عرف تاسف سے سر ہلاتی اپنے گھر کی پچھلی دیوار کو تکنے لگی اور پھر اس سے ہی جڑی مضبوط کنکریٹ کی دیوار کو۔ کیچڑ گارے سے لگی لال اینٹوں والی دیوار جگہ جگہ سے جھڑ چکی تھی۔ اینٹیں شکست و ریخت کا شکار تھیں۔ اس دیوار کے ختم ہوتے ہی وہ مضبوط دیوار شروع ہو جاتی تھی جس کی بنیادوں پر زیادہ نہ سہی وقت نے کچھ نہ کچھ کائی تو جما ہی دی تھی۔

"وقت کے تھپیڑوں سے کوئی بچ پایا ہے کیا؟" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔

اسے وہ شام اچھی طرح یاد تھی، جو بابا کی موت کے صرف چند ماہ بعد ہی قیامت بن کر اس پر ٹوٹی تھی۔ "مورے" اس کی دادی اور چاچی نگینہ نے کس طرح انہیں محل نما گھر سے نکالا تھا۔ خان بابا (مصطفیٰ جمال مروت) جن کی جان تھی عرف میں، اس دن وہ گھر پر نہیں تھے اور اس کی ماں زرغونہ بی بی بس اسے متاعِ کل سمجھ کے اپنے ساتھ لگائے چپ چاپ اس آدھے کچے، آدھے پکے مکان میں آ بسیں جہاں کچھ عرصہ پہلے مال مویشی اور ان کے محافظ کے بندھا کرتے تھے۔

اس رات نیند کی آغوش میں جانے تک وہ اپنے ساتھ ماں کو بھی ڈھارس دیتی رہی کہ کل صبح خان بابا آئیں گے اور صحیح کر دیں گے سب۔ لیکن اگلی صبح خان بابا تو نہ آئے البتہ کچھ کام والے آدمی لیے ان کے پرانے مزارعے شفیق چاچا آ گئے۔ شام تک بھوکی پیاسی وہ کچن نما کمرے میں ماں کے ساتھ چپکی رہی۔ رات تک کمرے کا حلیہ ٹھیک ٹھاک بدل چکا تھا، کمرے کو نہ صرف صاف کیا گیا تھا بلکہ کچھ ضروری سامان بھی وہاں رکھوا دیا گیا تھا۔

"بی بی! آپ کے سامان میں سے ضرورت کی کچھ دوسری اشیاء خان جی نے بھجوا دی ہیں۔ اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو گل پرو کو بھیج کر منگوا لیا کرنا آپ۔" پردے کے پیچھے سے وہ کہہ کر چلے گئے تھے اور دس سالہ سمجھ داری عرف جان گئی تھی کہ "جب بابا جدا ہوتے ہیں تو بیٹیوں سے پوچھنے کوئی نہیں آتا بلکہ خود انہیں مانگنے جانا پڑتا ہے۔" اس رات اس کی ماں سو گئی تھی مگر اس کے آنسو دیر تک تکیہ بھگوتے رہے تھے۔

☆☆☆

آفس میں تو کسی طرح اس نے ٹال دیا تھا مگر گھر آتے ہی دادی پھر اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ چاروناچار اسے ان کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھنا ہی پڑا تھا۔

"اچھا دادی! نام کیا رکھوں؟" اس نے انفارمیشن باکس سامنے آتے ہی دادی سے پوچھا۔

"امامہ ــــ!" اور آیان کو زور سے کھانسی آئی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا؟"

"گلالئی...... آپ کو یہی نام ملا تھا؟" وہ شکوہ کناں ہوا۔

"تمہیں کیا پرابلم ہے؟" گل بی بی نے فوراً چشمہ نیچے کیا۔

"ہے نا پرابلم۔ یہ میرے خوابوں کی شہزادی ہے اور میں نے اسے تیئس، چوبیس سال کا ہی سوچ رکھا ہے، آپ میرے خواب خراب نہ کریں۔" وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

"تم اسی کو سوچو، مگر مجھے بھی میرے خوابوں سے مت روکو۔" وہ بھی قطعی لہجے میں بولیں۔ آیان نے ان کا فون میز پر دھر دیا۔

"اچھا ایک منٹ۔" گل بی بی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولیں۔

"تم ذرا مجھے ایف بی۔ گروپ کے سارے بندے دکھاؤ۔" انہوں نے جیسے حل نکالا۔

آیان کو پتا تھا وہ کسی کو بھی ٹال سکتا تھا مگر گل بی بی کو نہیں۔ اس نے تیزی سے وہ گروپ اوپن کر کے لیپ ٹاپ ان کی طرف موڑا۔

"تم نے تو کہا تھا کہ ہر کوئی صرف اپنی وال پر پوسٹ یا تبادلہ کر سکتا ہے مگر ادھر تو ہر دوسری پوسٹ کسی اور کی ہے۔" انہوں نے خاصی پوسٹس چیک کرتے ہوئے کہا اور وہ بے اختیار گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہ گیا۔

"میری ماں! یہ گروپ کی وال ہے۔ یہاں ہر ممبر جب چاہے اپنی بات سب کے ساتھ شیئر کر سکتا ہے۔" وہ انہیں سمجھانے لگا۔

"اچھا اچھا، اب سمجھ گئی میں۔" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اور یہ دیکھو، سب کی آئی ڈیز دیکھو۔ یہ رہی حنین کی آئی ڈی، اب وہ خود تو محل سے باہر نہیں آ گئی نا۔" انہوں نے ایک پوسٹ کنندہ پر انگلی جمائی۔

"اور یہ رہی حیا سلیمان۔ ارے یہ دیکھو یہاں تو عمر بھی ہے اور بھی ہوں گے، بس تم بھی مجھے امامہ ہی بنا دو۔"

"لیکن گلالئی! سب کو پتا چل جائے گا کہ آپ ایک اچھی خاصی ایجڈ امامہ ہو۔" آیان کا بالکل بھی دل نہیں کر رہا تھا۔

"نہیں لگے گا، بلکہ شرط لگاتی ہوں صرف سالار سکندر تو کیا عمر، عالم شاہ، جہان، اشعر، ولی سب میرے پیچھے ہوں گے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے زور سے آیان کے کندھے پر دھپ رسید کی تھی، وہ کراہ کے رہ گیا تھا۔

"ویسے یہ تو بتاؤ، تم کس نام سے ہو گروپ میں۔" اچانک ہی انہیں خیال آیا تھا۔ وہ کچھ پل خاموش رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی طلسم ٹوٹنے لگا تھا اس کے ایک حرف بولنے سے، مگر اسے بولنا تو تھا۔

"سالار سکندر۔" دادی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

آج صبح سے اس کا موڈ آف تھا جب کہ موسم بھی بے حد خوش گوار تھا۔ اس نے بے دلی سے آٹا گوندھا اور کچن نما اس کوٹھڑی سے باہر نکل آئی۔ تب ہی اس نے زرغونہ بی بی کو چادر لپیٹے اپنی طرف آتا دیکھا۔ وہ ان کی سائیڈ سے نکلنے لگی کہ انہوں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" اس کا ناراض چہرہ انہیں حیران کر گیا۔

"امی! بابا کیا گئے، آپ نے بھی مجھے سمجھنا چھوڑ دیا۔" عرف کی آنکھیں بھرنے لگیں۔

"ارے، کیا کر دیا میں نے۔" وہ بے چاری پریشان سی اسے دیکھے گئیں۔

"مورے اور نگینہ چاچی نے کیا کیا ہمارے ساتھ اور آپ پھر وہاں جا رہی ہو۔" اس کی شکایت پر وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔

"پلوشہ کا رشتہ طے ہوا ہے۔ انہوں نے بھلے ہی مجھے چھوڑ دیا ہو۔ میں تو ان سے تعلقات نہیں توڑ سکتی۔ تمہارے باپ اور مصطفیٰ بھائی کے لیے ہی سہی۔"

"چاہے وہاں کوئی آپ کو پوچھے یا نہ پوچھے۔ کوئی آپ کی عزت کرے یا نہ کرے۔" وہ تڑپی۔

"ہاں، کوئی بھی نہ کرے مگر مصطفیٰ بھائی نا صرف مجھے پوری عزت دیتے ہیں بلکہ اپنے مرحوم بھائی کی بیوی بھی سمجھتے ہیں، تب ہی تو انہوں نے ہمارا اس قدر خیال رکھا۔"

"ہاں، بہت زیادہ ہی خیال رکھا۔ یہ جو دو وقت کا اناج اور سال میں موسم کے لحاظ سے تین چار جوڑے آتے ہیں نا امی، یقین کیجیے یہ بھی صرف خانہ پری کے لیے آتے ہیں تاکہ گاؤں میں کوئی ان پر انگلی نہ اٹھا سکے کہ بھائی کے آنکھیں بند کرتے ہی بیوہ بھابھی اور بھتیجی کو لاوارث چھوڑ دیا۔" وہ تلخ لہجے میں انہیں سچائی سے آگاہ کرنے لگی۔ جیسے وہ اس سب سے لاعلم تھیں، یا پھر عقل و شعور سے عاری کہ رویوں کو نہ سمجھ سکتیں۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تم دروازہ اچھے سے بند کر دو۔" رخ پھیر کر اپنی آنکھوں کی نمی چھپاتے انہوں نے اسے ہدایت کی۔

"سالن میں نہیں بناؤں گی۔" وہ منہ پھلاتے ہوئے بولی تھی۔

"اچھا، مت بنانا۔" وہ کہہ کر دروازے کی چوکھٹ پار کرنے لگیں۔

"اچھا بنا لوں گی۔ آپ آرام سے جاؤ۔" اس بار ان کو گل پرو کی وہی متفکر آواز آئی تھی۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئیں۔ عرف بھی دل سے مسکرا دی۔ اس کی ماں اسے سمجھتی تھی ناں۔

☆☆☆

چند ضروری کاموں کی وجہ سے اس کا سائیٹ پر جانا کینسل ہو گیا تھا اور یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ ان دو تین دنوں میں دادی کے ممکنہ جملوں سے محفوظ رہا تھا اور آرام سے آفس کا کام نبٹا لیتا تھا اور یہ سب ہوا تھا اسی سوشل ویب سائیٹ کی بدولت۔

یہ اور بات کہ اس بار گلالئی کی ضد کے باوجود اس نے امامہ ــــ کے نام کی آئی ڈی نہیں بنا کر دی تھی۔ کل صبح ہی اسے نکلنا تھا سو آفس سے ضروری کاغذات لے کر وہ آج جلدی گھر لوٹ آیا تھا۔

''گلالئی کہاں ہیں؟'' اس نے لاؤنج میں ڈسٹنگ کرتی نجمہ سے پوچھا۔

''صاحب وہی موبائل اور وہ، کمرے میں ہی ہوں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ وہ بھی سر ہلاتا ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''خیریت، آج تو جلدی آ گئے تم۔'' ان کے اس سوال پر اسے جھٹکا لگا تھا۔ کہاں دادی چاہتیں کہ بس وہ گھر پر ہی نظر آئے اور کہاں آج الٹا یہ سوال۔

''کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر جانا ہے، اس کی تیاری کرنی تھی تب ہی۔'' اس نے دادی کے برابر لیٹتے ہوئے جواب دیا۔ جواب بھی مسلسل موبائل پر ہی بزی تھیں، تب ہی شاید انہوں نے اس کی بات نہیں سنی تھی اور ان کا ردعمل غیر متوقع تھا۔ اس کے شہر سے دور جانے کا سن کر وہ ہڑبڑائی نہ تھیں۔

''ایف بی استعمال کرنا تو آ گیا۔'' اس نے دادی کے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر نظر گھمائی۔

''تم جانتے ہو اپنی دادی کو۔ کون سا کام ہے جو میں نہیں کر سکتی۔'' وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائیں اور اس بات کو اس سے زیادہ کون جان اور مان سکتا تھا۔ ستر کی دہائی عبور کرنے سے بس تین چار قدم ہی دور تھیں مگر ان کی فٹنس اور چستی قابل رشک تھی۔ اسی طرح ذہانت میں بھی وہ قابل داد تھیں۔

پتا ہے گروپ کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے مجھے ایڈ کر لیا تھا اور ابھی تو کئی درخواستیں نظر کرم کی منتظر ہیں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا تھا۔

''اچھا دکھائیں تو۔'' وہ دیکھ نہیں پا رہا تھا تب ہی مچلا۔

''دیکھ کے کیا کرو گے۔ بتا رہی ہوں نا۔'' انہوں نے موبائل آف کرتے ہوئے کہا۔

''توبہ دادی! اتنی پرائیویسی۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''اور پتا ہے آج صبح تو مجھے بہت بڑے بڑے لوگوں کی ریکوئسٹ ملی ہیں۔ افق ارسلان، ڈیئر ڈیول، عمر جہانگیر، بلکہ آئن اسٹائن، فاطمہ جناح اور قائداعظم کی فرینڈ ریکوئسٹس بھی موصول ہو چکی ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بتانے لگیں۔ آیان کو بھی ہنسی آ گئی۔ وہ اٹھنے لگا۔

''اچھا۔ یہ تو بتاؤ جا کہاں رہے ہو؟'' اور وہ دھڑام سے واپس بیڈ پر گرا تھا۔

''آئن اسٹائن نے مرتے وقت ضرور اپنا دماغ گلالئی کو عطیہ کیا تھا۔'' اس نے ان کی یادداشت کو دل ہی دل میں داد دی۔

''کیا ہوا؟ پروگرام کینسل تو نہیں کر دیا۔'' انہوں نے عینک نیچے کی۔

''دور نہیں جا رہا گلالئی! بس یہیں بنوں، لکی مروت تک۔'' اس کے پاس بتانے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

''اوہ، اچھا۔ چلو ٹھیک ہے۔ تم تیاری کر لو۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے یا نجمہ کو بتا دینا۔'' دل ہی دل میں اس بار گلالئی کی ساتھ جانے والی ضد نہ کرنے پر اس نے شکر ادا کیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے کی طرف چل دیا۔

مختلف سامان ترتیب دینے اور لیپ ٹاپ پر کام کرتے کرتے رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ اس نے صبح جلدی نکلنا تھا، سونے سے پہلے اس نے

ایف بی اوپن کی تھی۔ ... درخواستیں موصول ہو چکی تھیں، اس نے سب سے اوپر والی آئی ڈی پر کلک کیا، جو امامہ ہاشم کی تھی۔ ڈی پی پر بے حد خوب صورت مرمریں مہندی لگے ہاتھ سجے تھے اور کور پر ایک جوڑے کے نکاح کی تصویر پر امامہ + سالار جگمگا رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ریکوئسٹ قبول کی تھی۔ صرف چند سیکنڈز میں ہی ایک پیغام چمکا تھا، جو امامہ ہاشم کی طرف سے ہی تھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے مسکراتے ہوئے پڑھا۔ خوشی سے ڈمپل یوں گہرا ہوا جیسے سچ میں امامہ ہاشم ہی ایف بی سے نکل کر اس سے ہم کلام ہونے آئی ہے۔

''اف یہ آپ کی مسکراہٹ اور جان لیوا ڈمپل۔'' وہ جو جواب ٹائپ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ اگلا پیغام موصول ہوتے اور پڑھتے ہی تقریباً اچھل پڑا۔ یہ واقعی حیران کن بات تھی۔ اس کے جاننے والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو یوں امامہ کو جانتا یا پھر اسے اس طرح تنگ کر سکتا تھا تو پھر یہ کون تھا؟

''آپ کون؟'' اس نے کیا ٹائپ کرنے کا سوچا تھا۔ اسے ٹائپ کیا کرنا پڑ رہا تھا۔

''میں......'' کھٹ سے جواب آیا تھا۔

''اڑسٹھ سالہ امامہ ہاشم...... یعنی آپ کی گلالئی۔'' اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کتنی ہی بار حیرت سے وہ پیغام پڑھا تھا۔

''وہ محبت ہی کیا...... جو چونکا، جھٹکا، پٹخا نہ دے۔'' اگلا پیغام موصول ہوا تھا۔ وہ بھی پوری آزادی سے منہ کھولے اسمائلی کے ساتھ اور آیان علی نے واقعی خود کو بیڈ پر گرا دیا تھا کہ اب اس میں مزید چونکنے اور جھٹکے کھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔

اسے کہاں خبر تھی کہ صبح ایک اور جھٹکا اس کا انتظار کر رہا ہے۔

☆☆☆

اسے چونکہ کچھ سامان لے کر روانہ ہونا تھا تو

... اٹھ بجے کے قریب ہی حیدر ... ان کی گاڑی لے کر پہنچ گیا تھا۔ آیان کا سامان، خان کاکا جو ان کے خاندانی ملازم تھے، پہلے ہی گاڑی میں رکھ چکے تھے۔ آیان تیار ہو کر نیچے آیا تو سیڑھیوں سے ہی اسے ناشتے کی میز پر ٹیبل بجاتا حیدر نظر آ گیا تھا۔ وہ شاید اسی کا منتظر تھا۔ حیدر نے بھی اسے دیکھ لیا تھا تب ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ کلائی پر گھڑی باندھتا سیڑھیاں اترتا اس کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے نیچے آیا۔ حیدر نے دوبارہ کرسی سنبھال لی۔

''کیسے ہو جگر؟'' آیان نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

''بالکل فٹ سر!''

''گڈ۔ سو تم بھی چل رہے ہو نا ساتھ۔'' اس نے ٹوسٹ کے ساتھ انڈے کا پیس اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''شیور سر۔'' کم گو سا حیدر اسے اسی لیے بے حد عزیز تھا کہ آج کل کے نوجوانوں کی طرح وقت کو کسی بھی فضول سرگرمی میں ضائع کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ بس ضرورت کے تحت ہی بات کرتا تھا، اس کی یہی کم گوئی، مدہم لہجے میں بات کرنے کی عادت اسے بے حد پسند تھی۔

''ناشتا کیوں نہیں کر رہے؟'' چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس نے حیدر کی طرف دیکھے بنا ہی پوچھا۔

''ناشتا کر کے آیا ہوں سر! چائے گلالئی نے پلا دی تھی۔''

''گلالئی زندہ باد۔'' وہ مسکرایا۔

''چلیں۔'' اسے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتا دیکھ کر حیدر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں، تم چلو۔ میں یہ چائے ختم کر کے آتا ہوں۔'' وہ سر ہلاتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

''نجمہ۔'' اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پرسوچ نگاہوں سے دادی کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے نجمہ کو آواز دی تھی۔ یہ واقعی حیران کن

اب بھی آرام سے ناشتا کر کے کمرے میں ہی تھیں۔ جس کا صرف ایک ہی مطلب تھا کہ وہ امامہ ہاشم بن کر محبتیں اور عقیدت سمیٹنے میں مصروف تھیں۔

"جی صاحب!" نجمہ دوپٹے سے گیلے ہاتھ پونچھتی اس کے سامنے آئی۔

"گلالئی کمرے میں ہیں اپنے؟" اس نے بس یوں ہی پوچھا۔ جب کہ وہ جانتا تھا کہ ظاہر ہے وہ اپنے کمرے میں ہی ہوں گی۔

"نہیں صاحب۔"

"تو......" اس نے کہہ کر کپ ہونٹوں سے لگایا۔

"وہ تو کب سے ایئرفون لگائے آپ کی منتظر ہیں۔" نجمہ نہ جانے کیوں مسکرا رہی تھی۔

"آپ کی گاڑی میں۔" بات مکمل ہوئی اور اسے بری طرح اچھو لگ گیا۔ ناقابل یقین سی کیفیت میں گھر کر وہ مرے مرے قدموں سے گاڑی تک آیا تھا۔ اگلی نشست پر ایئرفون پر فل والیوم پر یویونی سنگھ کے گانے پر سر دھنتی امامہ ہاشم، اوہ سوری دادی واقعی اس کی منتظر تھیں۔

"جلدی آؤ سالار سکندر۔" مزید چڑایا گیا تھا۔

وہ منہ بسورتے پچھلی سیٹ کی جانب بڑھا تھا۔ حیدر کا قہقہہ جان دار تھا۔

☆☆☆

"زندگی عذاب کر کے رکھ دی ہے۔ آنے دو ذرا مصطفیٰ کو۔" انہوں نے خود کلامی کی تھی تب ہی باہر بجتی بے ہنگم موسیقی کی آواز پہلے قدرے کم اور پھر بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ چند سیکنڈز لگے تھے ان کو بات کی تہہ تک پہنچنے میں۔ ان کے جھریوں زدہ چہرے پر عجیب سی شیطانی مسکراہٹ چمکی تھی۔ بیڈ کے ساتھ پڑی بید کی مضبوط چھڑی اٹھائے وہ تیزی سے باہر نکلی تھیں۔

ان کی توقع کے عین مطابق مصطفیٰ چاروں طرف تیڑھی اینٹوں کی کیاری سے گزر کر برآمدے کی

"اب کیوں چپ کر گئی ہو منحوسو۔ اب بجاؤ نا گانا بجانا۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔" انہوں نے غصے سے چنگھاڑتے ہوئے بید کی چھڑی کھڑکیوں کے قریب رکھی کرسیوں پر ماری تھی۔

"سارا دن بیماری کا ناٹک کرتی ہے دادی! اور اب شکایت کے وقت دیکھو ذرا ان کی کوچ اور سختی۔" دروازے کی اوٹ سے جھانکتی پلوشہ نے نخوت سے کہا تھا۔

"اللہ رحم کرے بس۔" بیڈ پر بابا کے ڈر سے کبھی کبھی پری بیٹھے نے دعا کی تھی اپنی ہدایت کے لیے۔

"کتنی بار سمجھایا ہے تم لوگوں کو۔ اب خوف نہ کھایا کرو۔ جوان بھائی ہے تمہارا۔ میں بھی جوان بیٹے کی ماں ہوں۔ وہ زرغونہ تھی ایک لڑکی کی ماں، اسی لیے اسے اس قدر آسانی سے نکال پھینکا۔ میں نے اس کا دماغ ٹھیک کر دینا ہے۔" سر باندھے بیڈ پر لیٹی نگینہ نے اٹھتے ہوئے انہیں کہا اور برآمدے میں آ گئی۔ جہاں حسب روایت دادی کی شکایت اور شور شرابے کے بعد مصطفیٰ جمال مروت واقعی بیٹیوں کو آوازیں دے رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟ کیوں آتے ہی اتنا شور مچا رہے ہیں۔" ہاتھوں سے سر دباتے ہوئے وہ براہ راست مصطفیٰ سے ہی مخاطب ہوئیں۔

"یہ بچیاں کیوں تنگ کرتی ہیں اماں کو۔" انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"کیا کیا ہے بچیوں نے؟" انہوں نے الٹا سوال دہرایا۔

"دیکھا۔ ارے بھی تو ہے تیری بیٹیوں کو بگاڑنے والی، یہ بھلا کیوں مانے گی۔" کمزور ضعیف سا وجود واقعی بے حد طاقت ور اور ناقابل شکست لگ رہا تھا۔

"میں بتا رہی ہوں اماں! میرے منہ مت لگنا۔" کمزوری، دھان پان سی نگینہ نے کمر پر ہاتھ رکھ لیے۔

"ارے خدا کی پناہ۔ جانے چاہتی کیا ہیں آپ۔ اکیلے رہنا چاہتی ہیں تو بتا دیں۔ میرا بیٹا جوان ہے اور اتنی طاقت ہے اس میں کہ ماں بہنوں کا بوجھ اٹھا سکے۔" غصے سے اس کا سانس پھولنے لگا۔

"تم تو کچھ سوچ کے بولو نگینہ! وہ تو ضعیف ہیں۔ وہ بھلا تم لوگوں کو کیوں نکالیں گی اس گھر سے۔" مصطفیٰ نے اسے خاموش کرانا چاہا۔

"اس کا واضح ثبوت دے چکی ہیں اماں جان! زرغونہ بھابھی کا کیا قصور تھا۔ ارے خدا کی پناہ، ہمیں تو ماں نے ہمیشہ یہی سکھایا کہ تم لوگ اپنے گھر میں خوش رہو۔ میرے گھر کی وسو (بسانے والی) تو میری بچیاں ہیں اور ایک یہ آپ کی اماں جان! بیٹے کی آنکھیں بند کرنے کا انتظار کر رہی تھیں۔" مصطفیٰ نے بے دردی سے سینہ مسلا تھا۔ نگینہ نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"بھتیجی کی بیوی اور بیٹی دونوں کو کس طرح ذلیل کیا انہوں نے، آپ بھلے ماں کے سر کی قسم کھا کے خاموش رہ سکتے ہیں۔ مگر میں زرغونہ بھابھی کی طرح غیر ذات کی نہیں ہوں، ان ہی کا خون ہوں میں۔ اس گھر سے تو مر کر ہی نکلوں گی اور بات رہی بیٹیوں کی، تو بھی گھر بے موج مستی کریں۔ پہلے میں نے کون سا سکھ دیکھا ہے اس گھر میں جو آگے جا کر میری بیٹیاں دیکھیں گی۔ بڑے سیانے کہہ گئے ہیں، کتیاں پیوداں تے لمبیاں دیاں (کرے باپ بھرے بیٹی)۔" کتنی بار ان کو یوں آپے سے باہر دیکھ کر تو خود مصطفیٰ کو لگ رہے کہ اب بھی بھلے سل گئے۔

سینہ مسلتے باہر کی طرف جاتا دیکھ کر انہوں نے جلدی سے کمرے میں پناہ لی تھی۔ ادھر نگینہ پھولتی سانس کے ساتھ قریب پڑی چارپائی پر ڈھے سی گئی۔ پریشہ پانی کا گلاس تھامے ماں کی طرف بھاگی تھی۔

☆☆☆

"گلالئی! دھیان سے، کہیں گر نہ جائیں۔"

کوہاٹ کے قریب ایک خوب صورت سر سبز جگہ پر گل بی بی نے نیچے اترنے کی ضد کی تھی اور اس بار بھی حیدر اور آیان کو ہی ان کی ماننی پڑی تھی مگر اب اس قدر اونچائی پر جب وہ ادھر اُدھر جھک کر تصویریں لینے کی کوشش کرتیں تو ان دونوں کی جان پر بن آتی۔

"کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ تم لوگ پریشان نہ ہو۔ پورے سو کھیل کے جاؤں گی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"ان شاء اللہ، مگر پھر بھی احتیاط لازم ہے گلالئی۔" حیدر کے پیچھے بیٹھ جانے پر اب ڈرائیونگ سیٹ اس نے سنبھال لی تھی۔

"اب دعا کریں سائیٹ کے قریب کوئی اچھا سا ہوٹل مل جائے۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے احتیاطاً بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوٹل۔ وہ کس لیے۔" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کے لیے اور کس کے لیے؟" اس نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

"میں اور حیدر تو وہیں سائیٹ پر ہی ہوں گے سارا دن۔ رات کو ہی آپ کو کمپنی دے پاؤں گا۔"

"لو۔ میں بھلا یہاں سائیٹ یا ہوٹل پر رہنے آئی ہوں۔" انہوں نے موبائل کی ٹچ اسکرین سے کھیلتے بے نیازی سے کہا۔

"تو؟" سوال حیدر اور آیان کا مشترکہ تھا۔

"ایک پرانی سہیلی رہتی ہے میری وہاں کھیلے کے پاس۔ اس کے پاس رہوں گی۔ اپنے ابا اماں کا گھر دیکھوں گی۔" ان کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

"چچازاد ہے میری، مگر تم بھی جو پوچھا ہو۔"

"او...... گلالئی!" اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دادی کو اپنے ساتھ لگایا تھا۔

"مگر وہ گھر تو عرصہ پہلے بک چکا تھا ناں۔"

"ہاں۔ تیرے دادا کو نہ جانے کون سی خارش تھی۔"

بیوی لگی کی لے لی، مگر گھر اچھا نہیں لگتا تھا ان کو لگی مروت کا اور میرے لیے تو بس ان کی بات ہی کافی ہوتی تھی۔'' ان کے خوب صورت صبیح چہرے پر بہت شرمگیں مسکراہٹ ابھری۔

''اوئے ہوئے گلالئی! آپ تو ایسے شرما رہی ہیں جیسے دادا آپ کو دیکھ کے خوش ہو رہے ہوں کہ ان کی بیوی اب بھی ان کی کتنی تابعدار ہے۔'' آیان شرارت سے بولا۔ حیدر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ دادی بس اس کے مضبوط شانے پر ہلکی سی چپت لگا کے رہ گئیں۔

''پھر بھی ہے تو میرے ابا اماں کا گھر ہی، دیکھنے تو ضرور جاؤں گی اور وہاں رہیں گے ز رمینے کے گھر ہی۔ تم لوگ بھی شام کو وہیں رہو گے ورنہ تمہیں پتا ہے، مجھے نیند نہیں آتی جب تک تم گھر میں نہ ہو۔'' انہوں نے صاف حکم سنایا تھا۔

''اچھا اچھا۔ مگر ان کا گھر یاد ہے آپ کو۔''

''اس کی شادی کے بعد ایک دفعہ گئی تھی میں وہاں۔ جیل کے کہیں آس پاس ہی تھا اس کا گھر۔ دریائے کمبیلا ان کے گھر کی چھت سے صاف نظر آتا تھا۔'' انہوں نے موبائل اسکرین پر نظر دوڑائی۔

☆☆☆

''عرف! چلو گھر چلو میرے ساتھ۔ امی نے پلوشہ کے لیے بہت پیارے پیارے کپڑے لیے ہیں، تمہیں دکھاؤں۔'' پریشہ نے کوئی تیسری بار اسے کہا تھا۔ وہ جو مسلسل نظر انداز کیے دور آسمان پر اڑتی پتنگ کو دیکھنے میں مصروف تھی، اس بار اس کی بات خاموشی سے نظر انداز نہ کر سکی۔

انسان خواہ خود کو کتنا ہی کیوں نہ بدلنا چاہے، اس کی فطرت بالآخر تڑپ تڑپ کے اپنے آپ کو ابھار ہی لیتی ہے۔ یہی کچھ عرف جمال مروت کے ساتھ تھا۔ وہ خود کو جتنا بھی سخت بنا لیتی، بے حس ظاہر کرتی۔ اپنے اردگرد کے اپنے رشتوں سے خود کو لاپروا دکھاتی۔ اسے خود کو مکمل طور پر ایسا بنانے پر بھی اختیار نہ رہتا اور جیت اس کی نرم دلی اور دوسروں کی پروا کرنے والی فطرت ہی کی ہوتی۔

پلوشہ اور پریشہ کے لیے وہ خود کو کئی بار باور کرا چکی تھی کہ ان سے اس کا کوئی رشتہ نہیں سوائے نام نہاد خونی رشتے کے لیکن پریشہ کی محبت اور لگاؤ اسے مجبور کر دیتا۔

پلوشہ البتہ اس سے چڑتی تھی لیکن اس کے اس رویے کی سمجھ آتے ہی اس نے خود ہی پلوشہ سے کسی حد تک بالکل کنارہ کر لیا تھا۔ اور اس کی وجہ تھے خان بابا، پلوشہ بڑی بیٹی ہونے کے ناتے اپنے باپ کا پیار عرف کے ساتھ بانٹنے سے قطعی انکاری تھی اور اسی چیز نے اسے عرف سے کافی بدظن کر دیا تھا۔

''عرف چلو ناں۔'' پریشہ نے اس کا کندھا ہلایا۔

''تم جانتی ہو، مورے مجھے پسند نہیں کرتیں۔'' اس نے اندر جا کر ایک چھوٹی سی بالٹی اٹھائی اور باہر آ کر بکری کا دودھ دوہنے لگی۔

''تو کیا ہوا، میں تو پسند کرتی ہوں۔'' وہ بھی اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ عرف مسکرا دی۔

''پھر بھی پریشے! تم جانتی ہو۔ میں ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ وہ پھر امی کے خلاف بولیں گی اور اب میں برداشت نہیں کر سکتی۔'' تازہ دودھ سے بالٹی مسلسل بھر رہی تھی۔

''وہ کمرے سے باہر نکلیں گی تو کچھ بولیں گی۔ پتا ہے اس دن امی نے خوب سنائی تھیں انہیں اور خاص کر تمہارے اور چاچی کے ذکر پہ تو مورے کو سانپ سونگھ گیا تھا۔'' عرف کے ہاتھ رک گئے تھے۔

''بابا نے بولنے کی کوشش کی مگر امی بولتی رہیں کہ وہ بھی چپ چاپ سنتے رہے۔'' عرف خاموشی سے کام نبٹاتی رہی جیسے اسے اس سب سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔

''اس دن کے بعد سے ابھی تک تو کمرے میں ہی محدود ہیں۔ پہلے تو میں ان کا تھوڑا بہت خیال رکھتی تھی، مگر اب سچ کہوں تو میرا دل بھی ان سے بدظن ہوتا جا رہا ہے۔ امی ان کا اتنا خیال رکھتی ہیں، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں بابا کے آتے ہی تماشا بنا دیتی ہیں۔ اب تو بابا بھی ان کی وجہ سے گھر لیٹ آنے لگے ہیں۔''

''پتا ہے پریشے! رشتوں کو بھی ناانصافیاں اور غلط بیانیاں کھا جاتی ہیں۔ مورے نے بس اسی لیے امی کو اور مجھے یہاں پھینک دیا کہ امی ان کی برادری سے باہر کی تھیں۔ یہ بھی نہیں تھا کہ بابا نے خود پسند کی شادی کی تھی۔ امی تو سسر دادا جان کی پسند تھیں، اس کے باوجود بھی دادی کبھی انہیں قبول نہیں کر پائیں۔'' اس نے پاؤں کے انگوٹھے سے سرخ اینٹوں کے درمیان پھنسی مٹی کریدتے ہوئے کہا۔

''ہم لوگ بھی کتنے عجیب ہیں نا۔ مرنے والوں کی چیزیں سنبھال کر رکھتے ہیں لیکن اس سے جڑے لوگ ہمیں یاد ہی نہیں آتے۔'' اس کی خوب صورت سنہری آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

''اچھا چھوڑو نا، چلو نا پلیز۔'' پریشہ نے اس کے ہاتھ پکڑ کر منت بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا یار چلو، تم بھی کیا یاد کرو گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کالے گھنگھریالے بالوں والی سفید گلابی سی لڑکی کا گال چھوا، وہ کھل اٹھی تھی۔

☆☆☆

پرانی سرخ اینٹوں سے بنی سڑک پر گاڑی ہچکولے کھانے لگی تھی۔ یہ ان کا آبائی محلہ تھا، پیتا خیال کا محلہ۔ تنگ گلی اور دونوں اطراف اونچے گھر، کچھ مکانات ویسے ہی تھے جیسے انہوں نے آخری بار دیکھے تھے۔ کوئی پچیس تیس سال پہلے۔

''کیسے کیسے واقعات نقش ہیں میرے ذہن میں، ان گلیوں اور ان گھروں سے وابستہ جیسے دل کی شریانوں میں خون نہیں یادیں دوڑتی رہی ہوں۔''

انہوں نے تقریباً تیسری گلی مڑتے ہوئے آیان کو بتایا تھا۔

''آپ ان ہی گلیوں میں کھیلی ہیں دادی۔'' وہ بھی اب پُرجوش تھا۔

گاڑی ایک لمبی گلی کے سامنے سے گزرنے لگی۔ انہوں نے پلک جھپکتے میں وہاں تین چار بچیوں کو کرتا پاجامہ پہنے، گول گول گھومتے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ کسی یاد کی پرچھائی تھی کیونکہ گلی ختم ہونے تک وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ مسکرا دی تھیں۔

''کمال ہے دادی! آپ کی یادداشت تو کمال کی ہے۔'' حیدر نے سراہا۔

''یہ یادداشت کا کمال نہیں حیدر بیٹا! یہ تو بچپن کی یادیں ہیں۔ انسان جتنا بھی بوڑھا ہو جائے۔ بچپن کی یادیں کبھی بوڑھی نہیں ہوتیں۔'' ان کی بات پر دونوں اثبات میں سر ہلا گئے۔

''بس یہیں روک دو گاڑی۔'' یہاں سے نیچے ڈھلان تھی۔ اس نے تیزی سے بریک لگائے۔ وہ ایک بڑے سے سفید گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ سفید رنگ کا وہ مکان جدت کا آئینہ دار تھا۔ دو منزلہ مکان شاید حال ہی میں تعمیر ہوا تھا کیونکہ ادھ کھلے چھوٹے گیٹ سے صحن میں پڑا لوہے کا سامان اور اینٹیں، سیمنٹ صاف نظر آ رہے تھے۔ گل بی بی کی آنکھوں سے اشک بہنے لگے۔

''گلالئی!'' آیان نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھرا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے نرمی سے گال صاف کیے۔

''اندر تو کام شروع ہے، کیا کریں گی؟'' اس نے دھیمے لہجے میں دادی سے پوچھا۔

''نہیں، انہوں نے تو لگتا ہے ایک اینٹ بھی نہیں چھوڑی پرانی۔ اجنبی عمارت میں کیا کروں گی جا کر۔'' انہوں نے آنکھوں سے چھلکتے پانی کو ٹشو میں جذب کیا۔

''تو اب کدھر جانا ہے۔''

''نیچے کی طرف ہی چلو۔ گوانڈی فقیر ہیں۔

قسمت سے آئے ہیں، دعا ہی کرتے چلے۔'' آیان نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

تقریباً بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ کھیتوں کے درمیان میں بنے اس خوب صورت مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ لکڑی کا دیو قامت دروازہ عجیب سی شان بخش رہا تھا اس گھر کو۔

''زرینہ مرتضیٰ جمال مروت کا گھر ہے یہ؟'' گاڑی کے قریب آتے اس معمر شخص سے سوال خود گل بی بی نے کیا تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔

''ان سے کہو گل بی بی آئی ہیں، ان کے بچپن کی سہیلی۔''

''آپ اندر چلی جائیں بی بی! اور صاحب آپ لوگ یہاں حجرے میں آ جائیں۔'' اس نے مؤدبانہ انداز میں باری باری ان کو مخاطب کیا۔

''نہیں کاکا! ہم لوگ رات میں ہی آئیں گے پھر، گھر دیکھنا تھا اور گل بی بی کو بھی چھوڑنا تھا۔''

''آپ لوگ لگتا ہے دور سے آئے ہو۔ چائے ناشتا کر لیتے تو......'' وہ مصر ہوا۔

''اصل میں ہمیں کچھ ضروری سامان پہنچانا ہے، بس اسی لیے۔ ان شاء اللہ شام کو ہم ملیں گے۔'' معمر آدمی کو تسلی دے کر وہ گل بی بی کی طرف مڑا۔

''گلالئی! آپ دیکھ لیں، ہم شام کو آئیں گے۔ اگر آپ کو آرام محسوس نہ ہو تو میں کوئی اور بندوبست کر لوں گا۔''

''بے فکر ہو کر جاؤ اور شام کو لازمی آ جانا۔'' انہوں نے مسکرا کر ہدایات دیں اور لکڑی کے اس بڑے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

زرینہ ان کو یوں اچانک اپنے سامنے پا کر اتنا حیران نہیں تھیں جتنا گل بی بی انہیں دیکھ کر۔ دراز قد، دودھ جیسی شفاف رنگت والی زرینہ، نحیف، ضعیف اور کرخت سانولے چہرے کی مالک ہو چکی تھیں۔ عجیب سی اجنبیت اور بے گانگی جھلکتی تھی اب ان کے چہرے سے۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں مگر ان میں کچھ ایسی چمک تھی جو گل بی بی کو نہ جانے کیوں چبھ سی رہی تھی۔

''تم بدل گئی ہو، مگر ہو ابھی تک ویسی ہی تر و تازہ۔'' دادی کی دوست اور وہ بھی اس قدر مہذب۔ ان سے مل کر پلوشہ اور پریشے دونوں ہی بے حد خوش تھیں۔ نگینہ البتہ خراب طبیعت کی وجہ سے بس خاموش ہی بیٹھی تھی۔ پلوشہ اور پریشے نے ہی مہمان نوازی سنبھال لی تھی، انہیں ان خاتون کی باتیں بے حد مزا دے رہی تھیں۔

''میرا چھوڑو۔ میں تو تمہیں دیکھ کے حیران ہوں۔ تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے۔'' انہوں نے نرمی سے ساتھ بیٹھی پریشے کے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زرینہ سے پوچھا۔

''تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں خیال رکھنے والے ملے ہیں۔ میرا تو نصیب ہی برا تھا شروع سے۔'' زرینہ نے نہ جانے کن نظروں سے ان کو دیکھا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھیں، ان کی آنکھوں میں رشک تھا یا حسد کے رنگ۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے۔ ہم سب دوستوں میں تم واحد لڑکی تھیں جس کی شادی بے حد ٹھاٹ سے ہوئی، امیر کبیر خاندان میں۔ دور دور سے لوگ اس شادی میں شرکت کرنے آئے تھے کیونکہ شادی کا کھانا ہر خاص و عام کے لیے رکھا گیا تھا پھر فدا بھائی نے تمہیں خود پسند کیا تھا۔'' ان کی بات پر قریب بیٹھی نگینہ کا تو پورا منہ کھل گیا جبکہ زرینہ سارا دن ان کی بیٹیوں کو یہی طعنے مارتے نہ تھکتی تھیں کہ ایک بہن نے تو لڑکا پھنسا لیا، اب دوسری کی باری ہے۔ آج کل کی لڑکیاں ہیں ہی ایسی تیز۔

''ہاں تو مجھے کب پتا تھا کہ انہوں نے مجھے پسند کر لیا ہے۔ میرا بس چلتا تو انکار کر دیتی۔'' ان کی بات نے ایک مرتبہ پھر گل بی بی کو شاکڈ کر دیا تھا۔

''ہمارے بابا کی بیٹھک میں آتے تھے اپنے بابا کے ساتھ۔ یاد ہے تم کتنا تنگ کرتی تھیں بہانے بہانے سے ان کو، تو بہ ہے مڑا (یار)۔ تم تو ہر بات بھول گئی ہو۔'' نگینہ کو یقین ہو گیا تھا۔ دوسروں کی باتیں اچھالنے والے کو خدا خود بے پردہ کر کے رکھ دیتا ہے۔

''اچھا۔ تم لوگ کہاں چلے گئے تھے۔'' انہوں نے بات ہی بدل دی تھی۔

''بس، تمہیں تو کوہاٹ کے ہی۔ نوکری کے سلسلے میں ادھر تھے۔ بابا کو پسند آئے تو جیسے ہی رشتہ بھجوایا۔ بابا نے قبول کر لیا، تبدیلی ہوئی تو پشاور چلے گئے، بس پھر وہیں گھر لے لیا۔ پھر بچوں کی جدائی نے کچھ زندگی کا پہیہ جام کیا۔ لیکن زندگی تو ہے ہی اللہ کی امانت۔ ہر چیز کو بالآخر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ انسان وہی ہے جو زندگی میں خود مقصد ڈھونڈے۔ میرے بیٹے کی وجہ تو پھر اللہ پاک نے بنا دی، میرا پوتا آیان علی سید۔ تب ہی میں نے اس کے لیے خود کو مرنے نہیں دیا۔

پتا ہے زرینہ! ہم بزرگ لوگ بس یہی چاہتے ہیں کہ چونکہ ہم ایک گھنے درخت کی طرح مضبوط جڑیں پکڑ چکے ہیں تو ہمارے نیچے اگنے والے چھوٹے پودے بے مایاں ہیں حالانکہ ان کی اپنی ایک ہستی ہوتی ہے۔ ایک حیثیت ہوتی ہے، اب یہ ہم بزرگوں پر ہے کہ ان ننھے پودوں کے لیے سایہ دار درخت بنیں یا ببول کی طرح ان کی زندگی کانٹوں سے بھر دیں۔'' وہ کس قدر پیارا بولتی تھیں، خوب صورت متناسب سراپے اور سرخ و سپید رنگت کی مالک خاتون جن کے چہرے سے نور چھلکتا تھا۔ زرینہ البتہ بیزار نظر آ رہی تھیں۔

''خیر۔ تمہاری بڑی بہو کہاں ہے، ایک بیٹی تھی نا شاید اس کی۔'' انہیں اچانک ہی خیال آیا تھا۔ زرینہ کی آنکھوں میں حیرت ابھری تھی۔

''ہمارے گھر اور زمینوں کو بیچ کر ہمارے پرانے مزارع جب پیسے دینے آئے تھے تو میں نے ان سے تمہارا پوچھا تھا، تب انہوں نے بتایا تھا کہ بالآخر تمہارے بڑے بیٹے کو بھی اللہ نے اولاد سے نواز ہی دیا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے خود سے بتانے لگیں۔

''آیان کس وقت تک آئے گا۔'' وہ بات بدل گئیں۔ گل بی بی کو عجیب سا لگا مگر وہ کچھ نہ کہہ سکیں تب ہی ٹیکسٹ کر کے آیان سے پوچھنے لگیں۔ اس نے ''چند منٹ میں نکلنے کی کوشش کرتا ہوں'' کا جواب دیا تھا۔

''وہ بس کچھ دیر میں آنے والا ہے۔'' انہوں نے بھی اس بار کوئی اور ذکر کرنے سے گریز کیا تھا۔

''اب تم تینوں کیا یہیں بیٹھی رہو گی۔ جاؤ رات کے کھانے کا انتظام کرو۔ مجھے ویسے بھی بہت سی باتیں کرنی ہیں اکیلے میں گل سے۔ کتنے عرصے بعد تو ملی ہے میری بہن۔'' زرینہ نے تلخ لہجے میں بہو اور پوتیوں کو جھڑکا تھا۔ اتنے اچھے مہمان کی خاطر داری میں ان تینوں کو ہی کوئی عذر نہ تھا سو خاموشی سے چل دیں۔

''کیوں اٹھا دیا سب کو۔ ملازمہ بھی تو ہیں نا۔'' گل بی بی کو ذرا اچھا نہ لگا۔

''تم نے بھتیجی کا پوچھا تھا نا۔ اب بچیوں کے سامنے کیا بتاتی۔ اس چڑیل نے تو ایسا پھنسایا میرے بچے کو کہ بس جان لے کر ہی چھوڑا۔'' دھنسی دھنسی آنکھوں میں پانی کم اور سرخی زیادہ دکھنے لگی۔

''پوتی کو بھی مجھ سے جدا کر دیا۔ الگ رہتی ہے وہ، بچی کو مجھ سے یا اس کی چچا زاد بہنوں سے ملنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔'' وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولیں۔

''میرے خدا۔'' نازک سی گل بی بی تو دل تھام کے رہ گئیں جب کہ دروازے کے اس پار کھڑی نگینہ نے بے اختیار دعا کی تھی۔

''یا اللہ۔ دادی کا کیا میری بیٹیوں کے سامنے مت لانا۔ بے شک تو ہی نیتوں کو جاننے والا ہے۔''

☆☆☆

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ گل مروت کی روایتی ڈش ٹوبت اور ساتھ میں مٹن بریانی۔ اس نے آج

ساری احتیاط ایک طرف رکھ کے خوب پیٹ بھر کر کھایا تھا تب ہی طبیعت بوجھل سی ہوگئی تھی۔

''سر! میں ذرا باہر گھوم پھر آؤں۔'' ذرا دیر تکیے سے ٹیک لگا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مصطفیٰ جمال مروت کو نیلی آنکھوں، دھیمے لہجے والا وہ لڑکا دل سے بھایا تھا۔

''ہاں ضرور۔ مگر احتیاط سے، کھیتوں کی وجہ سے یہاں سانپ اور بچھو بکثرت پائے جاتے ہیں۔'' انہوں نے خان کاکا کو اس کے ساتھ جانے کی ہدایت کی۔

''صاحب یہ بڑی سڑک مین روڈ تک جاتی ہے اور چھوٹی پکی پگڈنڈی گھر کے چاروں طرف اور ٹیوب ویل تک۔'' خان کاکا نے اس کے ساتھ باہر آتے ہوئے اسے بتایا۔

''کاکا! آپ آرام کریں۔ میں اسی چھوٹی پگڈنڈی تک ہی چکر لگا کر واپس آجاؤں گا۔'' ان کی عمر کی وجہ سے وہ انہیں تھکانا نہیں چاہتا تھا تب ہی انہیں آرام سے منع کرتا وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا، اس چھوٹی پگڈنڈی نما راستے پر چلنے لگا۔ چاند پورا تھا تب ہی دور دور تک منظر بے حد واضح تھے۔ وہ ایک طرف سے ہوتا ہوا گھر کی پچھلی طرف آگیا۔ چاردیواری سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر کس قدر بڑا تھا۔

تازہ ہوا نے اس کا موڈ بے حد خوش گوار ہوگیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا سیدھے راستے پر چلتا رہا تب ہی اچانک اس نے کسی کی ہنسی کی آواز سنی۔ آیان نے دیکھا، ایک چھوٹا سا راستہ اس طرف جارہا تھا۔ اب وہ سفیدے کے درختوں تلے تھا، اب کی بار پھر کوئی ہنسا۔ یہ کسی لڑکی کی ہنسی تھی، رات کے اس پہر یوں کھیتوں میں کسی لڑکی کی ہنسی۔ اسے بچپن کی دیو مالائی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ اس وقت کسی بھی لڑکی کا اس جگہ ہونا ناممکن سی بات تھی۔

''سچ میں وہ ایسی ہیں؟'' کسی لڑکی نے حیرت سے پوچھا تھا۔ یہی لڑکی شاید کچھ دیر پہلے ہنسی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اب بھی اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تھی۔

''ہاں یار! سچ میں، وہ ایسی ہی ہیں۔ ٹائٹ بلیو جینز، چوڑی دار پاجامے کی جگہ اور ڈھیلے ڈھالے کرتے کی جگہ نشاط کی کھلی کھلی سی شرٹ۔ ایک ہاتھ میں سونے کی نازک سی چوڑیاں اور دوسرے ہاتھ میں کالی گھڑی اور سب سے عجیب بات پتا ہے کیا ہے؟'' دوسری لڑکی بہت پرجوش تھی۔

''کیا؟'' پہلی والی نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''وہ عام بوڑھی عورتوں کی طرح ہوائی چپل یا بند کھسہ نہیں پہنتیں بلکہ وہ جو بھائی کرکٹ کھیلنے کے لیے آرام دہ شوز پہن کر جاتا تھا نا ویسے والے جوتے پہنتی ہیں وہ۔''

''اللہ اللہ...... پچی۔'' چاند کی کھلتی روشنی میں وہ دونوں اسے صاف نظر آرہی تھیں۔

''مچی...... '' وہ جو کوئی بھی تھیں یقیناً اس کی دادی کے بارے میں بات کررہی تھیں لیکن وہ تھیں کون؟ کیا وہ مصطفیٰ صاحب کی بیٹیاں تھیں؟ اسے پہلا شک یہی ہوا تھا۔

وہ ذرا سا آگے بڑھا تھا، اس کی یہ حرکت بالکل غیر ارادی تھی۔ کھٹکا سا ہوا تھا، کسی چیز میں اس کا پاؤں الجھا تھا، شاید کسی درخت کی باہر ابھری جڑ میں، دونوں لڑکیاں فوراً چوکنا ہوئیں۔ آیان خود کو سنبھالتے سیدھا ہوا ہی تھا کہ گولی کی طرح کوئی نوکیلی چیز اس کے بائیں گال کو چھو کر نکل گئی۔ وہ کراہ اٹھا۔ ہاتھ خود بخود گال پر جم گیا، سامنے والی لڑکی اب اسے واضح نظر آرہی تھی، وہ غلیل میں دوسرا پتھر جوڑ رہی تھی۔

''اے......'' وہ چلایا۔

''تم پاگل ہو۔'' غلیل کا ربڑ کھینچتی لڑکی کو دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ لاشعوری طور پر دونوں لڑکیاں پیچھے ہٹی تھیں۔

''پاگل ہوگئے تم۔'' اس نے صاف محسوس کیا تھا کہ پیچھے والی لڑکی جس قدر ڈرپوک سی تھی، سامنے والی اسی قدر نڈر اور تیز۔ آیان کے بالکل سامنے آجانے اور پیچھے بڑے نالے کی وجہ سے سارے راستے بند ہوجانے کے باوجود وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اسے کوئی ڈر نہیں تھا۔

''تم ہو کون؟'' اس نے رات کے اندھیرے میں جگنو کی طرح چمکتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' لڑکی نے مسلسل غلیل اس کی طرف ہی کھینچ رکھی تھی۔

''یہ زمین ہماری، علاقہ ہمارا۔ تم کون ہوتے ہو ہم سے پوچھنے والے۔'' اس لڑکی کی بہادری اسے واقعی حیران کیے جارہی تھی۔

''اوہ، تو تم مصطفیٰ صاحب کی بیٹیاں ہو۔'' وہ مسکرایا، ہاتھ ابھی تک گال پر تھا۔ مسکرانے سے اٹھنے والا درد اس کی نیلی آنکھوں میں چھلکا تھا۔

''تم سے مطلب۔'' وہ لڑکی بدلحاظی میں ٹاپ کرتی اگر ایسی کوئی یونیورسٹی ہوتی۔ آیان کو غصہ آنے لگا۔

''پیچھے ہٹو۔'' لڑکی نے دوبارہ غلیل سیدھی کی۔

''نہ ہٹوں تو۔'' اس بار اس نے بھی سارے لحاظ پر فاتحہ پڑھ لی تھی۔

''تو......'' لڑکی کی شعلہ بار آنکھوں میں جیسے سوچ سی ابھری اور اگلے ہی پل ایک بار پھر آیان کو اچھلنا پڑا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی ایڑی والی جوتی بڑی نفاست سے اس کے پیروں پر دے ماری تھی۔ وہ اچھل کر واقعی چند قدم دور چلا گیا تھا۔

''نکلو پریشے۔'' غلیل تانے اس نے پریشہ کو مخاطب کیا۔

''نہیں عرف! تم ساتھ چلو، تب......'' پریشہ ڈر کے مارے اتنا ہی بول پائی۔

''لگتا ہے تمہیں سبق سکھانا ہی پڑے گا۔'' وہ غصے میں ان کی جانب بڑھا تھا۔ عرف نے فوراً غلیل کھینچی۔

''واہ جی واہ۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری، سبق بھی ہمیں۔ تمہیں کس نے کہا تھا، رات کو اس طرح چوروں کی طرح ہمارے کھیتوں میں گھسنے کا۔ ہم تو یہی حال کرتے ہیں۔'' وہ اب نالے کی سائیڈ پر تھیں اور آیان ان سے چند قدم دور۔

''تو تمہیں بھی چڑیلوں کی طرح اس وقت یہاں گھومنے کا کس نے کہا تھا۔'' اسے بولتے ہوئے بھی تکلیف ہو رہی تھی۔

''پری! لگتا ہے یہ گل دادی کے ساتھ ہیں۔ چلو یہاں سے۔'' پریشہ نے نزدیک آنے پر آیان کے حلیے پر غور کرتے ہوئے کہا۔

''پری!'' آیان نے ہیٹی کے سے انداز میں لب سکیڑتے ہوئے کہا۔ جیسے اسے شدید شاک لگا۔

''نام پری، لگتی تو چڑیل ہے پوری۔'' وہ لب کھلتے ہوئے اپنی ہنسی سے بولا تھا۔ عرف نے پریشہ کو دھکا لگا کر پیچھے ہٹتے ہوئے اسے دیکھا اور آیان جواب بے فکر سا گال سہلائے جارہا تھا کہ لڑکیاں اسے پہچان چکی ہیں تو اب کوئی خطرہ نہیں، کو بغور دیکھتے ہوئے غلیل کا ربڑ چھوڑ دیا تھا۔ اس بار ننھا سا پتھر ٹھوڑی پر لگا تھا۔

''بھاگ پریشے!'' آیان کے جھکتے ہی وہ چلائی تھی اور دونوں سرپٹ دوڑ پڑیں۔

''رکو۔'' وہ بے بسی سے بس چلا ہی سکا تھا مگر وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگئیں۔ آیان علی سید نے گال چھوڑ کر ٹھوڑی سہلاتے ہوئے جتنی بھی گالیاں کتابوں میں پڑھی تھیں، دل ہی دل میں اس لڑکی کو دے ڈالیں۔

☆☆☆

مصطفیٰ اس کے نیل پڑے گال اور ذرا سی اوپر کو ابھری ٹھوڑی دیکھ کر پریشان ہوگئے تھے۔ ان دونوں لڑکیوں کے حلیے اور بات چیت سے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اسی گھر کی بیٹیاں (بقول آیان کے ایک چڑیل اور ایک بٹی) ہیں۔ اس کے دل میں جانے کتنا ہی غصہ تھا، مگر ان کو یہ بات نہیں بتا سکا تھا۔

"روشنی زیادہ کی تو یوں ہی ذرا درختوں کے نیچے چلا گیا تھا مگر کسی چیز سے پاؤں الجھ گیا۔ خود کو سنبھال تو لیا مگر پھر بھی چہرہ درخت کی چھوٹی شاخوں سے رگڑ کھا گیا۔" اسے بتاتے ہوئے بے حد شرمندگی ہو رہی تھی۔ دل ہی دل میں خود کو سرزنش جاری تھی۔

"سالار سکندر بنے پھرتے ہو اور لڑکی کے ہاتھوں پٹ کر آگئے۔"

"اسے چھوڑوں گا تو میں بھی نہیں۔" وہ بڑبڑایا تھا۔

"کیسے؟" مصطفیٰ حیران ہوئے۔

"سوری۔ بس ایسے ہی۔" وہ بامشکل مسکرایا۔

"صاحب آپ کو اندر دادی بلا رہی ہیں۔" کاکا نے آکر اطلاع دی۔

"چلو بیٹا! تمہارا کمرہ تیار ہے، تم جا کر آرام کرو۔ میں بھی کچھ دیر آرام کروں گا۔" مصطفیٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، وہ سر جھکا گیا۔ وہ بیٹھک کے اندرونی دروازے سے جھجکتا باہر آیا تو گلالئی سامنے ہی ٹہل رہی تھیں۔

"اوپر والا کمرہ تمہارے لیے سیٹ کروادیا ہے۔ اس کا راستہ پیچھے کی طرف بھی ہے، سو اس طرح تم اپنی مرضی سے آجا سکو گے۔ ویسے بھی یوں سمجھو تمہاری دادی خالہ کا گھر ہے مگر مجھے چونکہ تمہاری طبیعت کا پتا ہے تو میں نے یہی مناسب سمجھا۔" وہ اسے ساتھ لیے سیڑھیوں کی طرف آتے ہوئے بولیں۔

"شکریہ گلالئی!" اس نے محبت سے دادی کو اپنے ساتھ لگایا۔

"چاہو تو کل حیدر کو بھی ساتھ لے آنا۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ میں تو کہوں گا آپ یہاں اچھے سے ہیں تو میں بھی وہیں رہ لوں۔ ٹھیک ٹھاک انتظام ہے۔"

"نہیں نہیں۔ تمہیں پتا ہے پھر میرا دل ہولتا رہتا ہے۔" انہوں نے صاف انکار کیا۔

"اچھا۔ جیسے آپ کی مرضی۔" وہ مسکرایا۔

"ویسے کتنے دن تک ہیں یہاں؟" گلالئی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"پندرہ دن کا سرچ ورک ہے۔ اس کے بعد وہیں جا کے ڈیسائیڈ کرنا ہوگا یہاں دوبارہ آنا ہے یا نہیں۔"

"اچھا تم آرام کرو۔ سامان وہاں الماری کے نچلے خانے میں رکھا ہے تمہارا۔" گلالئی نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔" وہ مختصر جواب دے کر ادھر مڑ گیا۔

"آیان۔" گل بی بی نے اچانک اسے پکارا تھا۔ وہ مڑ کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں اس کے سفید گال پر پڑا وہ گہرا نیل دادی کی نظروں میں آگیا تھا۔

"کچھ نہیں دادی۔"

"آیان!" وہ جیسے اسے جانچتی نظروں سے دیکھتی مزید قریب آگئیں۔ اس نے تھوڑی چھپانے کے لیے سر جھکا دیا مگر دادی نے تھوڑی چھو کر اس کا منہ اوپر کرنا چاہا تھا اس کے منہ سے سسکاری نکل گئی۔

"آیان کیا ہوا ہے؟" وہ تھوڑی کی سوجن بھی دیکھ چکی تھیں۔ آیان نے وہی بہانہ دہرایا جو وہ کچھ دیر پہلے مصطفیٰ خان کو بتا کر آیا تھا۔

"حیرت ہے۔ یہ زخم ایسے لگتے تو نہیں۔" وہ جانتا تھا۔ گل بی بی کو ٹالنا آسان نہیں تھا۔

"ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے تمہیں قریب سے ہی غلیل یا چھروں والے ننھے پستول سے نشانہ بنایا ہے۔" ان کے اس قدر درست تجزیے پہ آیان کا منہ کھل گیا۔

"کس نے کی یہ حرکت؟" انہیں غصہ آنے لگا تھا۔

"مصطفیٰ انکل کی بیٹیاں تھیں شاید۔" اس نے پورا واقعہ بتانے کے بعد اپنا اندازہ بھی بتایا۔

"وہ دونوں تو بے حد سمجھ دار اور سلجھی ہوئی طبیعت کی ہیں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"تو صورت حال بھی تو اتنی اچانک تھی۔ اس کا ردعمل تو قدرتی تھا، بس اس طرح نشانہ تاکنے سے پہلے اسے کم از کم پوچھ تو لینا چاہیے تھا۔" آیان نے سامان سے دوا نکال کر لگاتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی یہ جو دوسری بار تھوڑی پر ماری ہے، یہ حرکت سراسر جان بوجھ کر کی اس کی۔ اگر ایک لڑکی پریشہ تھی تو دوسری بلوشہ ہوگی؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"نہیں گلالئی! کوئی عجیب سا لڑکوں جیسا نام تھا اس کا۔ عارف...... یا شاید اعراف۔" وہ چاہ کر بھی اس کا نام یاد نہ کر سکا۔

"ہمم...... مطلب وہ مصطفیٰ کی لڑکی تو ہرگز نہیں تھی۔"

"خیر، آپ آرام کریں گلالئی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ پچھے صحت میں سے راستہ ہے۔ میں دکھا دوں گی کل، مگر ابھی تم آرام کرو۔" گل بی بی دروازے کی طرف بڑھیں۔

"میں نے دیکھ لیا ہے، ڈونٹ وری۔ آپ بےفکر رہیں۔" اس نے انہیں تسلی دی۔ وہ اثبات میں سر ہلا گئیں۔

☆☆☆

صبح وہ حسب معمول فجر کے وقت ہی اٹھ گیا تھا۔ وضو کرتے وقت اس نے آئینے میں شاید پہلی دفعہ اپنا چہرہ اس قدر غور سے اور بار بار دیکھا تھا۔ نیلے سے اب کالے رنگ کی طرف سفر کرتا ہوا وہ نیل اسے دوبارہ تاؤ دلانے لگا تھا۔ تھوڑی الگ عجیب لگ رہی تھی۔

"سائیٹ پہ گیا تو آج سب بس ایک ہی سوال پوچھیں گے، سر کیا ہوا؟" وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

"اور اگر کسی نے دادی کی طرح جج ہی کر لیا تو۔" اگلا خیال مزید جاں گسل تھا۔ اس نے آج سائیٹ پر نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ نماز ادا کرنے کے بعد اس نے کچھ دیر تلاوت کی، پھر باہر نکل آیا تھا۔ سورج طلوع ہونے کے لیے پر تول رہا تھا مگر ادھر ادھر سے اڈتے ننھے ننھے بادلوں کے ٹکڑے شعاعوں کا راستہ روکنے کی کوشش میں تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا نے عجیب سا سرور بھر دیا تھا اس کے رگ و پے میں۔

اس نے جاگرز پہنے اور پچھلی طرف جانے والی نسبتاً تنگ سیڑھی سے نیچے آگیا۔ سیڑھی کے اختتام پر ایک چھوٹا تنگ گیٹ تھا، یہ بالکل ان کے پشاور والے گھر کی طرح تھا۔ اس نے گیٹ کھولا اور باہر نکل آیا۔ سامنے ہی سفیدے کے درختوں کا جھنڈ اور ٹیوب ویل کا بڑا نالہ تھا یعنی وہ بالکل رات والی جگہ کے سامنے کھڑا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ اپنے گال کی طرف گیا۔

"توبہ، کیا لڑکی تھی۔ نہ جانے کس کا نصیب پھوڑے گی۔" اس نے دل ہی دل میں کان پکڑ کر استغفار کیا اور کچھ دیر وارم اپ ہونے کے بعد اسی چھوٹی کچی سڑک پر دوڑنے لگا۔ پچھلے حصے کے بالکل آخری کنارے اس نے مضبوط دیوار کے ساتھ لگی کچی مگر خستہ دیوار کا فرق واضح محسوس کیا تھا۔ شاید وہ جانوروں کا باڑہ تھا جو اکثر ان علاقوں میں اس نے گھروں سے ملحق دیکھے تھے۔ وہ اپنی دھن میں سیٹی بجاتا آگے بڑھتا گیا۔

تب ہی کسی چیز نے اسے چونکایا۔ وہ ذرا سا واپس مڑا۔ دیوار ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی زمین کے قریب سے کچھ اونچائی تک گولائی کی صورت میں اینٹیں ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہاں شاید قدرتی طور پر وہ راستہ بنا تھا۔ لیکن اس کے یوں رکنے کی وجہ وہ دروازہ نہ تھا بلکہ دیوار کے بالکل قریب کچی سڑک پر پڑی غلیل تھی۔ تب ہی آسمان نے رم جھم برسانا شروع کر دی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر غلیل اٹھانے لگا۔

"صبح صبح کیا ڈھونڈ رہی ہو گل پری!" آواز

اس ٹوٹی پھوٹی عمارت کے اندر سے آئی تھی۔ اس نے کھلی جگہ سے اندر نگاہ دوڑائی۔ بے حد پرانے سرخ اینٹوں والے فرش کا بھی تقریباً یہی حال تھا جو اس دیوار کا تھا۔ جگہ جگہ خودرو ننھے پودے سر اٹھا رہے تھے۔ سامنے ہی دو کمرے تھے۔ ایک نسبتاً بڑا، دوسرا قدرے چھوٹا۔

"امی! ایک چیز رکھی تھی، اب نہیں مل رہی۔" اندر بڑے کمرے سے وہی آواز سنائی دی۔ جسے وہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ در آئی۔ وہ جانتا تھا جو چیز وہ ڈھونڈ رہی تھی، وہ اب اس کے پاس تھی۔

"چیز کیا تھی؟ نام تو بتاؤ۔ کیا پتا میں نے دیکھی ہو۔" اس کی ماں نے دوبارہ کہا۔

"غلیل۔" وہ ماں کو بتاتی باہر آئی۔ بارش ہلکی تیز ہوئی۔ زرد رنگ کی فراک پر سبز دوپٹہ اوڑھے وہ دھنک صورت لڑکی اس کی نظروں کے بالکل سامنے تھی۔ لمبے کالے بال اوپر سے چوٹی کی صورت میں باندھ کر نیچے سے کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ وہ غیر ارادی طور پر اسے یوں ہی دیکھے گیا۔

"توبہ ہے۔" اس نے خود کو خود ہی سرزنش کی تھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب بارش میں بھیگ کر کیا بیمار پڑنا ہے۔ ناشتا تیار ہے، اندر آجاؤ۔" اس نے اماں کی آواز سنی۔

"اماں بس تھوڑی سی پھیریاں (چکر) کھالوں۔" مسکراتی آواز نے نہ جانے کیوں دور تک اس کی سماعتوں کا پیچھا کیا تھا۔ نہ جانے کیوں اسی کو سوچتے اس نے باقی واک مکمل کی۔ وہ کمرے میں آیا تو گلالئی اس کی منتظر تھیں۔

"سائیٹ پر نہیں گئے؟" پہلا سوال آیا۔

"نہیں۔ ہر ایک کے سوال سے بچنے کا یہی طریقہ صحیح لگا مجھے۔" وہ شوز اتارتے ہوئے بولا۔

"پریشہ ناشتا رکھ کے گئی ہے۔ کرلو تو نیچے میرے ساتھ چلنا۔" باتھ روم میں گرم پانی سے تولیہ گیلا کرتے ہوئے آیان نے ایک نظر دادی کو دیکھا تھا۔

"وہ کیوں؟" چہرے اور گردن کو رگڑتے ہوئے وہ باہر آیا تھا۔

"کل تم اتنی دیر سے آئے تھے، پوری فیملی سے ملوا ہی نہیں سکی۔ زرینہ کو بھی تم سے ملنے کا اشتیاق ہو رہا ہے۔"

"مگر دادی اس طرح انجان لوگوں، وہ بھی عورتوں میں جا کر کیا کروں گا میں۔" تولیہ کرسی پر ڈالتا وہ چائے نکالنے لگا۔

"انجان کیوں بھلا؟ رشتے میں تمہاری دادی خالہ ہیں۔ پریشہ اور پلوشہ کو بہن ہی سمجھو۔ بہت اچھی لڑکیاں ہیں، بچی پلوشہ کا رشتہ نہ ہو چکا ہوتا تو میں تمہارے لیے مانگ لیتی۔" چائے پیتے آیان کو زور سے کھانسی آئی۔

"آرام سے پیو۔ چائے کا کپ کوئی نہیں چھین رہا تم سے۔" گل بی بی اسے گھور کے رہ گئیں۔

"آپ پلیز یہاں میرے رشتے نہ تلاشیں۔ آرام سے اپنوں میں وقت گزاریں اور پھر رات گئی بات گئی۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" گل بی بی ہار مان گئیں۔

"اچھا میں نے چوری چوری پریشہ سے بات کی تھی۔ وہ تمہی کی بنی طرف تھی۔ پریشہ تو اس کی بہت تعریفیں کر رہی تھی مگر چونکہ میرا غائبانہ تعارف اس سے زرینہ نے بھی کرا دیا تھا تو میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں کہ اس سے ان ہی حرکتوں کی توقع کی جاسکتی تھی جو اس نے تمہارے ساتھ کیا۔" پراٹھے کے دو تین نوالے لے کر ہی اس نے ٹرے پرے کھسکا دی اور صرف چائے پینے لگا۔

"اللہ بس بچائے ایسی بہو بیٹیوں سے۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"بے چاری زرینہ کو بہو اور پوتی نے بالکل ضعیف کر کے رکھ دیا ہے حالانکہ بس کوئی چار پانچ سال ہی بڑی ہوں گی مجھ سے۔ خیر تم جلدی سے نیچے آؤ، سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" اسے ہدایت کرتی وہ باہر چلی گئی تھیں اور آیان لاشعوری طور پر ان ماں بیٹی کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆☆☆

"بھائی آپ بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں؟" پریشے کی حیرت زدہ آواز پر سب ہی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ رات کا کھانا وہ گلالئی اور زرینہ بی بی کے ساتھ کھا رہا تھا۔ زرینہ کی دونوں پوتیاں بالکل سگے بھائی کی طرح ہی اس کی آؤ بھگت کر رہی تھیں۔ پریشہ نے اچانک ہی اسے نوٹس کیا تھا اور پوچھے بنا نہیں رہ سکی۔

"تو صرف کھانا۔ یہ تو ہر کام الٹے ہاتھ سے کرتا ہے۔" گل بی بی نے مسکراتی آنکھوں سے پوتے کو دیکھا تھا۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں التجا کی۔

"بلکہ اس کا تو ہر کام ہی الٹ ہوتا ہے۔ لوگ وہی کرتے ہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں اور آیان علی سید وہ کرتا ہے جو وہ نہیں کرنا چاہتا۔" انہوں نے کہا تو پریشے مزید حیران ہوئی۔

"وہ کیسے دادی؟" فوراً سوال کیا۔ آیان کا دل چاہا وہ کسی جن کی طرح منظر سے غائب ہو جائے اور کم از کم تب دادی کو "غیبت" کا گناہ تو مل جاتا۔ اب تو انہوں نے منہ پر اس کی ہر برائی بتانی تھی اور وہ بھی بڑے فخر سے۔

"وہ ایسے کہ سب سے پہلے تو اس کی یہی عادت دیکھ لو۔ کھانا پینا، لکھنا، کپڑے پریس کرنا۔ بجلی یا مرمت کا اور کوئی کام کرنا ہو تو الٹے ہاتھ سے ہی کرے گا پھر اس دور میں نئے نئے پرائیوٹ اسکولز کھلے تھے۔ ہر بچے کی خواہش ——— تھی کہ وہاں جائیں مگر یہ نہ جی سرکاری اسکول میں ہی پڑھائی کی اور خوب دل لگا کر کی۔

پھر شوق تھا ڈاکٹر بننے کا۔ بچپن سے دواؤں کے بارے میں جاننا اور ان کی مکمل معلومات بھی حاصل کرتا مگر فرسٹ ایئر تک آتے آتے جس کام سے سخت نفرت تھی۔ وہی کرنے کا جنون چڑھ گیا، مطلب پہاڑ کھودنا، کان کنی اور کاکروچ سے......"

"میں ابھی آیا۔" اس کا مزید بیٹھنا اسے محاورتاً نہیں سچ میں زندہ زمین میں گاڑ دیتا، تب ہی وہ فوراً وہاں سے نکلا تھا۔ البتہ اس نے جاتے جاتے بھی دادی کی مکمل بات سن لی تھی۔

"کاکروچ سے لڑکیاں ڈرتی ہیں، مگر ادھر ہمارے آیان میاں کی جان جاتی ہے۔" سب ہنسنے لگے، وہ تیزی سے اوپر آیا تھا۔

"توبہ ہے دادی بھی نا اچھا خاصا شرمندہ کروا دیتی ہیں۔" اس نے پھولی سانس بحال کی اور کھیتوں کی سائیڈ پر لگی لوہے کی مضبوط گرل کے پاس آ ٹھہرا۔ یہاں سے اردگرد کا منظر بے حد واضح تھا۔ تاحد نگاہ لہلہاتے سرسبز کھیت اور لہراتے درخت، اسے عجیب سا سکون محسوس ہونے لگا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

"گل پروا میں ذرا تمہاری دادی کی طرف ہو آؤں، کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔" تب ہی اس نے ساتھ والے گھر سے آواز سنی تھی، وہ ذرا سا آگے ہوا۔

"امی میں نے آپ کو کئی بار سمجھایا ہے کہ اب ہم ان کے خاندان کا حصہ نہیں ہیں۔ آپ کا جانا نہ جانا ایک برابر ہے ان کے لیے، بلکہ نہ جانا ہی پسند ہے ان کو۔" تلخ سی آواز نے کانوں میں بھی کڑواہٹ گھول دی۔

"صرف تمہاری دادی! تم جانتی ہو باقی سب کا رویہ ٹھیک ہوتا ہے۔" وہ صحن کے بالکل آخر میں کھڑی چادر اوڑھ رہی تھیں تب ہی اب صاف نظر آرہی تھیں۔

"اچھا اچھا، جائیں آپ۔ میری کب سنی ہے آپ نے۔" بڑا سا گلابی دوپٹہ لہراتے وہ گلی کے دروازے کے قریب رکھی چارپائی پر پڑی دھلی ہوئی سوکھی گندم تھال میں بھر بھر کے ساتھ پڑے ٹوکرے میں ڈالنے لگی۔

"اچھا۔ اب تم میری ٹینشن میں سارا کام نہ نمٹا

لیتا۔ میں بس دو لفظی ہی بھیجوں گی۔" دروازے سے نکلتے ہوئے انہوں نے فکر مند انداز میں کہا تھا۔

"اچھا، آپ جائیں۔ پریشان نہ ہوں۔" وہ گندم ہتھیلی کی مدد سے تھال میں ڈالنے لگی۔ آیان واپس کمرے میں پلٹ آیا۔ سردیاں شروع ہو گئی تھیں، کل رات ہونے والی بارش نے موسم کافی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ تب ہی آج صبح سرد اور خنک تھی، اس نے اونی شال نکال کر اوڑھی اور دوبارہ ادھر ادھر کے منظر دیکھنے لگا۔

ایک مرتبہ پھر یوں ہی اس کی نظر بھٹکی تھی۔ نہ جانے یہ لڑکی کیا کیا کرنا جانتی تھی، اس نے صرف تھوڑی دیر بعد ہی اسے جانوروں کے گوبر سے اپلے بناتے دیکھا تھا۔ اندھیرا چھانے لگا تھا، صرف کچھ ہی دیر میں اس نے تقریباً آدھی ہی دیوار اپلوں سے بھر دی تھی۔ پھر نل پر جا کر صابن سے رگڑ رگڑ کے ہاتھ دھوئے تھے اور ایک ایک کر کے کھونٹے سے بندھی گائے اور بکریوں کو گھاس پھوس سے بنے چھپر تلے باندھ دیا۔ اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"کمال ہے مطلب یہ لڑکی ان پڑھ ہے۔" اس نے نہ جانے کیوں دکھ سے سوچا تھا۔ صحن میں پھرتی مرغیوں کو ایک پھوار دانہ پھینک کر جیسے اس نے ان کی بھوک کو جانچنا چاہا تھا۔ مرغیاں بس ایک دوبار چونچ مار کر ادھر اُدھر ہو گئیں۔ عرف نے لمبی سی چھڑی اٹھائی اور انہیں دیوار کے ساتھ بنی (چھوٹی سی کوٹھڑی) کوڈل میں بند کر دیا۔ اتنے کم وقت میں اس نے کتنا سارا کام نبٹا لیا تھا۔

وہ واپس اندر آ گیا، کچھ دیر لیپ ٹاپ پر کام کر کے اس نے فیس بک۔ کھول لی۔ گروپ میں سالار سکندر ہی زیر بحث تھا، ہمیشہ کی طرح امامہ (اس کی دادی) پوری طرح گروپ پر چھا چکی تھیں۔ سالار کے بارے میں ان کے خوب صورت اسٹیٹس نے دھوم مچا رکھی تھی۔

سالار سکندر نے امامہ ہاشم کو قیمتی ہیرے کی انگوٹھی دی تھی، جس پر ایک طوفان مچا تھا۔ مختلف قسم کے کمنٹ آ رہے تھے۔ امامہ ہاشم کی صرف ایک پوسٹ جس میں خوب صورت ہیرے کی انگوٹھی والے ہاتھوں کی تصویر کے ساتھ بہت خوب صورت شعر پوسٹ کر رکھے تھے۔ ہر کوئی داد دے رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے دادی کی تصویر پر کمنٹ دیا اور موبائل آف کر کے سائیڈ پر رکھ دیا۔

تب ہی اس کی نگاہ سامنے ٹیبل پر رکھی غلیل پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت چمکی۔ اس نے غلیل اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ باہر اندھیرا تھا۔ چاند کی روشنی اس اندھیرے کو شکست دینے کی کوششوں میں تھی۔

سیڑھیاں اتر کر وہ گیٹ کھولتا باہر گلی میں آ گیا۔ ہاتھ میں تھامی غلیل پر گرفت سخت تھی۔ آج وہ ٹہلنے نہیں نکلا تھا سو سیدھا اسی جگہ آ گیا۔ جہاں اس رات اس لڑکی نے اسے ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ وہ زیادہ نہ سہی تھوڑا سا ادھار چکانا چاہتا تھا۔ سفیدے کے درختوں کے بالکل قریب اس نے آوازوں سے وہاں ان کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

وہ آم کے درخت کے نیچے پڑے بڑے بڑے پتھر پر بیٹھی، باتوں میں مصروف تھیں۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر آہٹ پیدا کیے بنا تنے کی بچی سائیڈ پر پیر جماتا چپ چاپ اسی پیڑ پر چڑھ چکا تھا۔ جس کے نیچے وہ دونوں بیٹھی مزے سے باتوں میں مصروف تھیں۔

گفتگو کا موضوع کوئی ڈراما تھا جس کی خوبیاں اور خامیاں گنوائی جا رہی تھیں۔ آیان نے پاؤں مضبوطی سے ایک موٹی شاخ کے گرد لپیٹے تھے اور ہاتھ چھوڑ دیے تھے۔ وہ الٹا لٹک کر ان دونوں کے سامنے آ گیا، دونوں کے منہ سے ہی چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" آیان ان کو ______ دیکھ کر مسکرایا، پریشہ اس کی آواز پہچان کر فوراً چیخی۔

"آیان بھائی۔"

"آپ نے تو ہماری جان ہی نکال لی۔"

پریشہ کے مسکرانے پر عرف نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"ہماری نہیں صرف تمہاری۔" اس نے پریشہ کے جملے کی تصحیح کی۔

"اوہ، چیخ تو اس سے زیادہ تمہاری بلند تھی۔" وہ جمپ لگا کر نیچے آیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"جی۔ وہ بھی صرف حیرت کے مارے، یوں الٹا لٹکتے کسی کو دیکھا نہیں نا۔" اس نے منہ بناتے ہوئے جیسے اس کی غلط فہمی دور کی تھی۔

"گل بی بی کہتی ہیں، میں نے اپنی پیدائش سے پہلے ہی سب الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ سب کچھ الٹا ہونے لگا تھا سو میری عادت ہے۔ اب مجھ سے کوئی کام سیدھا نہیں ہوتا، جو کرتا ہوں، الٹا ہی کرتا ہوں۔" شرارتی لہجے میں مسکان بھری تھی۔

"جی۔ اس کا اندازہ تو آپ کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ۔" آیان کو اس کے طرز تخاطب پر حیرت ہوئی۔

"اوہ، تو پریشہ کے ہمیں بھائی کہنے پر ہماری عزت کی جا رہی ہے۔" وہ شاید آج اسے جلانے آیا تھا۔

"میں سب کا ہی لحاظ کرتی ہوں۔ بشرطیکہ وہ لحاظ کے قابل ہو۔" نہ جانے یہ لڑکی ہر وقت ہری مرچیں کیوں چباتی رہتی تھی، آیان نے کڑھ کر سوچا تھا۔

"لیکن میں سراسر پریشہ کا لحاظ کر رہا ہوں ورنہ...."

"ورنہ کیا؟" عرف چونکی۔

"ورنہ آج تو تمہارا ہتھیار بھی تمہارے پاس نہیں ہے، سو ٹھیک ٹھاک سبق سکھانا تھا تمہیں۔" آیان نے شہادت کی انگلی اٹھا کر وارن کیا تھا۔

"مطلب میرے پاس ہتھیار ہو تو تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" سارا لحاظ پل میں ہوا ہو گیا تھا، اس کے طنز پر آیان کا چہرہ یکلخت بگڑا تھا۔

"میں صرف عورتوں کی عزت کرتا ہوں، بس تب ہی......" اس نے فوراً صفائی دی تھی۔

"ایک بات کہوں۔" وہ ایک طرف مڑتے ہوئے بولی۔

"بولو۔" آیان نے اسی طرح رخ پھیرا۔

"یقین کرو اگر اب بھی میرے پاس میری غلیل ہوتی تو میں نے تمہاری اس دھمکی کا جواب اسی رات کی طرح ہی دینا تھا۔" عرف نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ پریشہ بھاگ کر اس کے برابر ہوئی۔

"دادی سچ کہتی ہیں، تم جیسی بہو بیٹیوں سے اللہ بچائے۔" ضبط سے لب بھینچتے اس نے ٹھیک ٹھاک بلند آواز میں کہا تھا۔ عرف کے قدم ایک پل کے لیے تھمے۔

"آوارہ اور بدتمیز اور یہ جو تم ہر وقت، ادھر اُدھر وقت ضائع کرتی رہتی ہو نا، دو چار جماعتیں پڑھ لو۔ کام آئیں گی۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا، کچھ اٹھا کر اس بدتمیز لڑکی کے سر پر دے مارتا۔ جواب میں کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر وہ ٹوٹی ہوئی دیوار سے اندر غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

"امی!" رات دھیرے دھیرے پر پھیلاتی جا رہی تھی۔ کمرے میں جلنے والے واحد زیرو کے بلب کی ہلکی نیلی روشنی میں چھت کے شہتیروں میں کچھ کھوجتے ہوئے اس نے قریب ہی سوئی ماں کو آہستہ سے پکارا تھا تاکہ اگر وہ سو چکی ہیں تو ان کی نیند خراب نہ ہو۔

"جی۔" انہوں نے فوراً ہی جواب دیا تھا۔ عرف ان کی طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔

"آپ ملیں ان مہمانوں سے۔" اس نے پوچھا۔

"سو جاؤ عرف! دیر ہو گئی ہے۔" انہوں نے اچانک ہی پلکیں موند لیں۔

"ہم...... مطلب، دادی پہلے مل گئیں آپ کو

for more novels and digests

اور آپ نہیں مل سکیں۔" وہ جیسے سب سمجھ گئی تھی۔

"عرف! اتنی سمجھ دار کیوں ہو گئی ہو؟" انہیں تاسف گھیرنے لگا۔

"کمال ہے امی! چاچی اپنی بیٹیوں کو ہر وقت سمجھ دار ہونے کی نصیحت کرتی ہیں اور آپ سمجھ دار بیٹی کی سمجھ داری سے نالاں۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"ہاں۔ تمہاری دادی نے مناسب نہیں سمجھا کہ میں ان کے مہمانوں سے ملوں۔" اس بار انہوں نے صاف جواب دیا، وہ خاموش رہی۔

"عرف!" کافی دیر بعد زرغونہ نے خود اسے پکارا تھا۔

"جی۔" مختصر جواب آیا۔

"تم اللہ سے گلہ تو کرتی ہو گی کہ اس نے تمہارا یہ نصیب کیوں لکھا۔ میرے جیسی بدنصیب اور بے بس ماں کیوں لکھ دی۔" ماں کی بات پر اس کے اندر تک دکھ بھر گیا' وہ فوراً اٹھ کر ان کے پاس آ کر لیٹ گئی۔

"پتا ہے امی! میں نے کبھی اپنے اللہ سے نہ گلہ کیا اور نہ ناراض ہوئی۔ گلہ تو بندوں سے کیا جاتا ہے، جو دھوکہ دیتے ہیں۔ اللہ تو ہمیشہ ہمارا ساتھ دیتا ہے۔" اس نے دھیمے نم لہجے میں کہتے ہوئے ماں کے کمزور سے ہاتھ پر بوسہ دیا تھا۔ زرغونہ نے بیٹی کو خود سے لگا لیا۔

☆☆☆

آیان تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ اس نے گھر کی اندرونی سیڑھیوں سے پریشہ کو تیزی سے اپنی طرف آتا دیکھا۔

"کیا ہوا خیریت؟" اس کا سوال ہوا میں ہی رہ گیا تھا کیونکہ پریشہ اسے جواب دیے بنا پیچھے گئی گرل کی طرف بڑھ چکی تھی۔

"گل پرو...... گل پرو......" وہ نیچے جھکتے ہوئے چلائی۔

"عرف!" دوسری طرف سے جواب نہ پا کر اس نے مزید زور سے چلا کر آواز دی۔

"کیا ہو گیا ہے؟" اگلے ہی لمحے اسے عرف کی چہکتی سی آواز سنائی دی۔ آیان کی سمجھ میں نہ آیا، رکے یا جائے۔ نہ جانے کیوں وہ پریشہ کی اس قدر بے چینی اور لہجے سے چھلکتی خوشی کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

"انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ آ گیا ہے۔"

"کیسا رہا؟" عرف کو شاید اچھے رزلٹ کی امید نہیں تھی۔ آیان اب مکمل طور پر متوجہ تھا۔

"تم نے ٹاپ کیا ہے۔ اب تمہیں یونیورسٹی جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" پریشہ خوشی سے چلائی اور آیان نے واضح طور پر عرف کی چیخ سنی تھی۔ وہ ماں کی طرف بھاگی تھی شاید، جب کہ پریشہ جس تیزی سے آئی تھی ویسی ہی پھرتی سے پیچھے غائب ہو چکی تھی۔ اس کے قدم خود بخود گرل کی طرف اٹھنے لگے۔

اس نے بس ذرا سا جھانکا تھا اور پھر تیزی سے پیچھے ہوا۔ نیچے زرغونہ سر پکڑے کھڑی تھیں اور عرف اپنے پاس ہونے کی خوشی میں غلیل سے ایک مرتبہ پھر ہوائی فائرنگ کرنے میں مصروف تھی، اگر وہ ایک لمحہ مزید دیر کرتا تو یقیناً مدھم پڑتا نشان دوبارہ رنگ پکڑ سکتا تھا۔

"میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں اس لڑکی کے شر سے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور کالر ٹھیک کرتا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

پرانے کنویں کے پاس آ کر اس نے ذرا سا ماضی میں جھانک کر اپنے بابا سے اپنی اتنی بڑی خوشی شیئر کی تھی لیکن نہ جانے کیوں دل اور آنکھیں اس خوشی میں اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں ۔ زندگی میں کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی بھی بات کو ٹالنا، نظر انداز کرنا آپ کے لیے بے حد آسان ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات حیران کن طور پر کچھ لوگوں کی باتیں دل چیر کے رکھ دیتی ہیں جب کہ ان سے تعلق کو آپ کوئی نام بھی نہیں دے پاتے۔ یہی ہوا تھا عرف مجتبیٰ جمال مروت کے ساتھ، وہ شخص کون تھا جو اس سے اس قدر تلخ لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس قدر تلخ رویہ رکھتا تھا مگر آنکھیں میچتے ہی اس کی آنکھوں میں مسکرا دیتا تھا۔ اسی انجانے شخص کی چھوٹی سی بات نے اس کی کتنی بڑی خوشی پامال کر دی تھی۔

"دادی سچ کہتی ہیں، تم جیسی بہو بیٹیوں سے تو اللہ بچائے۔" آوارہ آنسو پلکوں کا بند توڑتا اس کے گال چھو گیا۔

"یہ جو تم ہر وقت ادھر اُدھر وقت ضائع کرتی رہتی ہو ناں، دو چار جماعتیں پڑھ لو، کام آ جائیں گی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ آسمان سے برسنے والی بارش نے اس کے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ لیے تھے۔

☆☆☆

"خان کاکا! قہوہ بنوا لیں اور ہاں، پودینے کے پتے ضرور ڈلوانا۔" رات کا کھانا کھا کر وہ ابھی فارغ ہوئے تھے، خان کاکا سر ہلاتے ہوئے اندر چلے گئے۔

"پودینے کے پتے۔" اسے حیرت ہوئی۔

"سبز چائے کے قہوہ میں پودینے کے تین چار پتے ڈال لینے سے ایک تو مہک زبردست ہو جاتی ہے، دوسرا جگر اور آنتوں کے لیے بے حد مفید ہے۔"

"زبردست۔" اسے خوشی ہوئی۔ کچھ دیر میں ہی خان کاکا قہوہ لے آئے۔ واقعی زبردست تھا۔

"مجھے پریشہ نے بتایا، اس دن عرف نے تمہارے ساتھ انجان آدمی سمجھ کر بدتمیزی کی۔ میں اس بات کے لیے معذرت خواہ ہوں بیٹا۔" وہ چاچا سے اپنے ایڈمیشن کے بارے میں بات کرنے آئی تھی، ان کی بات سن کر وہیں ٹھہر گئی۔

"ارے نہیں انکل! آپ کو شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ پلیز اس بات کو لے کر ڈسٹرب نہ ہوں۔" وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔

"پھر بھی بیٹا! عرف بھی میری بیٹی ہے۔ خدا گواہ ہے، میں نے ہمیشہ اسے پلوشہ اور پریشہ سے بڑھ کر ہی چاہا ہے لیکن اسے یوں خود سے دور رکھنا میری بہت بڑی مجبوری ہے۔ ہم مروت لوگ خواہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائیں، ہمارے والدین ہی ہمارے سرپرست ہوتے ہیں اور ان کا کیا ہر فیصلہ ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ بھی تمہاری دادی کا فیصلہ تھا۔"

"ایک بات کہوں انکل!" اس نے پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں دادی کا فیصلہ بالکل درست تھا اور آپ کے گھریلو معاملے میں بولنے کا حق تو نہیں ہے مگر میں آپ کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکوں گا کہ آپ پلیز پریشے کو بھی عرف سے ذرا دور ہی رکھیں۔ معاف کیجیے گا مگر مجھے نہیں لگتا کہ اس لڑکی میں کچھ مینرز ہیں۔" عرف کے اندر کچھ چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ وہ واپس پلٹ گئی، البتہ مصطفیٰ جمال مروت ہنس دیے تھے۔

"تمہیں پھر بہت ہی خطرناک قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ عرف تو ہمارے ـــــ گھر کی بچیوں میں سمجھ دار اور سگھڑ بچی ہے۔ دنیا کا کون سا کام ہے، جو میری عرف نہیں کر سکتی۔" ان کے لہجے میں عرف کے لیے غرور تھا۔

"ضروری نہیں ہوتا کہ جو آدمی ہر کام آسانی سے کر سکے، وہ قابل اور سمجھ دار ہو۔" اس نے دلیل دی۔

"بالکل۔" مصطفیٰ مروت مسکرائے۔

"تب وہ جنونی ہو گا اور یہ تو میں ضمانت دیتا ہوں کہ عرف جنونی نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو لیکن میں چاہوں گا پریشے جیسی پیاری اور معصوم سی لڑکی کو عرف سے اس قدر امپریس بھی نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ کام کہاں تک

پہنچا۔" انہوں نے بات ہی بدل دی۔
وہ انہیں اپنے کام کے بارے میں بتانے لگا۔

☆☆☆

آج موسم کچھ بہتر تھا۔ صاف تھا اور سرد ہوائیں بھی پرسکون تھیں۔
زرمینہ ذرا دیر کے لیے لیٹی تھیں۔ نگینہ، گل بی بی کو لے کر زرغونہ بھابھی کی طرف آ گئی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہتا تھا کہ گل بی بی جیسی نفیس خاتون زرغونہ کے متعلق وہ منفی تاثر نہ لے کر جائیں جو زرمینہ نے قائم کیا تھا۔ چند لمحے وہاں بیٹھ کر وہ پچھلے دروازے سے باہر کھیتوں میں آ گئیں۔
"بھئی مجھے تو بہت مزا آیا زرغونہ اور اس کی بیٹی سے باتیں کر کے۔ تم نے بیٹھنے ہی نہیں دیا۔" یہ تاثر واقعی ختم ہو چکا تھا۔
"مورے کو اچھا نہ لگتا۔" اس نے چادر سنبھالتے ہوئے مختصر جواب دیا۔
"ہاں، میں سمجھ سکتی ہوں۔ اس کا بھی قصور نہیں۔ زرغونہ نے ان کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔" تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ نگینہ کچھ دیر سوچتی رہی۔
"زرغونہ نہیں، مورے نے ان کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔"
"کیا مطلب؟" وہ چونکیں۔
"زرغونہ ہماری برادری کی نہیں۔ وہ بابا کے دوست کی بیٹی ہیں، ان کی بے وقت موت کے وقت بابا نے ان کی بیٹی بھتیجی بھائی کے لیے مانگ لی تھی۔ نہ جانے کیوں مورے نے یہ رشتہ قبول نہیں کیا اور پہلی بار ہی مورے اور بابا کے رشتے میں دراڑ آ گئی۔" وہ مدہم لہجے میں بتانے لگی۔
"لیکن کیوں، زرمینہ خود بھی تو غیر برادری سے تھی، پھر کیوں؟"
"یہ وجہ کوئی بھی نہیں جان سکا۔ مگر بابا کہتے تھے اکثر کہ وہ ہٹ دھرم بہت ہیں، سو جو بات کہہ دیں اس پر اڑ جاتی ہیں۔"
"ہاں، اس بات سے تو میں بھی متفق ہوں۔"
انہوں نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو نگینہ نے مزید بتایا کہ کس طرح انہوں نے مصطفیٰ کو اپنی قسم دے کر ان ماں بیٹی کو گھر سے نکالا۔
"اوہ میرے خدا! میں اپنی دوست پر اعتبار کر کے اس بے چاری کے لیے کتنا برا سوچتی رہی۔" وہ واقعی شرمندہ تھیں۔
"آپ کا قصور نہیں۔ آپ کو تو جو بتایا گیا، ظاہر ہے وہی آپ سوچتیں۔"
"نہیں، مجھے زرغونہ کی تصویر بنانے سے پہلے خود اس سے ملنا چاہیے تھا، جس شخص کے بارے میں آپ جانتے نہ ہوں، اس کے متعلق یوں خود سے سب کچھ سوچ لینا اور باتیں گھڑ لینا ایک اچھے انسان کا شیوہ نہیں۔" وہ پریشان ہو گئی تھیں۔
"میرے خیال میں ہمیں گھر چلنا چاہیے۔" نگینہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، جب کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔
"یا اللہ خیر، مصطفیٰ بھائی بھی پشاور گئے ہوئے ہیں، خیر ہو سب۔" زرغونہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔
"کون ہے؟" عرف نے پوچھا۔
"پریشے۔" وہ پریشے تھی، جو شاید درمیانی چھوٹی دیوار پھلانگ کے اندر آئی تھی۔ عرف نے تیزی سے دروازہ کھولا۔
"عرف...... دادی......" وہ روتے روتے اس سے لپٹ گئی۔ عرف تیزی سے اس چھوٹی دیوار کی طرف بھاگی اور ایک ہی جست میں دیوار پھلانگ گئی۔
نیچے عجیب سی ہلچل محسوس کر کے سیڑھیاں اترتے آیان نے حیرت اور ناپسندیدگی کے ملے جلے تاثرات لیے اس کی یہ حرکت دیکھی تھی۔
وہ تیزی سے دادی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ جہاں نگینہ، پلوشہ اور گل بی بی پریشان بیٹھے تھے جب کہ دادی بیڈ پر بے سدھ پڑی تھیں اور ان کا منہ کھلا ہوا تھا۔ وہ سیدھی ان کی طرف بڑھ گئی، گل بی بی نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔
"میں آیان کو کہتی ہوں گاڑی نکال لے۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔
"دادی......" عرف کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ دادی کا وجود ٹھنڈا پڑ رہا تھا، تب ہی اس نے سختی سے آنکھیں رگڑ کر آنسو صاف کیے اور دادی کے ہاتھ ملنے لگی۔ پریشے اور اماں بھی آ چکی تھیں۔
"اماں! جلدی سے اپنی دوائیوں کا لفافہ لے آئیں...... جلدی۔" اس نے تیزی سے ماں کو پکارا۔ وہ باہر کی طرف لپکیں۔
"چاچی، پلوشہ...... دادی کے دونوں پاؤں کے تلوے ملو۔" اس نے مزید ہدایت جاری کی اور تیزی سے دو تکیے اٹھا کر دادی کے پاؤں کے نیچے رکھ دیے۔
"دادی...... پلیز آنکھیں کھولیں، دادی......"
اندر آتے آیان نے حیرت سے اس لڑکی کو دیکھا تھا، جو آنسو بہاتی دادی کے چہرے کو تھپتھپا رہی تھی۔
"یہ لو بیٹا۔" اماں نے پھولی سانسوں کے ساتھ اسے لفافہ تھمایا۔ اس نے تیزی سے شاپر کھولا۔
"میں گاڑی نکالتا ہوں، آپ پلیز دادی کو باہر لے آئیں۔" حیران سے آیان نے عرف کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں، دادی کی حالت خراب ہے۔ ایسے میں مزید رسک نہیں لے سکتے۔ ابتدائی طبی امداد بے حد ضروری ہے پھر دیکھتے ہیں۔" اس نے کسی محلول کی بوتل نکالتے ہوئے کہا اور ایک ڈھکن بھر کر تھوڑے سے قطرے ان کی ناک اور منہ میں ڈال دیے۔ دادی کے...... وجود نے زبردست جھٹکا کھایا تھا۔
"دادی!" وہ دوبارہ ان کے چہرے کو تھپتھپانے لگی۔ اس نے کچھ مزید قطرے ان کے منہ میں ڈالے، اس بار جھٹکا زبردست تھا۔ وہ دادی کے لبوں پر لب رکھ کر مصنوعی تنفس دینے لگی۔ ٹھنڈے وجود میں جان پڑنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھ رکھ کر

الف لیلہ ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر
بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں
جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب -/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ -/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
منی آرڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

دادی کے سینے پر دباؤ دینا شروع کر دیا۔ ایک ...... دو ...... اور تیسرے جھٹکے پر ہی دادی کا رکا ہوا سانس بحال ہو گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی تھیں، سب کے ساکت وجود حرکت میں آئے تھے، سب کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی۔

''دادی۔'' عرف دادی کے کمزور وجود سے لپٹ کر رونے لگی۔ انہوں نے دھیرے سے اس کو خود سے الگ کیا تھا۔ اب وہاں اس کی کوئی جگہ نہ تھی، وہ ماں کے ساتھ وہاں سے چلی آئی۔

اور آیان علی سید کو آج پتا چلا تھا کہ اس کی تمام تر تکرار کے باوجود دل اس لڑکی کا حمایتی کیوں تھا۔ کیونکہ دل ہی ہے جسے کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہوتی ہے اور اس کے دل نے بھی گواہی دی تھی۔

☆☆☆

''مجھے حیرت ہوتی ہے تم پر زرینہ! صرف جھوٹی انا کے لیے تم نے اس قدر خوب صورت اور پُرخلوص رشتے تیاگ دیے۔ مجھے تو اپنی سوچ پر شرمندگی ہے، نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی عرف اور زرغونہ کے بارے میں۔'' زرینہ خاموش رہی تھیں۔ گل بی بی کو دل سے ان پر افسوس ہوا۔

''ہم کل جا رہے ہیں لیکن زندگی میں پہلی بار پتا ہے میرے دل نے کیا کہا ہے؟'' زرینہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کاش، میں تم سے ملنے کی مروت نہ آئی ہوتی۔'' وہ کہہ کر اوپر آیان کے کمرے کی طرف آ گئیں۔

''کیا کر رہے ہو؟'' وہ الماری سے کپڑے نکال رہا تھا، بری طرح چونکا۔

''گلالئی ...... کل جانا ہے نا، سامان پیک کر رہا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''گلالئی۔'' گل بی بی جو بیڈ پر بیٹھی تھیں، وہ ان کے برابر آ بیٹھا۔

''ہاں بولو۔'' انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اگر کبھی ہم کسی کو سمجھنے میں غلطی کر دیں اور وہ غلطی بھی معمولی نہ ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''معافی مانگ لینی چاہیے۔'' فوراً جواب آیا۔

''ہم ...... اور اگر کسی سے بے حد بے زاری اور نفرت تو نہیں مگر نفرت ہی جیسا کچھ محسوس ہو۔ لیکن دل سراسر اس کی نفی کرے تو کیا کرے بندہ؟'' گل بی بی مسکرا دیں۔

''اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم سراسر غلط ہیں اور ہمیں دل کی بات مان لینی چاہیے۔''

''دل کی بات۔'' وہ حیران ہوا۔

''مطلب؟''

''صرف ایک بات کہوں گی۔'' گل بی بی مسکراتے ہوئے اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''ہمیں رشتہ بنانے میں نہیں، رشتہ توڑنے میں دیر کرنا چاہیے مگر ہم لوگ رشتہ بناتے وقت ہر پہلو پر سوچتے ہیں۔ ہر بات کا جواب ڈھونڈتے ہیں اور رشتہ توڑتے وقت ایک چھوٹی سی غلط فہمی کو ہی بنیاد بنا لیتے ہیں۔'' وہ خاموش ہو گئی تھیں اور آیان سمجھ چکا تھا کہ اسے اب کیا کرنا تھا۔

☆☆☆

''عرف! بارش ہونے والی ہے۔ کہاں جا رہی ہو بیٹا؟'' زرغونہ نے تیزی سے مٹی کا لیپ لگے برتن سنبھالتے ہوئے بیٹی سے پوچھا، جو ٹوٹی دیوار سے نکل رہی تھی۔

''یہاں قریب ہی جا رہی ہوں امی! فکر مت کریں۔'' وہ خود کو اونی شال میں لپیٹتی باہر نکل آئی۔

دسمبر کی دلکش آخری سرد اور زرد شام تھی۔ پھر یہ اداسی نئے سال کی خوشیوں میں کھو جاتی تھی۔ اسے دسمبر کے اس اداس رنگ سے نہ جانے کیوں محبت تھی۔ وہ بارش سے ہو جانے والے کیچڑ کی وجہ سے پکی سڑک پر ہی چلنے لگی۔ تب ہی کوئی اچانک ہی اس کے ہم قدم ہوا، اس نے چونک کر دیکھا، وہ آیان علی سید تھا۔ عرف نے آج کوئی ردعمل نہیں دکھایا، وہ چپ چاپ چلتی رہی۔

''آئم سوری۔'' نرم لہجے میں معذرت موصول ہوئی، وہ یوں ہی چلتی رہی۔

''میں آپ کو کچھ دینے آیا ہوں۔'' وہی سرد جامد خاموشی۔

''یہ رکھ لیں۔'' اس نے ایک خوب صورت سا پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ عرف نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''عقیل۔'' وہ مسکرایا، ڈمپل گہرا ہوا، وہ نظریں چرا گئیں۔

''میں نے نئی بنالی ہے۔'' سادہ سا جواب۔

''یہ بھی رکھ لیں، میں نے کیا کرنی ہے۔'' اس نے وہ پیکٹ تھام لیا اور واپس مڑی۔

''سنیے۔'' عرف کے قدم رک گئے۔

''کچھ خواب، کچھ جگنو بھی دینا چاہتا ہوں میں آپ کو۔ میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔'' عرف ذرا سا پلٹی۔

''مگر میرے پاس آپ کو دینے کے لیے نہ خواب ہیں، نہ جگنو۔'' اداسی سے مسکراتی وہ واپس پلٹ گئی تھی۔

☆☆☆

کٹھن راہیں ہیں جیون کی
بہت دشوار رستے ہیں
سنا ہے کچھ علاقے ہیں
جہاں ساون برستے ہیں
ان ہی راہوں پر، رستوں پر
تمہارے ساتھ چلنا ہے
تمہاری دل نوازی کے حسیں رنگوں
میں ڈھلنا ہے
یقین کر لو محبت تم
تم ہی سے میرا وعدہ ہے
تمہارے ساتھ یہ جیون
بتانے کا ارادہ ہے
اگر تم ساتھ دو میرا
سفر آسان ہو جائے
تمہاری مسکراہٹ جینے کا سامان ہو جائے

فاطمہ نجیب کی خوب صورت نظم، دلکش ہینڈ رائٹنگ سے لکھی۔ اس کے دل کے تار چھیڑ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کارڈ اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

''چلو، پشاور جانے سے پہلے پشاور سے کچھ تو رابطہ ہوا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنے ایڈمیشن کے بارے میں سوچا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

وہ لوگ جا رہے تھے۔ آیان گاڑی میں بیٹھنے تک اس کا منتظر رہا تھا اور وہ مزے سے دوسری منزل کی جالی سے اسے خود کو کھوجتے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں اداسی کے رنگ بے حد گہرے تھے۔ دل پر لگے لفظوں کی چوٹ بہت بوجھ دے گئی تھی۔ وہ دھند چھٹنے تک آیان کو انتظار کروانا چاہتی تھی اور انتظار کروا رہی تھی۔

باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔ نئے سال کا پہلا روز کس قدر حسین تھا۔ دھیرے دھیرے کھڑکی کے شیشے دھندلانے لگے اور سامنے کا منظر غائب ہو گیا۔ وہ چاہتی تو دھند مٹا کر سارے منظر صاف کر لیتی مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

''چلیں گے سنگ ہم تیرے
سنو! اے ہم سفر میرے
مگر اس بار رہنے دو
مگر اس بار رہنے دو''

اس نے کھڑکی کے دھندلے آئینے پر انگلیوں سے لکھا تھا اور دیر تک اس کا انتظار کرنے کے بعد تھکن زدہ وجود لیے آیان علی سید نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی کہ دھند چھٹنے میں ہمیشہ ذرا سی دیر لگتی ہے۔

بیڑی اور زنجیر

"آئندہ ایسا ہوا تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔"

الفاظ تھے گویا برچھیاں جو اس کی روح تک گھائل کرتے چلے گئے۔ ایک لمحے کو اس نے چونک کر اسے دیکھا شاید اسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ شاید مقابل نے بولنے میں جلدی کی ہو مگر ایسا کچھ نہیں تھا وہ اپنی بات پر قائم تھا، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔

"ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، اگلی دفعہ کچھ بھی کہے بنا سب ختم کردوں گا۔"

اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا مگر شارق حسن کی آنکھوں میں ایک سکون اتر رہا تھا۔ پنچھی اس سے پہلے کہ اونچی اڑان بھرے پر کاٹ دو۔ وہ ایک بار عب مرد تھا اس بات کا اطمینان اسے ہوچکا تھا۔ پنچھی کی آنکھوں کی بے یقینی نے اسے یقین دلا دیا کہ وہ پر کاٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اپنے وجود میں پھیلی بے یقینی کو وہ اپنی اولاد میں نہیں بھر سکتی تھی۔ گھائل ہوئی روح کے ساتھ اس نے بچوں کو اپنے پاس بلایا جو باپ کے لفظوں کا مطلب نہیں سمجھ سکتے تھے لیکن ماں کس اذیت سے گزر رہی ہے محسوس کر سکتے تھے مگر بیان نہیں کر سکتے تھے۔

وہ اس کے پاس آگئے اس نے اپنے کمزور پڑتے وجود سے لگا کر طاقت دی ان کے لرزتے ننھے دل اس کے وجود کی گرمی سے سنبھل گئے۔

وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شارق بھی جاچکا تھا۔ وہ کھانے کے برتن سمیٹنے لگی اس کی روح کتنی زخمی تھی۔ اس کی ڈیوٹی کا ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا بچوں کے دانت صاف کرانے تھے۔ دونوں کو سلانا بھی تھا۔ شارق کے لیے پانی کا جگ رکھنا تھا اور وہ معمول کی طرح سب کرتی گئی مگر ان سب کاموں کے بعد جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اسے اس کی روح نے یاد دلایا کہ وہ درد سے سسک رہی ہے۔

آنسو اس کی آنکھوں کے کناروں سے نکل کر بالوں میں جذب ہونے لگے۔ پچھلے سات سال سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ اس کی انا اس کے سامنے کھڑی تھی اس کی آنکھوں میں کتنی ناراضی تھی۔

"کہاں کہاں تم نے میرے سر پر اپنا پاؤں نہیں رکھا۔" وہ شکوہ کناں ہوئی۔

اس کا جسم اس سے فریاد کررہا تھا۔ "تم نے میرا دھیان نہیں رکھا کیسے پھوڑے کی طرح میں دکھ رہا ہوں۔"

اس کا ذہن اس کے سامنے فریادی تھا۔ "دیکھو ہر وقت تم مجھ پر بوجھ لادے رکھتی ہو میری باریک سی کام کرنا چھوڑ رہی ہیں۔"

سب اس سے ناراض تھے۔ وہ دھیرے سے اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ آئینے میں دیکھ رہی تھی بے رونق سیاہ آنکھیں، سات سالوں نے جن کی خوب صورتی کو حلقوں نے چھپا دیا تھا۔ پچکے ہوئے رخسار جن پر کبھی سرخی جھلکا کرتی تھی۔ تھک کر دوبارہ اپنی جگہ پر جا کر لیٹ گئی۔

ان گزرے سالوں میں شارق نے کتنی دفعہ اسے ذلیل کیا ہوگا اسے یاد نہیں، بات بات پر گھر سے نکالنے کی دھمکی کیونکہ گھر شارق حسن کا تھا وہ اس گھر میں ایک مزدور جو بےگار پر تھا۔ صبح سے شام وہ بنا کسی اجرت کے اس مکان کو اپنا گھر سمجھ کر جتی رہی۔ وہ جاب کرتی تھی معاشی بوجھ بھی بانٹتی تھی پر آج ——

شارق غصے کا تیز تھا پر آج اتنی سی بات پر کون سی بات آج کیا ہوا تھا وہ سوچنے لگی تھی۔

"نہیں، کچھ نہیں ہوا تھا۔" ہاں اسے یاد آیا آج کھانا لگانے میں کچھ کمی رہ گئی تھی، کمی کون سی وہ سوچنے لگی۔ "ہاں ایک پلیٹ کم تھی۔ اس کا ذہن واقعی کمزور ہورہا تھا۔"

ایک طویل رات تھی جس میں وہ نفع نقصان کے کھاتے کھولے بیٹھی تھی۔ ہاں بہت نقصان کر چکی تھی وہ اپنا۔ اب نہیں، آج شارق حسن نے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچی تھی۔ اب وہ مزید اس رسی پر نہیں چل سکتی تھی جس پر چلتے ہوئے ہر لمحے نیچے

کر جانے کا خوف ہو۔ وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ اسے صرف اپنے بارے میں سوچنا تھا اور وہ سوچ چکی تھی۔

اس کی انا کی آنکھوں میں ایک اطمینان اترا۔ ذہن بھی سونے کی تیاری کرنے لگا۔

اگلی شام آفس سے واپس آتے ہوئے وہ اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنا چکی تھی اور مطمئن تھی۔ واپس آ کر بھی اس نے سوائے سونے کے کچھ نہیں کیا۔ رات کو کھانا باہر سے آرڈر کیا۔ شارق کو اس کے رویے پر کچھ حیرت ہوئی۔ وہ ویک اینڈ کے علاوہ باہر کے کھانے کی اجازت نہیں دیتی تھی پر آج۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کل والی روما علی نہیں رہی۔

☆☆☆

اگلی شام وہ گھر آئی۔ سب کاموں سے فارغ ہو کر اس نے کاغذات نکالے۔ ایک آخری نظر ان پر ڈال کر اس نے دستخط کر کے شارق کو دینے تھے اور پھر اسے ذلیل کرنے کا ہر اختیار چھن جانا تھا، اس سے پہلے کہ وہ دستخط کرتی اس کی بیٹی اس کے پاس آئی۔

"عنایہ بیٹے آپ سوئی نہیں۔" اس نے چھ سال کی عنایہ کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

"ماما! نیند نہیں آ رہی تھی۔" عنایہ نے اپنا سر اس کے گلے سے لگایا۔

"نیند کیوں نہیں آ رہی میری پرنس کو۔" اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ماما! طلاق کیا ہوتی ہے۔" اس کے بالوں میں چلتی اس کی انگلیاں رک گئیں۔

"ایسی چیز جس کے بعد آپ کے بابا اور میں ساتھ نہیں رہ سکتے۔" اس نے مناسب لفظوں میں عنایہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اور بھائی کیسے رہیں گے، ہم آپ سے کبھی نہیں مل سکیں گے۔ بابا تو لیٹ آتے ہیں شام کو۔ ہمارے پاس کون ہوگا۔" کل سے آج تک اس کے ننھے سے ذہن میں جتنے سوال تھے وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

روما کو لگا ہولے ہولے اس کا بدن لرز رہا ہو پھر وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"آپ کے بابا کوئی انتظام کر لیں گے۔ میں کورٹ سے اجازت لے کر آپ سے مل لوں گی۔" شارق حسن کے الفاظ اسے دوبارہ یاد آئے تو ان کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس کی بیٹی یہ سب کیسے سمجھے گی۔

"آپ اجازت لے لیں گی پر آپ کے پاس ہمیں لے کر کون آئے گا، بابا کے پاس تو ٹائم نہیں ہوتا۔ ماما میرے بال کون بنائے گا اور جب جوئیں ہوں گی تو کون نکالے گا۔ میم چیک کریں گی تو میری شیم ہوا کرے گی۔ جب میری فرینڈز کو پتا چلے گا بابا نے آپ کو بھیج دیا ہے تو وہ کیسے بنائیں گی نا مجھ سے پیچھے کریں گی نا۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی ____ دکھ تھا ماں کے دور جانے کا، خوف تھا ماں سے بچھڑنے کے بعد لوگوں کے رویوں کا۔

روما کو لگا کسی نے اس کا کلیجہ نوچ لیا ہو کل سے آج تک اس نے ہر پہلو پر غور کیا تھا۔ بچوں کے حوالے سے اس نے خود کو مطمئن کر لیا تھا کچھ وقت کے بعد وہ سیٹ ہو جائیں گے۔ قدرت نے اسے خوب صورت اور فطین مگر حساس اولاد سے نوازا تھا۔ آج اسی ذہانت اور حساسیت نے اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کے بچے شہر کے مہنگے اسکول میں پڑھ رہے تھے جہاں ہر چیز کا موازنہ ہوتا تھا اس کی بیٹی دنیا کو اس بھیانک حقیقت کے بعد کیسے فیس کرے گی۔

اس نے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ماما آپ کو کبھی چھوڑ کر نہیں جائیں گی۔" وہ اس کے چہرے کو اوپر کیے بے تحاشا چوم رہی تھی۔ عنایہ کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"آئی لو یو ماما۔" وہ اس کے گالوں پہ پیار کرتی

کو دے آئی۔

اس نے پلٹ کر بیڈ پر رکھے خلع کے کاغذات کو دیکھا۔ ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی انا نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"تم مجھے مار دو گی۔"

اس نے نظریں چرالیں۔

کاغذات اٹھاتے ہوئے اس کے جسم نے دہائی دی۔

"پھر مجھے اس شخص کے لیے تھکا دو گی جسے احساس ہی نہیں، یاد نہیں کیسے موت کے منہ میں جا کر نئی زندگی کو تخلیق کیا تھا۔ اس نے تب میرا احساس نہیں کیا اسے تمہارا فرض کہا اور تم پھر سے مشقت کی چکی میں جھونکنا چاہتی ہو۔" اس نے کاغذات الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ سب ناراض ہو کر اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے۔

☆☆☆

آج پندرہ سال بعد اس نے عنایہ کی شادی کے بعد اپنے ناراض پیاروں کو منانے کی کوشش کی اس کے دماغ نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

"اب میں اور نہیں بتا سکتا اب تم دل کی سن لو اس بے چارے کی تو کبھی باری ہی نہیں آئی۔" اس نے مایوس ہو کر اپنی انا کی طرف دیکھا جو نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تو آج پندرہ سال بعد تمہیں میرے سکون کا خیال آ ہی گیا پر اب کیوں، تم تو مجھے مار ہی چکی تھیں۔" اس نے پیار بھرا شکوہ کیا۔

روما مسکرا رہی تھی کوئی تو اسے سننے کو تیار تھا۔

اس کے جسم نے دہائی دی" پندرہ سال شارق حسن کے رشتے کو بیڑی بنا کر چلتی رہیں۔ مجھے زخمی کرتی رہیں۔" اس کا گلہ بھی بجا تھا وہ مسکراتی ہوئی اٹھی الماری کا تالا کھول کر اس کاغذ کو باہر نکالا جسے وہ جان بوجھ کر بھولی رہی۔

اسی لمحے عنایہ دستک دے کر اندر آئی۔ روما نے

"ماما کیا کر رہی ہیں۔" اس نے اندر آتے ہوئے سوال کیا۔

"کچھ نہیں اب اس عمر میں یاد ہی نہیں رہتا کیا کر رہے تھے، کیا کرنے جا رہے تھے۔" اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ماما آپ جانتی ہیں، میری ساس آپ کی کتنی تعریفیں کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں انہوں نے میرا رشتہ بھی آپ کی وجہ سے کیا کیوں کہ وہ برسوں سے اس کالونی میں رہتی ہیں وہ کہتی ہیں جتنی سمجھداری اور تحمل مزاجی سے آپ نے وقت گزارا اور ایک آئیڈیل زندگی گزاری۔ میں بھی شایان کی زندگی ایسی ہی جنت بناؤں گی۔ تھینک یو ماما یو آر دا بیسٹ مدر۔ آئی ایم سو پراؤڈ آف یو۔" عنایہ اس کی پیشانی کا بوسہ لے کر جا چکی تھی۔ اس کی انا نے اسے پکارا۔

"کہیں تم بیٹی کی محبت میں مجھے مار تو نہیں دو گی۔ دیکھو اتنے سال تم نے مجھے بہلائے رکھا۔ بچے بڑے ہو جائیں گے پھر دیکھو شارق حسن کے رشتے کی بیڑی نے تمہیں زخمی کر رکھا ہے۔ بس اب ٹوٹ جانے دو۔" اس کی انا نے سر پٹخا۔

"ہاں شوہر کے ساتھ جڑا رشتہ کبھی کبھی پاؤں کی ایسی بیڑی بن جاتا ہے جس سے تکلیف ہوتی ہے۔ چلتے ہوئے پاؤں سے خون بھی رستا ہے، عورت اس کو توڑ بھی دے لیکن اولاد سے جڑا ماں کا رشتہ بیڑی نہیں زنجیر ہوتا ہے جو اولاد کو ہر موڑ پر خود کو مضبوط کرنے کے لیے چاہیے ہوتا ہے۔" کاغذ کو پھاڑ کر پھینکتے ہوئے اس نے اپنے ناراض ساتھیوں سے کہا۔

اس کے جسم کو آہستہ آہستہ سکون ملنے آنے لگا۔ اس کی انا بھی ہمیشہ کے لیے پر سکون نیند سو گئی۔ سب سے زیادہ اطمینان اس کے دل کو ہوا جس کی پندرہ سال بعد بالآخر شنوائی ہو گئی تھی۔

ناولٹ

مجھے بتلائے آکر

ملیحہ سعید

"دادو!" اس کی پکار میں بے چینی کا عنصر نمایاں تھا۔ مگر نور بانو نے اس بار نگاہ نہیں چرائی تھی کہ اب بات نگاہ چرانے کی حد سے نکل چکی تھی۔ (بس اب اور نہیں)

"میں مر تو سکتا ہوں مگر نائلہ مصطفیٰ کے گھر کبھی نہیں جا سکتا۔" اس کا لہجہ سپاٹ جبکہ چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

"ادب کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑو وجدان! تم بار بار نائلہ کے ساتھ اپنا رشتہ بھول جاتے ہو۔" انہوں نے پوتے کو گھورا۔

"سوری!" وہ قدرے شرمندہ ہوا۔

"اس بار معذرت سے کام نہیں چلے گا وجدان!" دادو کا انداز اٹل تھا۔

"ہم وہاں نہیں جا سکتے تو وہ لوگ تو یہاں آ سکتے ہیں۔"

"نہ ہم لوگ وہاں جا رہے ہیں نہ وہ لوگ یہاں آ رہے ہیں بس۔" اس کا انداز ضدی تھا۔

"اس مسئلے کا ایک اور حل بھی ہے میرے پاس۔" دادو نے اس کے دو ٹوک انداز پر سنجیدگی سے کہا تو وجدان نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"اور وہ حل یہ ہے کہ تم شادی کر لو۔"

"واٹ؟" وہ اچھلا۔ "دادو! آپ کیوں آج مجھے شاک پہ شاک دیے جا رہی ہیں؟" وہ روہانسا ہوا۔

"کیوں! اب شادی میں کیا قباحت ہے؟" دادو نے اسے گھورا۔

"دادو، کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" اس نے دادو کے ہاتھ تھامے۔

"بھلا میں کیسے شادی کر سکتا ہوں جبکہ پڑھائی ابھی کمپلیٹ نہیں ہوئی اور انکم کا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔" دادو نے ہاتھ چھڑائے۔

"تو پھر مجھے کسی دارالامان میں چھوڑ آؤ۔" انہوں نے پوتے کا پھیکا پڑتا چہرہ نظر انداز کرتے

http://www.cafetofun.net

ہوئے جارحانہ انداز اپنایا۔ ”کیونکہ اتنے بڑے گھر کی رکھوالی میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آج تمہیں فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ ہم وہاں جائیں گے یا وہ لوگ یہاں آئیں گے، اگر تمہیں دونوں میں سے کوئی بھی فیصلہ منظور نہیں تو تیسرا فیصلہ تو ہے ہی۔“ وہ وجدان کا چہرہ دیکھے بنا اٹھ گئیں۔ جبکہ وہ گم صم بیٹھا تھا۔

☆☆☆

”کیا کہا اماں نے؟ وجدان نے کوئی فیصلہ کیا؟“ نائلہ نے رات کے کھانے پر میاں سے پوچھا تو صلہ اور شفا نے بھی ہاتھ روک کر باپ کی طرف دیکھا۔

”کہہ تو رہی تھیں، اس بار انہوں نے سخت انداز میں وجدان سے فیصلہ لینے کے لیے کہا ہے۔ وہ پر امید ہیں کہ وجدان ہمارے وہاں رہنے پر رضامند ہو جائے گا۔“ انہوں نے وجدان کے ذکر پر بیٹیوں کے جگمگاتے چہرے دیکھے۔

”تو اگر وجدان ہمارے وہاں رہنے پر رضامند ہو گیا تو صلہ وہاں جاتے ہی سب سے پہلا کام کون سا کریں گی؟“

”میں؟“ وہ پرجوش ہوئی۔ ”میں سب سے پہلے اپنی عیدی لوں گی پچھلے تمام سالوں کی۔“

”اللہ اللہ!“ نائلہ ہنسیں۔

”اس کا مطلب ہے صلہ بہت جلد امیر ہونے والی ہیں۔“ پھر شفا کی طرف دیکھا۔ ”اور شفا کیا کریں گی؟“

”مجھے ان سے بہت سارا پیار کرنا ہے۔“ اس کے عقیدت سے بھرپور لہجے اور محبت پر نائلہ اور مصطفیٰ نے بے ساختہ نگاہ چرائی تھی۔

☆☆☆

وجدان اس وقت اپنے کمرے میں دونوں ہاتھوں میں چہرہ ٹکائے گہری سوچ میں گم تھا۔ پچھلے دو روز سے دادو نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ چند لمحوں بعد اٹھ کر وہ نور بانو کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر جھانکا تو وہ تسبیح ہاتھ میں لیے ذکر میں مصروف تھیں۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد نگاہ موڑ لی۔ وجدان چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان کے پاس آ بیٹھا۔

”سوری دادو! آپ میری وجہ سے ہرٹ ہوئیں۔“ اس نے نور بانو کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے تو آنکھیں نم تھیں۔ ”پلیز آئندہ کبھی مت کہیے گا کہ میں آپ کو کسی دارالامان میں بھیج دوں۔“

دادو نے نم آنکھوں سے اس کے بال سنوارے۔

”ہم لوگ وہاں نہیں جائیں گے۔ وہ لوگ یہاں شفٹ ہو سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

نور بانو نے بے ساختہ اس کی پیشانی چومی۔

”میری وجہ سے میرے بچے کو تکلیف سہنا پڑی مگر وجدان! تم یہ بھی تو سوچو، میں بھی ایک ماں ہوں، اکیس برس ہو گئے بیٹے سے دور رہتے اب تو زندگی کے آخری دن بچے ہیں۔ اب مزید دوری برداشت نہیں اپنے جگر کے ٹکڑے سے۔ تمہیں ترس نہیں آتا بوڑھی دادی پر۔“ وجدان نے ان کے دونوں ہاتھ عقیدت سے چوم لیے۔

☆☆☆

اگلے روز وہ دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات چلا گیا۔ وہ سب جانتے تھے کہ وجدان کیوں گیا ہے۔

تیسرے روز مصطفیٰ فیملی کے ساتھ وجدان ہاؤس شفٹ ہو گئے۔ شفا جس قدر خوش اور پرجوش تھی صلہ اسی قدر خفا اور جھنجلائی ہوئی تھی اور اسی جھنجلاہٹ میں وہ نور بانو کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”بھائی ہم سے کترا رہے ہیں نا؟ وہ تو چاہتے ہی نہیں ہوں گے کہ ہم لوگ یہاں شفٹ ہوں، آپ کے کہنے پر اجازت دی ہوگی۔“ اس کا انداز جارحانہ تھا۔ دادو مسکرا دیں۔

”میرا بچہ!“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ ”بھائی کو دوستوں کے ساتھ جانا تھا۔ بس چند دنوں کی بات ہے۔ وہ آ جائے گا آپ کے پاس۔“

”بس وہ واپس آ جائیں پھر دیکھیے گا میں کیسے ان کی خبر لوں گی۔“

☆☆☆

جس روز وجدان کی واپسی ہوئی، اس روز صلہ ماموں کی طرف گئی ہوئی تھی جبکہ شفا اور نائلہ گھر میں ہی تھیں۔ وہ دادو کو سلام کر کے کمرے میں گیا پھر چند لمحوں بعد ان ہی قدموں پر واپسی ہوئی تو چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ نائلہ کچن میں تھیں۔ جبکہ شفا، دادو کے پاس بیٹھی تھی۔

”میرے روم کی سیٹنگ کس نے چینج کی؟“ اس کے جارحانہ انداز پر شفا بوکھلا کر کھڑی ہوئی تو اس نے کھا جانے والی نگاہوں سے اس نازک سی لڑکی کو گھورا۔

”آئندہ میرے کمرے میں کسی بھی چیز کو ہاتھ لگایا تو بری طرح پیش آؤں گا۔ سمجھیں تم؟“ وہ گرجا۔ شفا نے پھیکے پڑتے چہرے اور نم آنکھوں سے اسے دیکھا جبکہ دادو نے پرسوچ نگاہوں سے۔

شام میں صلہ جب بابا کے ساتھ واپس آئی تو وجدان کی واپسی نے اسے سرشار کر دیا، اس کے وجدان کے کمرے کی طرف بڑھتے قدموں کو نائلہ نے روکا۔

”بھائی ابھی تھکا ہوا ہے۔ اسے آرام کرنے دو۔“

وہ نہیں چاہتی تھیں وجدان اس کو ڈانٹے کیونکہ شفا جس قدر تحمل مزاج اور صابر تھی۔ صلہ اتنی ہی حساس اور جذباتی تھی۔

☆☆☆

”مصطفیٰ!“ انوار صاحب نے ناشتے کی میز پر بیٹے کو پکارا تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”رعنا کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے بیٹا! اگلے ہفتے جانا ہے۔ تم چلو گے ہمارے ساتھ؟“

”جی بابا ضرور!“ وہ مسکرایا اور یہ مسکراہٹ تو پچھلے دو ہفتوں سے اس کے ہونٹوں سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس مسکراہٹ کے پیچھے بہت خاص وجہ تھی۔ اور وہ وجہ تھی اس کا نکاح جو نائلہ عمران سے اس کی پسند سے ہوا تھا۔ وہ اس کی خالہ زاد تھی، ان کی رخصتی تین ماہ بعد بڑے ماموں کی دبئی سے واپسی پر ہوتی۔

انوار اور نور بانو نے اس کی مسکراہٹ کے دائمی ہونے کی دعا مانگی تھی۔ مصطفیٰ انوار ان کی منتوں، مرادوں سے مانگی اکلوتی اولاد تھا۔

انوار اور حبیب دو ہی بھائی تھے۔ حبیب بڑے تھے۔ وہ گاؤں میں رہتے تھے۔ حبیب پندرہ جبکہ انوار دس برس کے تھے جب ان کے والدین کا انتقال ہوا ان کی پرورش چند برس تک چاچو نے کی لیکن حقیقت یہی کہ حبیب احمد، انوار کے ماں اور باپ بن گئے۔ انہوں نے بھائی کو اولاد کی مانند پالا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور حبیب انوار کے ساتھ شہر شفٹ ہو گئے۔

حبیب کی شادی چاچو کی بیٹی سے ہوئی تھی جبکہ انوار کی ان کی کلاس فیلو نور بانو سے ہوئی، اس میں ان کی پسند شامل تھی۔ حبیب کے دو بچے تھے، رعنا جو مصطفیٰ کی ہم عمر تھی اور چھوٹا فراز جو رعنا سے تین برس چھوٹا تھا۔ اگر حبیب نے انوار کو اولاد کی طرح پالا تھا تو انوار بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان کا کہا انوار کے لیے حرف آخر ہوتا تھا۔ دونوں بھائیوں کی خوش قسمتی کہ بیویاں بھی اچھی تھیں۔ ان کا گھرانہ روایتی خاندانی چپقلش سے پاک تھا۔

☆☆☆

”بھائی!“ رات ڈنر ٹیبل پر وجدان کو دیکھتے ہی صلہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھی لیکن وجدان کی سرد مہری نے اس کے قدم زنجیر کر دیے، مصطفیٰ، نور بانو اور نائلہ نے اس کا پھیکا پڑتا چہرہ شدت سے نوٹ کیا۔ صلہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بہن کے پاس والی چیئر پر بیٹھ گئی۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی وجدان تیزی سے اٹھا تو صلہ بھی اسی تیزی سے اٹھ کر اس کے سامنے آئی تھی۔ وجدان نے سرد نگاہوں سے اس

[illegible] اس کا قد اس کے شانوں تک آتا تھا۔

"آپ مجھے ایسے اگنور نہیں کر سکتے۔" مما، بابا اور دادو نے دونوں کو روبرو کھڑے دیکھا۔ "مجھے آج تک کسی نے اگنور نہیں کیا۔" انداز دھمکاتا ہوا تھا۔

"میرا شمار کسی میں نہیں ہوتا صلہ مصطفیٰ!" آخر وجدان نے زبان کو زحمت دے ہی دی۔ "میں وجدان ہوں اور اپنی مرضی کا مالک ہوں، آئندہ میرے راستے میں آنے یا مخاطب ہونے کی غلطی مت کرنا، میں یہاں صرف دادو کی وجہ سے تمہیں برداشت کر رہا ہوں۔" اس نے کن انکھیوں سے نائلہ اور مصطفیٰ کو دیکھتے ہوئے باور کروایا۔ پھر سر جھٹک کر قدم بڑھائے مگر اسے رکنا پڑا کہ کلائی صلہ کے ہاتھوں میں تھی۔

"میں صلہ مصطفیٰ ہوں اور یہ حقیقت میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" اس نے مغرور نقوش والے اس گندمی رنگت اور مضبوط سراپے کے مالک بھائی کو بہت پیار سے دیکھا مگر اس کا لہجہ آنکھوں کے تاثرات سے یکسر مختلف تھا، وجدان کا چہرہ گواہ تھا کہ وہ ضبط کے کن مراحل سے گزر رہا ہے۔

"مگر آپ نے اپنا پورا نام نہیں بتایا؟" اس کا انداز چیلنجنگ تھا۔ مما، بابا اور دادو نے بمشکل ہنسی چھپائی جبکہ شفا تو اس کی جرات پر دنگ بیٹھی تھی۔

"آپ وجدان مصطفیٰ ہیں۔" اس نے جم کر شہد رنگ آنکھوں میں دیکھا۔ "اس حقیقت سے آپ انکار نہیں کر سکتے...... کیا کر سکتے ہیں؟" اس کا انداز چڑانے والا تھا۔ وجدان اطمینان سے بازو سینے پر لپیٹے اس کے روبرو ہوا۔

"اچھا بولتی ہو تم مگر لفاظی مجھ پر اثر نہیں کرتی صلہ مصطفیٰ۔ آئندہ مجھ سے دور ہی رہنا ورنہ میں سب بھول جاؤں گا۔ یاد رکھوں گا تو صرف اتنا کہ تم کون ہو۔" اس کی آنکھوں اور لہجے میں کاٹ تھی۔ نائلہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ وجدان کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ صلہ شانے اچکاتی واپس ٹیبل پر آ گئی۔

"ریلیکس۔ آپ لوگ تو پریشان لگ رہے ہیں؟ ویسے دادو کیا یہ صاحب شروع سے ہی آدم بیزار ہیں یا صرف میرے لیے خاص طور پہ یہ رویہ اپنایا ہے؟" نور بانو مسکرا دیں۔

"دوسری بات درست ہے یہ رویہ صرف تمہارے لیے ہے۔ اسی لیے اس سے دور رہنا۔" ان کا انداز اکساتا ہوا تھا۔

"بہت رہ لیا دور، اب اس کھیل کو ختم کرتے ہوئے ان صاحب کو یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ وہ ہمارے بھائی ہیں۔" وہ جھٹکے سے اٹھی پھر بابا کی طرف دیکھا جو دلچسپی سے اس کے انداز ملاحظہ کر رہے تھے۔

"کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دیں بابا۔ آپ کے ولی عہد کے برے دن شروع ہوا چاہتے ہیں۔" مصطفیٰ اس کے دھمکی آمیز لہجے پر بے ساختہ ہنس پڑے جب کہ نائلہ نے بیٹی کو گھورا۔

"تمیز تو نام کو نہیں تم میں، بڑے بھائی کے لیے ایسے بولتے ہیں؟"

"ڈیئر مام! اگر بھائی وجدان مصطفیٰ جیسے ہوں تو سب چلتا ہے۔ اور اہم بات ہم بہن بھائیوں کے معاملے میں کوئی نہیں بولے گا۔" وہ اٹھ گئی۔

"اب اللہ ہی بچائے وجدان کو صلہ کے شر سے۔" مصطفیٰ کہتے ہوئے بے ساختہ مسکرائے تھے۔

☆☆☆

انوار اور نور بانو تین چار روز سے حبیب بھائی کی طرف تھے۔ اس روز مہندی تھی۔ مصطفیٰ تایا کی طرف جانے سے قبل خالہ کی طرف آیا، واپسی پر نائلہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔

"کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہیں؟"

"ان شاء اللہ پرسوں واپس آجاؤں گا۔" انہوں نے سرخ اور سرمئی لان کے پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس اس پیاری سی لڑکی کو نظر بھر کر دیکھا جو ان کی روح میں بستی تھی۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔" اس کے انداز میں ایسا کچھ تاثر تھا جس نے مصطفیٰ کو ٹھٹکا دیا۔

"تم پریشان ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ سنبھلی اور مصطفیٰ کی طرف دیکھا، آنکھوں کی نمی نے مصطفیٰ کو بے چین کر دیا۔ "مگر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر مگر کس سے؟" وہ حیران ہوا۔

"میں نہیں جانتی مگر مجھے لگ رہا ہے جیسے آپ مجھ سے دور چلے جائیں گے۔" مصطفیٰ شاکڈ رہ گیا۔

"وعدہ کریں۔" نائلہ نے ان کا ہاتھ جکڑا جو اس کے ذہنی انتشار کا ثبوت تھا۔ "آپ وعدہ کریں کچھ بھی ہو جائے آپ مجھے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔" اس کا کرلاتا لہجہ مصطفیٰ کو حواسوں میں کھینچ لایا۔ اس نے نرمی سے نائلہ کا ہاتھ تھاما۔

"میں وعدہ کرتا ہوں جان مصطفیٰ! مر تو جاؤں گا مگر تمہیں کبھی خود سے جدا نہیں کروں گا۔ اور تمہیں بھی اب مجھ سے یہی عہد کرنا ہو گا۔" مصطفیٰ کے کہنے پر اس نے آنسو رگڑتے بے ساختہ سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"میں دعا بدست ہوں اے خدا
کوئی خاص شے مجھے عام دے"

☆☆☆

صلہ نے وعدے کے مطابق وجدان کو ٹف ٹائم دینا چاہا تھا۔ کبھی وہ اس کا سیل چھپا دیتی۔ کبھی نوٹس آگے پیچھے کر دیتی تو کبھی استری شدہ کپڑوں کا ستیاناس کر دیتی لیکن یہاں نائلہ نے اس کے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کی گویا قسم کھا رکھی تھی۔ وہ وجدان کی تمام ضروریات کا اسے احساس دلائے بنا خیال رکھتی تھیں۔ وہ ماں کی وجہ سے سخت عاجز آ چکی تھی۔

وہ اس وقت بالکونی میں کھڑی تھی۔ نگاہیں دور تاروں بھرے آسمان پر جمی تھیں۔

"اللہ تعالیٰ۔" اس نے نہایت عاجزی سے کہتے پلکیں موند لیں۔

"آپ نے ماؤں کے دل کس چیز سے بنائے ہیں۔" اس لاپرواہ اور بے نیاز نظر آتی لڑکی کی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

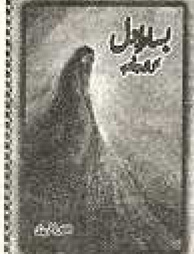

بساطِ دل
بھی عجیب شے ہے
افشاں آفریدی
قیمت -/400 روپے

فصل غم کا گوشوارہ
رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

گلِ کہسار
فرح بخاری
قیمت -/400 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

انہیں اس وقت بے بسی کے احساس سے بھیگ رہی تھیں۔

''پلیز آپ مجھے راستہ بتادیں میں بھائی کو کیسے مناؤں؟'' اس نے بے دردی سے گال رگڑے۔

''آپ تو جانتے ہیں ناں میں پچھلے کتنے برسوں سے بھائی سے ملنے کے لیے ترس رہی ہوں۔ اب تو وہ میرے بالکل سامنے ہیں پھر بھی قریب نہیں آنے دیتے۔ مجھے ان سے بہت سا لڑنا ہے۔'' آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے۔ وہ دوزانو فرش پر بیٹھی۔

''میں نہیں جانتی ان کی شخصیت پر چڑھا سختی کا خول کیسے اترے گا مگر آپ تو سب جانتے ہیں نا اللہ جی، آپ کو تو معلوم ہے نا مجھے اگر ان سے لڑنا ہے تو پیار بھی ان ہی سے کرنا ہے۔'' صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو وہ ہچکیوں سے رو پڑی تھی، نرم آغوش نے اسے خود میں سمیٹ لیا۔ وہ مصطفیٰ کے سینے میں چہرہ چھپائے بہت دیر تک روتی رہی۔

''میرا پیارا بچہ۔'' مصطفیٰ نے نرمی سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں سمیٹتے پیشانی چومی۔

''آپ جانتی ہیں صلہ! میدان جنگ میں مقابلے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے؟'' اب وہ اس کا سر سینے سے لگائے ریلنگ کے ساتھ پشت جوڑے ہوئے تھے۔ صلہ نے سر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھتے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''جی بابا ہتھیاروں کی، ہتھیار ہوں گے تو وہ مقابلہ کریں گے ناں؟''

''اونہوں!'' مصطفیٰ نرمی سے مسکرائے پھر سر نفی میں ہلایا۔ صلہ حیران ہوئی۔

''تو پھر کس چیز کی؟''

''ہتھیار کی اہمیت اپنی جگہ مگر بیٹے۔'' وہ سنجیدہ ہوئے۔ مقابلے کے لیے مضبوط قوت ارادی کی ضرورت ہوتی ہے، تب ہی جیت مقدر بنتی ہے۔ اور اب رونا نہیں، رونا کمزوری کی علامت ہے اور میری بیٹی تو شیر جوان ہے۔'' انہوں نے پیار سے اس کا سر تھپتھپایا۔

بھائی سے بھی بدگمان مت ہونا بیٹا کیونکہ قصور وار وہ نہیں شاید ہم ہیں۔'' ان کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہوا۔ صلہ نے ان کے ہاتھ تھامے۔

''سوری بابا۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں، بھائی بات کرنا تو دور میری طرف دیکھتے بھی نہیں۔'' وہ روہانسی ہوئی۔ ''اور آپ تو جانتے ہیں ناں؟ الفاظ صرف چبھتے ہیں۔ خاموشیاں مار دیتی ہیں۔''

''بھائی کو اس کے حال پر چھوڑ دو بیٹا! اسے اس رشتے کا احساس ہونے دو، زبردستی کسی کے دل میں جگہ نہیں بنائی جاسکتی۔ تم جتنا اس کی طرف بڑھوگی وہ تم سے دور جائے گا۔ وقت آنے دو ان شاءاللہ وہ تم دونوں کو تسلیم کرلے گا۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' اس نے امید بھری نگاہوں سے بابا کا چہرہ دیکھا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

☆☆☆

مہندی کی تقریب کے لیے لان میں لائٹنگ وغیرہ ہو رہی تھی جب مصطفیٰ تایا کی طرف پہنچا۔ سر شام سفید شلوار سوٹ گلے میں سبز اور پیلے رنگ کا دوپٹہ ڈالے بہت وجیہہ لگ رہا تھا مگر پچھلے تین ہفتوں سے جو مسکان ہونٹوں پر تھی وہ پھیکی سی تھی۔ دھڑکنوں کا ردھم معمول سے ہٹ کر تھا۔ وہ فراز کے ساتھ مصروف تھا۔ جب حبیب حواس باختہ سے انوار کے کمرے میں گئے۔

''کیا ہوا بھائی؟''

''انوار۔ وہ بھائی کا ہاتھ تھامے ہانپ گئے۔ ''برسوں کی عزت داؤ پر لگ گئی ہے جہان بنا بتائے واپس امریکا چلا گیا ہے۔'' انوار ساکت رہ گئے۔

''اس رشتے میں جہان کی مرضی شامل نہیں تھی۔ نہ مہندی کی رسم ہوگی نہ کل بارات آئے گی، انوار! ہم کیا منہ دکھائیں گے لوگوں کو؟'' انہوں نے اپنا تمام بوجھ بھائی کے کندھوں پر ڈال دیا۔

کی باہر مصروف تھا ۔۔۔ سے وہ یکسر لاعلم تھا۔ دھیان کا پنچھی مسلسل نائلہ کی طرف اڑان بھر رہا تھا اور اگلے پندرہ منٹ بعد وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے بابا اور تایا کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماں اور تائی بھی وہیں موجود تھیں۔

''بولو بیٹا جواب دو۔'' حبیب کے پکارنے پر وہ چونکا۔ پھر خالی خالی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔ بڑے بابا! آپ جانتے ہیں میرا نکاح ہو چکا ہے۔'' اس کا انداز روہانسا تھا۔ (بس رو دینے کی کسر رہ گئی تھی)

''مجھے معلوم ہے بیٹا مگر پرکھوں کی عزت داؤ پر لگی ہے۔ لوگ کیا کیا باتیں نہیں بنائیں گے۔'' تایا مجسم عاجزی کا پیکر لگ رہے تھے۔

مصطفیٰ نے بابا کا ستا چہرہ دیکھا تو تصور میں سرمئی نم آنکھیں گھوم گئیں۔ تو وہ ڈر وہم نہیں حقیقت تھا۔ آنے والے وقت کی آہٹیں تھیں جو نائلہ مصطفیٰ کو خوفزدہ کر رہی تھیں۔ بابا نے اس کے بولنے کا انتظار کیا اور جب وہ بولا تو صرف لفظ ''نائلہ!''

''تم مان جاؤ تو میں خود بات کرلیتا ہوں نائلہ بچی ہے۔'' انوار بھائی محبتوں کا قرض چکانے کے لیے اسے قربان کرنے کا گویا فیصلہ کر چکے تھے۔ اور مصطفیٰ انوار کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اگر محبتوں نے خراج ہی مانگنا تھا اور ان کا احسان چکانا اتنا ہی ضروری ہے تو پھر یہ نوازشوں کے ٹوکرے محبتوں کی صورت سروں پر دھرے ہی کیوں جاتے ہیں۔ رشتوں کا خالص پن، بے غرضی کہیں پیچھے رہ جاتی ہے۔ رہ جاتے ہیں تو صرف قرض اور قرض چکائے بنا معافی نہیں ملتی۔ وہ ساکت کھڑا تھا جب کہ انوار، نائلہ کا نمبر ڈائل کر چکے تھے۔ دوسری جانب گہری خاموشی تھی۔ لاؤڈر آن تھا۔ چند لمحوں کی جان لیوا خاموشی کے بعد نائلہ کی سسکیوں نے مصطفیٰ کا سکتہ توڑا تو باپ کا چہرہ دیکھا۔

''بولو بیٹے میری عزت کا سوال ہے۔'' انوار کا لہجہ ملتجی تھا۔

''جیسا آپ چاہیں ماموں میری طرف سے اجازت ہے۔'' ۔۔۔ انوار گویا کھڑے کھڑے بے جان ہوگیا۔

''ہم اپنے عہد کی خوشیاں خریدتے کیسے
ہماری جیب میں پچھلی صدی کے سکے تھے''

☆☆☆

اس روز اتوار تھا اور شفا کو اپنی دوست انشرح کی طرف جانا تھا۔ وہ مصطفیٰ سے کہہ چکی تھی۔ وہ لوگ اس وقت ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ وجدان، دادی کے قدموں میں بیٹھا میچ دیکھ رہا تھا جو اس کے سر میں مساج کر رہی تھیں۔ مصطفیٰ بچیوں کے انتظار میں تھے، نائلہ چائے بنانے گئی تھیں۔

تبھی شفا لائٹ پرپل سوٹ میں ملبوس وہاں آگئی اس کے پیچھے صلہ بھی تھی، مہندی اور سرخ لان کا خوب صورت پرنٹ کا سوٹ پہنے دونوں بچیاں بہت پیاری تھیں۔

وجدان نے بلا ارادہ شفا کی طرف دیکھا اور بے ساختہ و لاشعوری طور پر مسکرایا بھی، اسے شاید خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ مسکرایا ہے۔ لیکن مصطفیٰ اور صلہ نے فوراً اس کی مسکراہٹ نوٹس کی تھی۔

''بابا چلیں؟''

''چلتے ہیں بیٹا! آپ کی مما چائے بنانے گئی ہیں۔ پی کر نکلتے ہیں۔'' شفا ایک نظر بھائی کو دیکھتے ہوئے بابا کے پاس آبیٹھی۔ وجدان سیل کی طرف متوجہ ہوگیا۔ چائے پیتے ہی مصطفیٰ اٹھے پھر صلہ کی طرف دیکھا۔

''صلہ بھی جارہی ہے؟''

''جی بابا۔'' وہ بھی اٹھی، شفا اور مصطفیٰ کے ساتھ قدم بڑھاتے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وجدان نے پلکیں موندی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت صلہ کو اتنا پیارا لگا کہ قدم بے ساختہ پلٹے۔ مصطفیٰ، شفا، دادو اور نائلہ نے گویا سانس روک کر اس کے پلٹتے قدموں کو دیکھا۔ وہ دبے قدموں اس تک پہنچی، چند سیکنڈز اس کا چہرہ دیکھا شاید وہ نیم غنودگی میں تھا۔ اسے صلہ کی اپنے پاس موجودگی کا احساس نہیں تھا، صلہ جھکی اور اس

نے ماتھے پر پیار کیا۔ وجدان کی ... کھلیں مگر اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتا صلہ کھلکھلاتے ہوئے دہلیز پار کر گئی۔

☆☆☆

صلہ کافی دیر بائیں ہتھیلی پر چہرہ ٹکائے ٹکٹکی باندھے انشراح کا چہرہ دیکھ رہی تھی، انشراح جھنجلائی ہوئی تھی۔

”آخر مسئلہ کیا ہے نشی؟“ شفا نے دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”مسئلہ یہ ہے۔“ اس نے الماری سے بلیک شیفون کی فراک نکالی جس کے دامن، گلے اور آستینوں پر سلور کڑھائی تھی جو بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”یہ پھپھو لائی ہیں اور انہوں نے سختی سے کہا ہے بارات والے روز مجھے یہی پہننا ہے کیوں کہ ان کی بیٹیوں کے لباس بھی اسی کلر اور ڈیزائن کے ہیں۔“ وہ روہانسی ہوئی۔

”میرا سوال یہ ہے انشراح جی! آخر پھپھو صاحبہ کو آپ پر اتنا پیار کیوں آ رہا ہے؟“ صلہ نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

”بدتمیز! انشراح بڑی ہے تم سے۔“ شفا نے ٹوکا مگر اس نے لاپروائی سے ہاتھ ہلایا گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

”آپ بتائیں پھپھو کو اتنا پیار کیوں آیا۔“ وہ مشکوک نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

”یار وہ شروع سے ہی مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔“ انشراح اس کی فضول تکرار پر جھنجلا گئی۔

”بھلا کیوں؟“ صلہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی شفا نے حیرت سے اس کا ردعمل دیکھا۔

”یہ کیسا بے تکا سوال ہے صلہ، وہ میری پھپھو ہیں۔“ انشراح نے اسے گھورا۔

”ان کے بیٹے کتنے ہیں؟“ صلہ نے اس بار روہانسے لہجے میں پوچھا۔

”بیٹا نہیں ہے یار! تین بیٹیاں ہی ہیں۔ صلہ نے اس کی بات پر بے ساختہ پر سکون سانس خارج کی اور تم خوامخواہ فضول سوال پوچھ رہی ہو، مجھے بتاؤ بلیک کلر کیسا لگے گا مجھ پر۔“ اس کا مسئلہ جوں کا توں تھا۔

”بہت اچھا لگے گا۔“ صلہ کھلکھلائی۔ انشراح نے ان سنا کر دیا۔

”پھپھو بھی حد کرتی ہیں۔ کیا ضرورت تھی انہیں میرے لیے بلیک کلر لینے کی، ان کی بیٹیوں کی رنگت صاف ہے اور میں سانولی، بھلا سانولی رنگت پر بلیک کلر اچھا لگے گا۔“ اس نے دہائی دی۔

”کم آن نشی!“ شفا نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ”تمہاری رنگت گندمی ہے سانولی نہیں اور تمہارے نقوش بھی ماشاء اللہ بہت پیارے ہیں۔ یقین کرو بلیک کلر بہت سوٹ کرے گا تم پر۔ بلاوجہ کا ٹینس ہو رہی ہو۔“

”تم میری دوست ہو تمہیں تو میں پیاری ہی لگوں گی۔ صلہ تم بتاؤ؟ اور دیکھو بالکل سچ بتانا۔“

”میری رائے مت پوچھیں۔“ صلہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ”مجھے تو آپ بہت پیاری لگتی ہیں۔ مطلب اتنی پیاری کہ میں نے فیصلہ کیا ہے آپ ہی میری بھابھی بنیں گی۔“ اس نے جس قدر لاپروائی سے کہا تھا۔ انشراح اور شفا ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

”ابھی تم نے کیا کہا صلہ؟“ انشراح کو چند لمحے لگے سنبھلنے میں اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ مگر صلہ پرسکون تھی۔

”یہی کہ آپ مجھے بطور بھابھی پسند آ گئی ہیں اور میں نے فیصلہ کیا ہے جیسے ہی بھائی ایگزامز سے فری ہوں گے میں مما پاپا سے بات کرنے والی ہوں۔“

☆☆☆

”یاد آتا ہے سکوت شب میں وہ اکثر مجھے\
کھینچ لاتا ہے میرے اندر سے وہ باہر مجھے\
کچھ خبر لے آؤ اس کی فروری کی بارشوں\
اب بہت سونا لگے اس کے بنا یہ گھر مجھے“

رعنا اور مصطفیٰ کی شادی کو تین ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران نائلہ اور ... کی کوئی رابطہ نہیں تھا اور ان تین ماہ میں انوار اور نور بانو نے ایک پل کے لیے بھی بیٹے کے چہرے پر ہلکی سی مسکان کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ خالو کو جب اس کے نکاح کی خبر ہوئی تو ان کا ردعمل شدید تھا، عجیب نہ تھا کہ وہ خلع کا نوٹس بھجوا دیتے مگر یہاں نائلہ، مصطفیٰ کے سامنے ڈھال بن گئی تھی۔ اسے آخری ملاقات کا وہ عہد یاد تھا خالو نے بیٹی کی خاطر خاموشی اختیار کر لی۔ اگر اسے اعتراض نہیں تھا تو وہ کیوں بیٹی کا دل اور گھر اجاڑتے۔

مصطفیٰ انوار میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ وہ نائلہ کا سامنا کرتا اور اسی کشمکش میں ساڑھے آٹھ ماہ گزر گئے۔

رعنا حبیب ان دنوں اونچی ہواؤں میں تھی۔ چاچو چاچی اور مصطفیٰ پر وہ صرف اپنا حق سمجھتی تھی۔ اسے مصطفیٰ کا خالی دل اور اداسی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ انمول انسان اسے بن مانگے مل گیا تھا۔ اور کچھ لوگ ہوتے ہیں نا ایسے ناشکرے جنہیں نعمتیں بن مانگی دعاؤں کی صورت مل جاتی ہیں تو وہ اپنی حیثیت بھول جاتے ہیں۔ تو رعنا حبیب کا شمار بھی ایسے ہی ناشکرے لوگوں میں ہوتا تھا۔

وہ مصطفیٰ کی نرم دلی کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگی تھی۔ چاچو کی محبت پر تو اسے گھمنڈ تھا اور آج کل تو یوں بھی بہت خوش تھی کہ ان کے ہاں ننھے مہمان کی آمد متوقع تھی۔ مصطفیٰ حیران تھا تو نور بانو اور انوار بہت خوش۔ اور رعنا حبیب جو کچھ سوچ چکی تھی اس کا اندازہ شاید کسی کو بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

”صلہ بیٹا بھائی کو بھیجو میرے پاس۔“ مصطفیٰ نے اسے اسٹڈی کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر کہا تو وہ سر ہلاتے وجدان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آہستہ سے دستک دیتے ہوئے اندر جھانکا تو وہ اسے بیڈ پر نیم دراز نظر آیا۔ ایک نظر صلہ پر ڈال کر نگاہ پھیر لی۔ وہ اس کے پیروں کے پاس بیٹھی تو وجدان نے پاؤں سمیٹتے اسے گھورا۔

”کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے یوں پوچھا گویا وجدان کا نظر انداز کرنا نظر ہی نہ آیا ہو۔

”کیوں آئی ہو؟“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”آپ کو پاپا بلا رہے ہیں۔ اسٹڈی میں۔“ پاؤں جھلاتے بے نیازی سے جواب آیا۔

”تم چلو میں آ رہا ہوں۔“ وہ اٹھا۔

”پاپا نے کہا تھا۔ آپ کو ساتھ لے کر آؤں۔“ واش روم کی طرف بڑھتا وجدان ٹھٹک کر رکا۔

”میری ماں بننے کی کوشش مت کیا کرو صلہ، جتنا کہا جائے صرف اتنا ہی کیا کرو۔“ وجدان نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے گھورا۔

”یقین کریں مسکراتے ہوئے بہت پیارے لگیں گے آپ۔“ اس سے کچھ بھی کہنا فضول تھا۔ وجدان نے سر جھٹک کر چپل پہنی۔

”اگر آپ مجھ سے پیار سے بات کر لیا کریں تو میں بھی آپ کو ستانا چھوڑ دوں گی۔“ اس نے جیسے اطلاع دی تھی۔

”نجانے تم کس مٹی سے بنی ہو صلہ، شفا بھی تو تمہاری بہن ہے۔ صرف ایک بار اسے سمجھایا مجال ہے جو اس نے پھر کبھی ڈسٹرب کیا ہو اور ایک تم ہو۔“ اس نے افسوس سے کہا تو صلہ مسکرا دی۔

”مجھے شفا سے کمپیئر مت کریں۔ میں صلہ مصطفیٰ ہوں۔“ اس نے وجدان کی کلائی نرمی سے دونوں ہاتھوں میں تھامی۔

”کلائی چھوڑو۔“

”آپ میرے ساتھ اتنا روڈلی کیوں بی ہیو کرتے ہیں۔“ وہ سنجیدہ تھی۔

”صلہ میں نے کہا ہاتھ چھوڑو۔“ وجدان نے اس کا سوال ان سنا کرتے ہوئے پھر سے کہا۔

”پہلے آپ کو بتانا ہوگا آپ کیوں اتنے روڈ ہو جاتے ہیں۔ آہ۔“ وجدان نے جھٹکے سے کلائی چھڑائی تو صلہ کی کلائی مڑ گئی۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔ آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ وجدان کو ایک دم ہی پچھتاوے نے آن گھیرا۔

''ادھر دکھاؤ۔'' وجدان اسے لیے صوفے پر بیٹھا۔ انداز میں تشویش تھی۔ صلہ کے آنسوؤں میں روانی آ گئی اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''کب سے کہہ رہا ہوں کلائی چھوڑو مگر نہیں، وہ صلہ ہی کیا جو میری کوئی بات آسانی سے سمجھ لے۔'' وجدان نے دوبارہ اس کی کلائی نرمی سے تھامی وہ جھنجلایا ہوا تھا۔

''شکر ہے موچ نہیں آئی اٹھو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ بہت درد ہو رہا ہے؟'' صلہ کے آنسو اسے پریشان کر رہے تھے اس لیے بے چینی سے پوچھا۔ ''اٹھو نا ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں۔''

''مجھے کہیں نہیں جانا اور آپ اس ذرا سی تکلیف کے لیے پریشان ہو رہے ہیں مگر یہ تکلیف اس کے سامنے کچھ بھی نہیں جو مجھے آپ کے رویے سے ہوتی ہے۔ آخر ایسا کون سا گناہ کر دیا ہے ہم نے جس کی اتنی کڑی سزا دے رہے ہیں۔'' صلہ نے بے دردی سے گال رگڑے تو وجدان گویا نیند سے جاگا۔ ایک دم چہرہ سپاٹ ہوا، وہ پھر سے خول میں بند پرانا وجدان بن گیا۔

''تمہاری مرضی، مت دکھاؤ ڈاکٹر کو۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔'' وہ باہر نکل گیا۔

''مجھے بلایا تھا آپ نے۔'' چند لمحوں بعد وہ مصطفیٰ کے سامنے کھڑا تھا۔ جینز گرے ٹی شرٹ، سیاہ سلکی بال اور چہرہ کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

''بیٹھو۔'' مصطفیٰ کے کہنے پر وہ ان کے سامنے چیئر پہ بیٹھ گیا۔ اگلے ماہ تمہارے فائنل ایگزام ہیں۔ آگے کیا پلان ہے؟'' انہوں نے ریڈنگ گلاسز اتارتے لاتعلق بیٹھے بیٹے کو پیار سے دیکھا۔

''کیسا پلان؟''

''مطلب ایگزامز کے بعد کیا کرو گے؟''

''ان شاء اللہ جاب۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''اس کا مطلب تم مجھے جوائن نہیں کرو گے؟''

وجدان نے سر ہلایا۔

''وجہ جان سکتا ہوں؟'' مصطفیٰ سنجیدہ ہوئے۔

''جی نہیں۔''

''تم ایسا کیوں کر رہے ہو وجدان؟''

''مطلب؟ کیا کر رہا ہوں میں؟'' بازو سینے پر لپیٹتے اطمینان سے ان کا بے سکون چہرہ دیکھا۔ تبھی نائلہ چائے لے کر وہاں آ گئیں۔

''وجدان چینی کتنی لو گے بیٹا؟'' انہوں نے مصطفیٰ کے بعد اس سے پوچھا۔

''میں اس وقت چائے نہیں پیتا۔'' بنا ان کی طرف دیکھے جواب دیا اس کے روکھے انداز پر نائلہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔ مصطفیٰ نے از حد سنجیدگی سے وجدان کو دیکھا۔

''کیا تمہارا رویہ گھر والوں کے ساتھ مناسب ہے؟''

''مجھے تو لگتا ہے، باقی کیا سمجھتے ہیں مجھے اس کی پرواہ نہیں۔''

''تمہارا انداز بہت غلط ہے وجدان! رشتوں کی ناقدری اکیلے پن کے سوا کچھ نہیں دیتی بیٹا، یہ رشتے یوں بے مول کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔ میں نہیں چاہتا تمہیں زندگی میں کبھی پچھتانا پڑے۔''

''اب میں جاؤں؟'' اس کے لہجے میں بے زاری محسوس کرتے مصطفیٰ نے لب بھینچتے ہوئے سر ہلا کر اجازت دے دی۔

☆☆☆

رات کھانے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو پڑھنے کی نیت سے کتاب اٹھائی مگر نگاہوں کے سامنے تکلیف کی شدت سے سرخ پڑتا چہرہ اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں آ گئیں۔ ایک بار، دوبار اس نے خیال جھٹکنے کی کوشش کی جس میں بری طرح ناکامی ہوئی۔ کیونکہ صلہ دوپہر کے بعد سے اسے نظر نہیں آئی تھی اور کھانے کی میز پر بھی وہ موجود نہیں تھی۔ اس کی غیر موجودگی کا وہ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکا تھا (خاموشی انا کا تقاضا تھی) اور اس وقت وہ بے چین ہو رہا تھا۔

''بے وقوف لڑکی۔'' کتاب ٹیبل پر پٹختے وہ دادو کے کمرے کی طرف آیا تھا۔

جب سے مصطفیٰ فیملی کے ساتھ یہاں شفٹ ہوئے تھے۔ وہ بہت کم ان کے کمرے میں جاتا تھا۔ کیونکہ نائلہ اکثر ان کے پاس ہوتی تھیں۔ اس وقت وہ ناک کر کے اندر آیا تو دادو نماز عشاء ادا کر رہی تھیں۔ وجدان ان کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ تب ہی شفا اندر آئی اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ وجدان کی موجودگی کے باعث وہ چوکھٹ میں رک گئی۔

''اندر آ جاؤ وہاں کیوں کھڑی ہو؟'' وجدان کی اجازت ملتے ہی وہ اندر آئی گلاس ٹیبل پر رکھا اور سیدھی ہوئی تو وجدان کو اپنی طرف متوجہ پا کر نروس ہو گئی۔

''آپ کے لیے دودھ لاؤں بھائی؟''

''نہیں تم ادھر میرے پاس بیٹھو۔'' اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ شفا اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''کیسی ہو تم؟''

''جی میں ٹھیک ہوں۔''

''اور صلہ کیسی ہے؟ نظر بھی نہیں آ رہی۔'' انداز سرسری سا تھا۔

''صلہ بھی ٹھیک ہے۔ ویک اینڈ تھا۔ اس لیے ودا ماموں کی طرف چلی گئی۔''

''او......'' وجدان نے پرسکون سانس خارج کی۔ وہ ٹھیک تھی، یہ قابل سکون اطلاع تھی۔

''کون سی کلاس میں پڑھتی ہو تم اور صلہ؟''

''میں بی ایس سی فائنل میں اور صلہ میٹرک، نمونیہ کی وجہ سے اس کا ایک سال مس ہو گیا تھا۔'' وہ بہت نرم لہجے میں بولتی تھی۔ وجدان کو بے ساختہ اس پر پیار آیا تو ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم دادو کو بتا دینا۔'' جاتے جاتے وہ چوکھٹ میں رک کر ایک دم پلٹا تو شفا جو اس کی پشت دیکھتے مسکرا رہی تھی۔ اس کے اچانک پلٹنے پر بے ساختہ سٹپٹا گئی۔ وجدان مسکرا دیا۔

''شب بخیر شفا!'' نرمی سے کہتے ہوئے وہ دہلیز پار کر گیا۔

☆☆☆

انوار اور نور بانو بے یقینی سے رعنا کو دیکھ رہے تھے، وہ کیا کہہ رہی ہے۔ جبکہ مصطفیٰ یوں بیٹھے تھے گویا وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ رعنا ان کے انداز پر جھنجلا گئی۔

''آپ سن رہے ہیں مصطفیٰ؟'' مصطفیٰ نے سرخ آنکھوں سے رعنا کو دیکھا۔

''ہاں، میں نے سن لیا۔'' وہ یوں بولے گویا صدیوں کی مسافت طے کر آئے ہوں۔

''تو کب چھوڑ رہے ہیں نائلہ کو؟'' یہ نام لیتے ہوئے رعنا کے منہ کے زاویے بگڑے تھے۔

''میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا رعنا!'' انہوں نے سکون سے جواب دیا۔

''کیا مطلب!''

''مطلب یہ رعنا! کہ میں مر تو سکتا ہوں مگر اسے نہیں چھوڑ سکتا۔'' رعنا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''اگر تم چاہتی ہو کہ میں اسے چھوڑ دوں تو ٹھیک ہے میں یہ دنیا چھوڑ دوں گا۔''

انوار صاحب اور نور بانو نے دہل کر مصطفیٰ کا سرخ چہرہ دیکھا۔ انوار حیرت و بے یقینی سے عزیز از جان بھتیجی کی سنگ دلی اور باغیانہ انداز دیکھ رہے تھے۔

''میں اس ڈائن کو اپنا حق غصب کرنے نہیں دوں گی مصطفیٰ!'' رعنا چلائی۔

''تصحیح کرو رعنا! اس کے حقوق تم نے غصب کیے ہیں۔'' مصطفیٰ کے صبر کا پیمانہ گویا لبریز ہو چکا تھا۔ رعنا ہی کے انداز میں جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے، پھر مجھے چھوڑ دیں۔'' رعنا نے چند لمحوں بعد ان کی سماعتوں پر بم گرایا تو وہاں سکوت چھا گیا۔

''ٹھیک ہے میرا بچہ میرے حوالے کر دو تو میں تمہیں آزاد کر دیتا ہوں۔''

”مصطفیٰ۔“ انوار نے حیرت و بے یقینی سے بیٹے کو پکارا۔ رعنا ساکت کھڑی تھی۔ (مصطفیٰ اتنی آسانی سے اسے چھوڑ سکتا تھا؟)

”بابا، آپ سن رہے ہیں، یہ کیا کہہ رہی ہے؟“ اس کا انداز شکایتی تھا۔

”ہاں سن لیا جو اس نے کہا اور وہ بھی جو تم نے کہا۔ تم اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتے ہو مصطفیٰ؟“

”میرا کہا آپ نے سن لیا مگر جو رعنا کہہ رہی ہے، شاید آپ وہ نہیں سن سکے۔“ اس کا انداز نروٹھا تھا۔

”طلب کریں تو یہ آنکھیں ہی ان کو دے دوں
مگر یہ لوگ آنکھوں کے خواب مانگتے ہیں“

اس سے قبل کہ مصطفیٰ ضبط کھو کر باپ سے بدتمیزی کرتا، نور بانو اسے کمرے میں لے گئیں۔

”آپ نے دیکھا اماں، رعنا اور بابا کیا کہہ رہے ہیں؟“

”کم تو تم نے بھی نہیں کیا۔“ ماں کے انداز پر بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”پچھلے آٹھ، نو ماہ سے جو نائلہ کو انتظار کی سولی پر چڑھا رکھا ہے۔ اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے تم سے محبت کی، اس شخص سے محبت کی سزا مل رہی ہے اس بچی کو جس کا پور پور احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہے۔“ انہوں نے دوپٹے سے چہرہ رگڑا۔

”تم اپنے باپ پر دھرے احسانوں کا بوجھ اٹھاؤ مصطفیٰ اور اسے آزاد کر دو۔“ مصطفیٰ نے تڑپ کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

”اماں پلیز! آپ کیوں میری جان نکال رہی ہیں۔ میں اتنا باہمت نہیں کہ اس کا سامنا کر سکوں، اتنے مہینوں میں سینکڑوں بار اس کے گھر کے دروازے سے لوٹا ہوں، یقین کریں اماں مجھے اس کے سامنے جانے سے ڈر لگتا ہے۔“ نور بانو نے بے یقینی سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

”میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، میں اس کے سامنے جاؤں گا تو وہ روئے گی اور یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا اور اس بار تو اس کے آنسوؤں کی وجہ بھی میں خود ہوں۔ میں اپنی بساط سے بڑھ کر خود پر جبر کر چکا ہوں، مزید نہیں کر سکتا۔ اماں پلیز مجھ پر رحم کریں۔ بابا سے کہیں وہ مجھے گناہ گار نہ کریں، میرا ضمیر مجھے سونے نہیں دیتا۔“ گھٹنوں کے بل ماں کے سامنے بیٹھتے جیسے وہ ضبط کی آخری حدود کو پہنچ چکا تھا۔

”کبوتر کے آنکھ بند کر لینے سے بلی بھاگ نہیں جاتی مصطفیٰ۔“ نور بانو نے اس کے گھنے بالوں کو سنوارا۔ ”کب تک چھپتے پھرو گے اس سے بھی اور خود سے بھی، کیوں اذیت دے رہے ہو خود کو، کیوں اسے انتظار کی سولی پر لٹکا رکھا ہے، اس ہجر کو ختم کر دو مصطفیٰ۔ میں اپنی بھانجی کی خوشیوں کی بھیک مانگتی ہوں۔“ انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”اماں پلیز!“ مصطفیٰ نے بے ساختہ ان کے جڑے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیے۔ ”پلیز گناہ گار تو مت کریں۔“

بہت امید رکھنا اور پھر بے آس ہونا بھی
شر کو مار دیتا ہے بہت حساس ہونا بھی

مصطفیٰ انوار کو اپنی حساسیت نے اسے دوہرے عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ جبکہ دہلیز کے پار انوار نم آنکھوں سے بند دروازے کو دیکھ رہے تھے، مقروض وہ تھے اور ہرجانہ ان کی اولاد بھر رہی تھی۔

☆☆☆

وجدان ان دنوں کمبائن اسٹڈی کے لیے فاخر کی طرف وقت گزار رہا تھا، فاخر، وجدان اور بینش کالج سے ساتھ تھے، فاخر اور بینش کے گھر ایک ہی علاقے میں تھے۔ اس روز بینش وہاں نہیں آسکی تھی۔

”سنا ہے بینش کے لیے پروپوزل آیا ہوا ہے؟“ فاخر نے سرسری انداز میں ذکر کرتے ہوئے وجدان کا چہرہ دیکھا۔

”بس میرا اندازہ ہے۔“

”او بھائی پلیز۔“ وجدان نے جھٹ سے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ ”ایسے انداز سے لگانے سے گریز کیا کرو۔“ اس سے قبل کہ فاخر کچھ بولتا، اس کی چھوٹی بہن جو صلہ کی ہم عمر تھی، دستک دے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وجدان اسے دیکھ کر بے ساختہ مسکرایا۔

”آپ بزی تو نہیں ہیں بھائی؟“

”نہیں کیوں؟“

”مجھے بازار جانا ہے۔“ وجدان نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا (سحر کی یہ ادا بالکل صلہ جیسی تھی)

”اس وقت کیوں بھئی!؟“

”کل میری فرینڈ کا برتھ ڈے ہے، ارجنٹ گفٹ چاہیے۔“ وہ دھپ سے فاخر کے پاس صوفے پر بیٹھی۔

”شام میں چلیں گے۔“ فاخر نے اسے ٹالنا چاہا۔ وجدان کرسی کی بیک سے ٹیک لگائے پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھا۔ لبوں پر مسکان تھی۔

”نہیں ناں بھائی! پلیز ابھی چلیں۔“ اس نے فاخر کو بازو سے تھام کر کھڑا کر لیا۔ وجدان کی مسکراہٹ سمٹی، ایک دم سیدھا ہوا، فاخر نے معذرت خواہانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وجدان پھیکے سے انداز میں مسکراتے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں چلتا ہوں فاخر، کل ملتے ہیں۔“ والٹ اٹھاتے اس نے لاشعوری طور پر فاخر کے دائیں بازو کے حصار میں موجود سحر کو دیکھا، فاخر اس کی بات پر مسکراتے ہوئے اسے چپت لگا رہا تھا۔ اس کا دل جانے کیوں یہ منظر دیکھ کر بھر آیا۔ (بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں نا اور پروردگار اس مان کو ہمیشہ سلامت رکھے آمین) وہ تیزی سے وہاں سے نکل آیا۔

وہ بوجھل دل اور نڈھال قدموں سے واپس آیا تو رخ دادو کے کمرے کی طرف تھا۔ مصطفیٰ بھی بیٹھے وہیں تھے۔ تھکی تھکی سی سانس خارج کرتے اس سے قبل وہ پلٹ جاتا صلہ کی جوشیلی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

”سچ میں دادو! میں نے اس روز پہلی بار انشراح کو بغور دیکھا تو فوراً ہی میرے سامنے بھائی کی صورت آگئی۔ (اس عجیب لاجک پر وجدان نے بند دروازے کو گھورا) بس اسی وقت مجھے خیال آیا یہی تو ہیں وہ ہستی جو میری بھابھی بنیں گی۔ (وجدان نے سر جھٹکا بے وقوف لڑکی) تو پھر ہم لوگ کب جائیں گے بابا ان کی طرف؟“

”تمہیں کب عقل آئے گی صلہ؟“ نائلہ نے اسے ڈپٹا۔

”اس میں عقل کی کیا بات ہے؟“ اس نے منہ بسورا۔ ”اور آپ کو کیا اعتراض ہے، تنی پڑا اتنی پیاری تو ہے۔“

”آپ دیکھ رہے ہیں اس کے انداز؟“ نائلہ نے مصطفیٰ سے شکایت کی جو مسلسل مسکرا رہے تھے۔

”کیسے بدتمیزی سے انشراح کا نام لے رہی ہے اور آپ مسکرا رہے ہیں۔“

”صلہ بری بات بیٹا! بڑوں کو نام سے نہیں پکارتے۔“ مصطفیٰ نے متبسم لہجے میں سمجھایا۔

”تو ابھی سے بھابھی پکارنا شروع کر دوں؟“ وہ چہکی۔

”صلہ!“ نائلہ نے ڈپٹا۔

”فضول مت بولو۔ وجدان کبھی نہیں مانے گا۔“

”کیوں نہیں مانیں گے۔ ان کے تو بڑے بھی مانیں گے۔“

بڑوں کو کوئی اعتراض نہیں، تم وجدان کو منا لو۔ ہماری طرف سے ڈن ہے۔“ مصطفیٰ نے اس بار قدرے سنجیدگی سے کہا تو نائلہ نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

”آپ اسے سمجھانے کے بجائے الٹا ورغلا رہے ہیں۔ اماں دیکھیں ذرا۔“

”تمہیں کیا اعتراض ہے بھئی؟“ مصطفیٰ نے نرمی سے پوچھا۔

”اعتراض مجھے نہیں وجدان کو ہوگا، وہ کبھی نہیں مانے گا اور ہو سکتا ہے اس کی پسند کوئی اور ہو۔ صلہ تو بچی ہے آپ کو تو اسے سمجھانا چاہیے۔“

”یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ بھائی کی پسند کوئی اور

بھابھی صرف انشراح آپی ہی بنیں گی۔ بھائی سیدھے سے مان گئے تو ٹھیک ورنہ صلہ مصطفیٰ کو گھی ٹیڑھی انگلی سے بھی نکالنا آتا ہے۔" اس کے دھمکی آمیز لہجے پر وجدان بے ساختہ مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔

☆☆☆

رعنا اپنے مطالبے سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ مجبوراً انوار صاحب کو حبیب سے اس صورت حال پر بات چیت کرنا پڑی اور انہوں نے واضح الفاظ میں بیٹی کو باور کروایا تھا۔ اگر آئندہ اس نے نائلہ کو چھوڑنے کا مطالبہ کیا تو وہ بری طرح پیش آئیں گے اور یہ بھی کہ وہ خود صفدر کی طرف جائیں گے رخصتی کی تاریخ لینے۔ رعنا نے بے یقینی سے باپ کا چہرہ دیکھا تھا اور یہی بے یقینی مصطفیٰ کی آنکھوں میں بھی تھی، کسی کے صبر کو اتنا نہیں آزمانے کہ وہ باغی پن پر اتر آئے۔

"وہ اس گھر میں نہیں آئے گی بابا۔"

"وہ یہیں آئے گی رعنا۔" حبیب نے اسی کے انداز میں کہا۔

"جب تک میں زندہ ہوں وہ اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھے گی ورنہ میں بچے کو بھی مار دوں گی اور خود بھی مر جاؤں گی۔" اس نے سب کو حیران کر دیا، حبیب بیٹی کی طبیعت سے اچھی طرح آگاہ تھے، اسی لیے انہوں نے مصطفیٰ کو شادی کے بعد فلیٹ گفٹ کیا تھا اور ڈیڑھ ماہ بعد نائلہ اسی فلیٹ میں رخصت ہو کر آئی تھی۔

کچھ وقت گزرا تو رعنا کے ہاں وجدان کی ولادت ہوئی، بڑی بڑی شہد رنگ آنکھوں والا وجدان مصطفیٰ کی شبیہ تھا، مصطفیٰ کا زیادہ تر وقت وجدان ہاؤس میں گزرتا تھا۔ بیٹے کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھا، رعنا کے لیے بھی وہ بہت حساس ہو گیا تھا، اور رعنا وہ تمام عنایات حق سمجھتے وصول کرتی۔ مصطفیٰ کی آمد پر وہ نائلہ کے لیے ہمیشہ برے الفاظ دہرائی تھی۔

[illegible] کو پابند کرے تو وہ کیا کرے گی۔ وہ نائلہ سے شدید حسد کا شکار تھی، نائلہ اکثر وجدان کے لیے تحائف بھیجتی جو رعنا ملازمہ کے حوالے کر دیتی تھی۔ مصطفیٰ دونوں بیویوں کے انداز دیکھتے، موازنہ کرتے تو نائلہ کے ظرف پر حیران رہ جاتے۔ نجانے وہ کس مٹی سے بنی تھی۔ اتنا ظرف کیسے تھا اس میں کہ سوتن کو کھلے دل سے برداشت کر رہی تھی۔

وہ کبھی مصطفیٰ کو وجدان ہاؤس جانے سے منع نہیں کرتی تھی۔ اگر وہ تین چار روز وہاں نہ جا پاتا تو وہ اصرار کر کے بھیجتی۔ مصطفیٰ کے سیل میں وجدان کی تصاویر کو وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی پھر ایک ہی جملہ جو وہ ہر بار دہرائی تھی۔

"مصطفیٰ دیکھیں تو یہ کس قدر پیارا ہے۔ ماشاء اللہ۔" اور وہ ہمیشہ مسکرا دیتا۔ رعنا کے عناد اور حسد کے باعث اب مصطفیٰ وہاں جانے سے کتراتا تھا۔ وہ نائلہ کے متعلق مزید باتیں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وجدان ڈیڑھ برس کا تھا جب نائلہ کے ہاں شفا نے جنم لیا اور اس کے چار برس بعد صلہ دنیا میں آئی، رفتہ رفتہ مصطفیٰ کا وہاں آنا جانا نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

رعنا حبیب نے وجدان مصطفیٰ کو باپ کے خلاف کر دیا تھا۔ وہ باپ اور دوسری عورت سے متنفر تھا، باپ کی آمد پر وہ ان کے سامنے ہی نہ آتا۔ اس کی ماں کے ہوتے ہوئے باپ نے دوسری شادی کر کے ماں پر ظلم ڈھایا، رعنا حبیب، مصطفیٰ اور نائلہ سے بدظن کرنے کے چکر میں یہ تک بھول گئی کہ اس سب کا وجدان کے معصوم ذہن پر کس قدر منفی اثر پڑے گا۔ نجانے کیسا سویا ہوا ضمیر تھا جسے صحیح، غلط کا پتا ہی نہ چلتا تھا۔

"ہمارے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر
آج میخانے میں خدا بنے بیٹھے ہیں"

☆☆☆

اس روز دادو، مصطفیٰ اور نائلہ کے ساتھ اپنے بھانجے کے ہاں گئی تھیں۔ سیف الرحمٰن نائلہ کی چھوٹی بہن کا اکلوتا بیٹا تھا جو سی ایس ایس (CSS) کی تیاری کے سلسلے میں دوسرے شہر میں ہونے کے باعث بہت کم خاندان والوں سے ملتا تھا۔ اس کا رشتہ شفا کے لیے آیا ہوا تھا۔ گھر میں وجدان، شفا اور صلہ ہی تھے، وجدان ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا میچ دیکھ رہا تھا جب صلہ فون پر نمبر ملاتے اس کے پاس صوفے پر بیٹھی، اس نے والیوم کم کر دیا۔ صلہ کی کال اٹھالی گئی۔

"کیسی ہیں آپ؟ میں ٹھیک ہوں اور گھر والے بھی۔" وجدان اٹھنے لگا تو بھائی کو بازو سے تھام کر بٹھا لیا۔ (وجدان نے ضبط سے گہری سانس لی)

"مما بابا، آنٹی کی طرف گئے ہوئے ہیں اور دادو بھی۔ نہیں تو بھائی گھر میں ہی ہیں۔" کسی سوال کے جواب میں کہتے ہوئے اسپیکر بھی آن کر دیا۔ وجدان نے افسوس سے اسے دیکھا جبکہ وہ متبسم نگاہوں سے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔

"میرا ایک کام کرو گی صلہ؟" نسوانی نرم جھجکتا لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

"آپ کہیں انشراح آپی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ وجدان دانستہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم اس روز جو بات کہہ رہی تھیں، اس کا ذکر گھر میں مت کرنا۔"

"کون سی بات نشی آپا؟" اس نے معصومیت سے انجان بن کر پوچھا۔

"میں جانتی ہوں جو تمہارے شیطانی دماغ میں ہر وقت کھچڑی پکتی رہتی ہے۔ اتنی معصوم نہیں ہو تم، خبردار اگر تم نے انکل آنٹی سے شادی کی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"کس کی شادی نشی آپا؟" صلہ نے معصومیت کے تمام ریکارڈز توڑ ڈالے۔ وجدان تمام گفتگو سنتے یوں انجان بنا بیٹھا تھا۔ گویا جانتے نہیں پہچانتے نہیں۔

"میری اور تمہارے بھائی کی شادی صلہ۔" وجدان نے بے ساختہ صلہ کی طرف دیکھا لیکن وہ مطمئن تھی۔

"اگر تم نے ایسا ویسا کچھ بھی کہا تو یاد رکھنا بہت برا ہوگا تمہارے ساتھ۔"

"ارے۔" صلہ نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔

"میں پاگل ہوں کیا جو ایسا کچھ سوچوں گی۔ کہاں آپ اور کہاں میرے ہینڈسم، ڈیشنگ بھائی۔" وجدان کو مدھم ہنسی سنائی دی تھی۔

"ویل سیڈ! صلہ تم اب اتنی بھی فضول نہیں ہو جتنا میں سمجھی تھی۔"

"ویل یہ تو آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے نشی! میں آپ کی سوچ سے بھی زیادہ فضول کام کر سکتی ہوں۔" اس کا اشارہ کس طرف تھا وجدان کو معلوم تھا۔

"دیکھو صلہ اب تم تنگ نہیں کر سکتیں۔" انشراح مصنوعی رنجیدہ ہوئی۔

"کیا ہوا جو میں چھوٹی ہوں، کالی اور موٹی بھی ہوں۔ تو کیا ہوا بھابھی تو تمہاری میں ہی بنوں گی۔" دونوں کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔ وجدان نے دانت پیستے سیل جھپٹ کر کال کاٹی۔

"کوئی تمیز ہے تم میں، یہ کیا فضول حرکت تھی۔ وہ لڑکی جانتی تک نہیں ہوگی کہ میں یہ باتیں سن رہا ہوں، بددیانتی کر رہی تھیں تم اس کے ساتھ، کب عقل آئے گی تمہیں۔"

"بس ایگزامز اسٹارٹ ہو رہے ہیں پھر آ جائے گی۔ اس نے معصوم سی صورت بنائی مگر وجدان کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

"بات کو مذاق میں مت ٹالو صلہ! ابھی سوری کرو اس سے۔"

"بالکل نہیں کروں گی، یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔" اس نے ضدی لہجے میں کہتے وجدان کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میں صرف آپ کو بتانا چاہتی تھی کہ میری بھابھی بنیں گی تو صرف انشراح آپی۔" وہ وجدان کو ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

لاعلمی کتنی بڑی نعمت ہے یہ بات رعنا مصطفیٰ کو دیر سے ہی سہی مگر سمجھ میں آ گئی تھی۔ نور بانو کی طبیعت

چاہتی تھی مگر رعنا نے اسے اجازت نہیں دی۔ اگر نائلہ نے یہاں قدم بھی رکھا تو وہ خود بھی مر جائے گی اور وجدان کو بھی مار دے گی۔ مصطفیٰ نے کس قدر دکھ اور بے یقینی سے اس پتھر دل عورت کو دیکھا تھا۔

پندرہ برس بعد بھی اس کے دل سے عناد نہیں نکلا تھا۔

''ایک یہ سنگ دل عورت ہے اور دوسری نائلہ ہے جس کا خمیر گویا موم کا بنا ہے۔'' اس روز رعنا نے نادانستگی میں نور بانو اور مصطفیٰ کی ٹیلی فونک گفتگو سنی تھی کیونکہ نور بانو کو سیل سے بات سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی۔ اسی لیے وہ لینڈ لائن پر کال کرتا تھا۔

''میرا بچہ اتنے دنوں سے ملنے نہیں آیا ماں ترس جاتی ہے۔''

''انسان ہوں اماں، رویے مجھے ہرٹ کرتے ہیں۔ پندرہ برس کم نہیں ہوتے مگر یہ عورت۔'' (رعنا حبیب کو لفظ عورت نے بے دم کر دیا، کس قدر سفاک تھا لفظ عورت) اتنے برسوں میں ذرا نہیں بدلی۔ خود تو پتھر تھی ہی میرے بیٹے کو بھی اپنے جیسا بنا دیا ہے، آپ بھی ماں ہیں، جانتی ہوں گی جب اپنی اولاد، جگر کا ٹکڑا آپ سے نفرت کے اظہار کے طور پر منہ پھیر لے تو دل پر کیا گزرتی ہے۔

رعنا انسان نہیں پتھر ہے۔ اماں اس نے اپنی انا میں میری زندگی کے قیمتی سال برباد کر دیے۔ میرے بچوں کو محرومیوں میں دھکیل دیا، شفا میری صابر بیٹی ہے۔ مگر صلہ نہیں سنبھلتی، اسے بھائی چاہیے اور میں کہاں سے لاؤں بھائی؟'' وہ روہانسے ہوئے رعنا نے سسکیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''اللہ وجدان کو زندگی دے۔ اس عورت نے اپنی انا کی تسکین کے لیے اس معصوم سے اس کی معصومیت ہی چھین لی ہے۔ میری بچیاں بھائی کے ہوتے ہوئے بھی بھائی کے لیے ترستی ہیں۔ آپ ہی بتائیں کیا کہوں ان سے کہ بیٹا آپ کا بھائی کسی کی انا اور حسد کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔'' وہ مزید بھی بول

مصطفیٰ انوار جیسے انمول انسان کو رعنا حبیب نے کھو دیا، اس احساس نے اسے پہروں رلایا تھا، اپنی زیادتیاں یاد آ رہی تھیں۔ وجدان کی باپ سے نفرت اور بے زاری یاد آئی۔ کیا پایا تھا رعنا مصطفیٰ نے یہ سب کر کے؟ سوائے پچھتاوے کے۔

''وہ مجھ سے جیت کے بھی رو پڑا۔
اس سے دیکھی نہ گئی شکست میری''

☆☆☆

''تم نے اس روز میری بات کا جواب نہیں دیا تھا وجدان؟''

کون سی بات؟ وجدان نے سوالیہ نگاہوں سے فاخر کو دیکھا۔

''یہی کہ تم بینش میں انٹرسٹڈ ہو؟''

''ارے!'' وہ حیران ہوا۔ ''بتایا تو تھا تمہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''تو پھر تم پروپوزل نہیں بھجوا رہے؟'' فاخر ایک دم کھلکھلایا تھا۔ وجدان نے سر کو نفی میں جنبش دی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یار، وہ صرف دوست ہے، ایسا کرو تم بھجوا دو۔'' لگے ہاتھ مشورے سے نوازا تو فاخر ہنس پڑا۔

''وہ تو میں بھجواؤں گا ہی۔'' وجدان نے اسے گھورا۔

''پہلے سوئے ہوئے تھے؟''

''سویا نہیں تھا غلط فہمی کا شکار تھا کہ تم انٹرسٹڈ ہو بینش میں اسی لیے۔''

''سبحان اللہ! ایک تم اور دوسرے تمہارے اندازے، ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے وہ چڑیل ہے نا صلہ اس نے اپنی بھابھی پسند کر لی ہے۔'' وجدان کے زچ کر دینے والے انداز پر فاخر پھر سے ہنسا۔

''کون ہے؟ کیسی ہے جسے صلہ نے بطور بھابھی پسند کیا ہے؟''

''شفا کی دوست۔ ہے۔ نام انشراح ہے اور کیسی ہے؟ یہ نہیں بتا سکتا کیونکہ میں نے اسے نہیں دیکھا۔'' اس نے لاپروائی سے بتایا۔

''واٹ۔'' فاخر اچھلا۔

''تم نے دیکھے بنا ہاں کہہ دی؟''

''صلہ کو پسند ہے تو اچھی ہی ہو گی۔'' وجدان مطمئن، جبکہ فاخر حیران تھا۔

''یار وہ تو بچی ہے، تم مل تو لو ایک بار۔''

''وہ بچی ہے مگر روح اس میں سو سالہ بوڑھی ہے۔'' اس بار وہ مسکرایا۔

''کوئی بھی اس طرح نہیں کرتا جیسے صلہ مصطفیٰ ناک تاک کر وار کرتی ہے ویسے بھی سب گھر والوں کو پسند ہے وہ۔'' اور فاخر ریلیکس ہوا۔

فاخر کے گھر سے واپسی کے بعد وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے کمرے میں ایزی چیئر پر جھولتا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، نائلہ اور شفا کی بے لوث محبت نے اسے اسیر کر لیا تھا۔ اس کی ذات پر چڑھا خول تو پہلے ہی تڑخ رہا تھا مگر تابوت میں آخری کیل پر نائلہ اور نور کی باتوں نے ٹھوکی تھی۔

''یہ تمہارا ہی ظرف ہے نائلہ بیٹے کہ پہلے تم نے اتنے برس تک رعنا کی زیادتیاں برداشت کیں اور اب وجدان کی باتیں سہہ رہی ہو بنا کسی گلے شکوے کے۔ آج کے زمانے میں تو سگی اولاد کی باتیں بھی برداشت نہیں ہوتیں۔''

''اماں!'' نائلہ کے بے یقینی سے پکارنے پر وجدان نے بند دروازے کو دیکھا۔

''وجدان میری ہی اولاد ہے، ماں تو صرف ماں ہوتی ہے، سگی سوتیلی سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے وجدان کو سچائی بتا دوں۔'' دادو کے خفگی بھرے لہجے پر وہ چونکا (کیسی سچائی؟) ''بتاؤں اسے کہ جو کچھ تمہاری ماں نے تمہیں بتایا، جھوٹ ہے۔''

''دوسری عورت تم نہیں اس کی ماں ہے۔''

وجدان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

''غاصب تم نہیں وجدان مصطفیٰ کی ماں ہے۔''

ان کا لہجہ تلخ تھا۔

''اماں پلیز!'' نائلہ نے ان کے ہاتھ تھامے۔

''آپ اسے کچھ نہیں بتائیں گی۔ ہم تو اس کی نفرت کے عادی ہو چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتی وہ یہ سب جان کر ماں سے بدظن ہو۔'' وجدان سفید پڑتے چہرے کے ساتھ تیزی سے پلٹ گیا اور اب سود و زیاں کا حساب کر رہا تھا۔ اسے نائلہ کے ساتھ روا رکھے اپنے تمام رویے یاد آ رہے تھے۔ اس رات اس نے صاف لفظوں میں سیف الرحمن کے پروپوزل کے لیے انکار کر دیا۔

''شفا کی شادی آپ کے بھانجے سے نہیں ہو گی، اپنی بہن کی زندگی کا فیصلہ میں کروں گا۔'' (وہ نائلہ کے ضبط کی انتہا دیکھنا چاہتا تھا) مصطفیٰ انوار کو اس وقت وجدان میں رعنا حبیب کی جھلک نظر آئی تھی۔ جبکہ نائلہ باوجود اس کے کہ انہیں بھانجے کا پروپوزل دل و جان سے قبول تھا، انہوں نے وجدان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ مصطفیٰ نے ٹوکا بھی مگر زندگی میں پہلی بار انہوں نے محبوب شوہر کو ان سنا کر دیا کیونکہ اس بار مدمقابل جوان بیٹا تھا اور یہ ایک دل موہ لینے والا احساس تھا۔ جبکہ وجدان مصطفیٰ کا دل نائلہ کے قدموں میں گر کر دھاڑیں مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ کاش اس نے نائلہ مصطفیٰ کے بطن سے جنم لیا ہوتا۔

وجدان ایگزامز سے فارغ ہو چکا تھا۔ اب زیادہ تر وقت گھر میں ہی گزارتا تھا۔ وہ دل سے نائلہ اور شفا کو قبول کر چکا تھا البتہ زبان اب بھی خاموش تھی۔ صلہ سے اس کا رشتہ بہت انوکھا تھا۔ نہ تو وہ اسے سامنے دیکھ سکتا تھا کہ اس کی حرکتیں غصہ دلاتی تھیں اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوتی تو نگاہیں اور دل بے قرار رہتا اسے دیکھنے کو۔ اس وقت شفا نے اس کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ذرا سا اندر جھانکا، وجدان ایزی چیئر پر آرام دہ انداز میں نیم دراز تھا، آنکھیں بند تھیں۔ وہ ادھ کھلے دروازے سے اندر آ گئی۔

''اف صلہ!'' وجدان قدموں کی چاپ محسوس کرتے کراہا۔ وہ ذہنی طور پر کسی بھی شرارت کے لیے تیار

تھا۔ صلہ پچھ بھی کرتی کی چند لمحوں بعد اس نے پیشانی پر نرم سا لمس شدت سے محسوس کیا۔ اس کا دل دھڑکا پہچان چکا تھا۔ وہ لمس شفا کا ہے جس میں نائلہ جیسی نرمی تھی، اس کا دل چاہا آنکھیں کھول کر اسے سینے سے لگا کر ڈھیر سارا پیار کرے مگر انجان بنے رہنا مجبوری تھی کہ شفا سب سے بہت خوف زدہ رہتی تھی، جبکہ وجدان خود اس وقت صلہ کی موجودگی توقع کر رہا تھا اپنے سامنے کیونکہ اس نے بینش کے ساتھ وجدان کو مال میں دیکھا تھا اور اتنی دور سے بھی وجدان نے صلہ کے چہرے کے پھیکے پڑتے رنگوں کو شدت سے محسوس کیا تھا۔

اس کا خیال تھا صلہ گھر پہنچتے ہی اس کی کلاس لے گی۔ وہ لاشعوری طور پر اس کی آمد کا منتظر تھا۔ مگر خلاف توقع شفا کی آمد نے اسے مزید پچھتاوے میں دھکیل دیا۔ نم سرخ آنکھوں سے شفا کے پلٹتے وجود کو دیکھتے وہ الجھا بکھرا ہوا تھا۔ کیا وہ اس قدر سچی محبت کا حقدار ہے؟

''ایک عجیب سی جنگ ہے مجھ میں
کوئی مجھ سے ہی تنگ ہے مجھ میں''

☆☆☆

رعنا حبیب کو آگہی کے عذاب نے ریت کی دیوار کی مانند بھربھرا کر دیا تھا جو کسی بھی پل ڈھے جاتی، پچھتاوؤں کے دیمک نے اسے کھوکھلا کر دیا۔ اس نے مصطفیٰ سے معافی مانگی اور نائلہ کو بھی یہاں آنے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر وقت ریت کی مانند ہاتھ سے پھسل چکا تھا اور وہ چند دنوں بعد خالق حقیقی سے جا ملی تھی، نائلہ اور مصطفیٰ نے اسے کھلے دل سے معاف کر دیا تھا۔ اس تمام قصے میں اگر نقصان ہوا تھا تو وہ وجدان مصطفیٰ کا تھا، جو حقیقت سے لاعلم تھا اور اس بار رعنا کی جگہ وجدان تھا۔

''نائلہ کی واپسی کی راہ میں رکاوٹ وجدان تھا۔ رعنا کی وفات کے وقت وجدان سولہ برس کا تھا اور دو برس قبل انوار بھی شہر خاموشاں کے مکین بن گئے تھے۔ اور بھی نور بانو نے وجدان پر مصطفیٰ کی واپسی کے لیے دباؤ ڈالتے ہوئے جذباتی طور پر بلیک میل کیا اور آج آخر وجدان مصطفیٰ نے ماں باپ کے ساتھ بہنوں کو بھی قبول کر لیا تھا۔

''وجدان منتظر ہی رہا کہ صلہ اس سے بینش کے متعلق پوچھے گی مگر حیرت انگیز طور پر اس نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ کل اس کا پیپر بھی تھا اور وجدان مطمئن تھا۔ کم از کم وہ اسے ایگزامز کے دنوں میں نہیں چھیڑے گی مگر صلہ اس کی سوچ سے پرے کی چیز تھی، اس وقت وہ بیڈ پر نیم دراز بینش سے بات کر رہا تھا اگلے ہفتے فاخر اور بینش کی کمنگنی ہونا تھی۔ تبھی صلہ نے ہلکے سے ناک کرتے اندر جھانکا۔ تو وجدان کو یاد آیا وہ صلہ سے انشراح کی کال کے بعد سے خفا ہے۔ اس کے کہنے کے باوجود صلہ نے بات واضح نہیں کی تھی۔

''بینش بعد میں بات کرتے ہیں۔'' اس نے کال کاٹتے ہوئے ــــــ صلہ کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں کیوں آئی ہو؟ درج تھا۔

''مجھے آپ سے بہت اہم بات کہنی ہے۔'' وہ اس کے بیڈ پر آبیٹھی۔

''مگر مجھے تمہاری کوئی فضول بات نہیں سننی جاؤ یہاں سے۔'' خفگی سے کہتے اٹھ بیٹھا۔

''پچھلے دنوں آپ کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھا تھا مال میں، وہ کون تھی؟'' وجدان نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے اور اس سے قبل کہ میں تمہیں تھپڑ دے ماروں چلی جاؤ یہاں سے۔''

''جب میں کہہ چکی ہوں میری بھابھی صرف انشراح آپی بنیں گی تو آپ دوسری لڑکیوں کے ساتھ کیوں شاپنگ کرتے ہیں؟'' اس کے جارحانہ انداز پر وجدان نے گھورا تو صلہ نے گہری سانس لی۔ ''خیر کرتے رہیں شاپنگ، شادی تو آپ کی آپا سے ہی ہوگی۔'' خود کو مضبوط ظاہر کرنے کے باوجود وہ ڈسٹرب تھی۔ اس کا اندازہ وجدان کو تھا وہ دل میں محظوظ ہوا۔ (اچھا تو جو لوگ ہمیشہ دوسروں کو ستاتے ہیں جب خود ستائے جاتے ہیں تو صلہ مصطفیٰ جیسے لگتے ہیں)

''ایسا ممکن نہیں ہے صلہ۔'' بامشکل مسکراہٹ چھپاتے چہرہ سپاٹ بنا لیا۔

''اس میں ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں راضی ہوں، بابا مما اور امید ہے انکل آنٹی بھی انکار نہیں کریں گے۔'' لاپرواہی سے کہتے وہ ایسے گویا وجدان اس کے حکم کا غلام ہے۔

''چلو ٹھیک ہے تم کرلو مگر مجھ سے کوئی امید مت رکھنا۔''

''صبح میرا بائیو (Bio) کا پیپر ہے۔ آپ مجھے سینٹر ڈراپ کریں گے پیاڑھے سات پونے آٹھ تک ریڈی ہو جائیے گا۔'' (اگلا حکم)

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں نہیں جاؤں گا۔'' وجدان نے اسے گھورا۔

''فارسی تو نہیں بولی سیدھی صاف اردو میں کہا ہے صبح آپ مجھے سینٹر ڈراپ کریں گے۔ اور جب ڈراپ کریں گے تب آپ کو معلوم ہو جائے گا صلہ مصطفیٰ کو کبھی ٹیڑھی انگلی سے بھی نکالنا آتا ہے۔'' وہ اسے کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

انکار تو کر دیا تھا مگر وہ پوری رات سوتی جاگتی کیفیت میں رہا۔ ادھر آنکھ لگتی۔ ادھر لگتا پیپر کا وقت نکل چکا ہے تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ یہ رات خاصی طویل تھی۔ آخر فجر کی اذان ہوئی تو پرسکون سانس خارج کرتے باجماعت نماز کے بعد قریبی پارک چلا گیا۔ وہاں سے سوا سات بجے واپسی ہوئی تو سب سے پہلا سامنا مصطفیٰ سے ہوا۔

''السلام علیکم بابا!''

''وعلیکم السلام کیسا ہے میرا جوان؟ انہوں نے نرمی سے پوچھا لیکن اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا نائلہ نے جوس کا گلاس اسے تھمایا۔

''ناشتے میں کیا لوگے بیٹا؟''

''کچھ نہیں مما بس لیٹوں گا رات میں نیند نہیں آئی۔''

''خیریت کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' نائلہ نے تشویش سے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔ (ہاں اب وہ بات بے بات مسکرانے لگا تھا)

''جی طبیعت ٹھیک ہے، بس یونہی نیند نہیں آئی۔'' دادو کو سلام کر کے کمرے میں آیا تو سات بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔

''کمال ہے لڑکی کا پیپر ہے۔ اور لگتا ہے وہ ابھی تک سو رہی ہے۔'' لاشعوری طور پر دروازہ کھلا چھوڑتے جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹ گیا تبھی زندگی سے بھرپور صلہ کا پرجوش سلام سنائی دیا۔

''مما جلدی سے ناشتہ لگا دیں میں بھائی کو جگا آؤں۔''

''بھائی کو کیوں؟'' نائلہ حیران ہوئیں۔

''وہ مجھے ڈراپ کریں گے نا اسی لیے۔'' اس کا اطمینان قابل دید تھا۔ مصطفیٰ مسکرا دیے (اور مسکرایا تو وہ بھی تھا)

''رہنے دو، بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارے بابا ڈراپ کر دیں گے۔''

''میں اچھی طرح جانتی ہوں ان کی خراب طبیعت کو۔'' اس نے دانت پیسے۔

''چلیں ان کی طبیعت کا ہی پوچھ لوں۔'' قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہوئے وجدان نے تکیہ منہ پر رکھ لیا جسے صلہ نے جارحانہ انداز میں کھینچا۔

''طبیعت کیسی ہے آپ کی؟''

''مجھے کیا ہوا ہے؟''

''یہ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ اب اٹھ جائیں، میں لیٹ ہو جاؤں گی۔''

''میں نہیں جا رہا، بابا کے ساتھ چلی جاؤ۔'' اس نے کسلمندی دکھائی۔

''کیا مطلب ہوا اس بات کا، میں کہہ کر گئی تھی رات کو کہ آپ کے ساتھ جاؤں گی، بھول گئے؟''

''فارسی نہیں بولی صاف اردو میں کہا ہے میں نہیں جا رہا۔ اب جاؤ اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر کے جانا۔''

''تو ٹھیک ہے، میں بھی نہیں جاؤں گی۔'' وہ دھمکاتے ہوئے باہر نکل گئی۔ مصطفیٰ اسے اکیلا آتے

دیکھ کر مسکرائے۔ صلہ نے غصے میں ایک ہی سانس میں دودھ کا گلاس ختم کر دیا۔

''صلہ اٹھو بیٹا دیر ہو رہی ہے۔'' مصطفیٰ گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھے مگر وہ بیٹھی رہی۔

''بھائی کے ساتھ ہی جاؤں گی ورنہ پیپر کینسل۔ سن لیں سب لوگ اگر میرا پیپر مس ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری وجدان مصطفیٰ پر ہو گی۔'' وہ اس کے کمرے کی طرف منہ کر کے چلائی تھی۔ وجدان کو اٹھنا پڑا۔ وقت کم تھا اور کیا بعید کہ وہ ضدی لڑکی واقعی پیپر مس کر دیتی۔ جلدی سے منہ دھویا، چابی اٹھائی۔ ہاتھوں سے بال سنوارتے کمرے سے نکلا۔

''صلہ ضد نہیں کرتے۔'' وجدان کو آتے دیکھ کر نائلہ کے بقیہ الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

''آؤ میری ماں۔'' وجدان اسے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے باہر نکلا تو وہ یاہو کا نعرہ بلند کرتے پیچھے لپکی۔

☆☆☆

''شفا پلیز بچاؤ۔'' شفا کے کمرے سے صلہ کی دہائیاں سنائی دے رہی تھیں جبکہ شفا ہنس رہی تھی۔ وجدان جو ابھی بیکری کا سامان لے کر آیا تھا ان دہائیوں کے جواب میں نائلہ کا متبسم چہرہ دیکھتے حیران ہوا (اس روز خالہ شفا اور سیف کی باقاعدہ منگنی کی رسم کے لیے آرہی تھیں بمع فیملی)

''اندر کیا ہو رہا ہے مما؟''

''صلہ کو مار پڑ رہی ہے۔'' انہوں نے نرمی سے وجدان کا گال چھوا۔

''مگر کیوں اور کس سے؟''

''انشراح سے۔ (وجدان چونکا) صلہ نے اس سے جھوٹ بولا کہ اسے چوٹ لگی ہے۔ وہ بے چاری بھاگم بھاگ جس حلیے میں تھی ویسے ہی آگئی اور یہاں آکر معلوم ہوا کہ شفا کی منگنی ہو رہی ہے تو بس اسی لیے ذرا صلہ کی دھلائی ہو رہی ہے۔'' نائلہ ہنسیں تو وہ بھی مسکراتے ہوئے شفا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دستک دیتے اندر داخل ہوا اور عین اسی لمحے چپل گولی کی سی تیزی سے اس کی طرف آئی۔ اگرچہ وجدان اس میزائل سے لاعلم ہوتا تو سیدھی منہ پر لگتی مگر اس نے مہارت سے جوتا کیچ کر لیا۔ انشراح اور شفا نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔ جینز کے ساتھ بلیک ٹی شرٹ میں ملبوس وہ دراز قد وجیہہ نوجوان کسی ناگہانی آفت کی طرح انشراح کے سامنے آیا تھا۔

جبکہ جوتا پھینکتے وجدان نے بھی اورنج اور ریڈ کنٹراسٹ لان کے سلوٹ زدہ سوٹ میں ملبوس گندمی رنگت، دلکش نقوش والی نازک سی لڑکی کو نظر بھر کر دیکھا تھا۔ جس کے لمبے بال الجھے بکھرے تھے۔ اسے صلہ کی پسند دل و جان سے پسند آئی تھی۔

''بھائی پلیز بچائیں۔'' صلہ اس کے پیچھے چھپی تو وہ دونوں چونکے۔

''سوری مجھے یوں اچانک نہیں آنا چاہیے تھا۔ ناک تو کیا تھا شاید آپ لوگوں نے سنا نہیں۔'' وہ یقیناً اس قدر نرمی سے انشراح سے مخاطب تھا جو قدرے شرمندہ نظر آرہی تھی۔

''صلہ تم میرے ساتھ چلو۔'' وجدان اس کا ہاتھ تھامے باہر آیا۔

''شفا یہ تمہارے بھائی ہیں؟'' انشراح کے اشتیاق سے بھرپور تجسس لیے پر وجدان کے لبوں پر دلکش تبسم پھیلا اور صلہ کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے تمہیں ایک بار اپنی بھابھی کے انتخاب پر نظر ثانی کر لینی چاہیے۔ وہ تو آتی خون خوار ہے۔ جب باضابطہ طور پر یہاں آئے گی تو پھر شاید تمہیں کچا ہی چبا جائے۔'' وجدان نے مصنوعی ہمدردی سے مشورہ دیا تو صلہ نے رک کر اسے گھورا۔

''بے فکر رہیں وہ آپ سے تو کم ہی خون خوار ہیں۔ آپ کو بھی تو برداشت کر رہی ہوں۔ کسی کو بھی کر لوں گی۔'' اس کے جلے کٹے انداز پر وجدان بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تو صلہ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئی۔

مکمل ناول

اس گھر میں اتری معمول کی دوپہر پہ آج ایک آسیبی خاموشی طاری تھی۔ سورج کچھ یوں چھپا رہا تھا کہ اب صدیوں تلک اندھیرا نہیں ہوگا۔ اسی گھر کے ایک خنک کمرے میں دس سال کی بچی گہری نیند سو رہی تھی کہ برآمدے سے آتی قدموں کی آواز سے اس کی نیند ٹوٹی۔ اسے یاد آیا کہ کچھ وقت پہلے ماں کمرے میں آئی تھی اس نے نرم ہاتھوں سے جھنجوڑ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"تمہاری نانو تکلیف میں ہیں۔ وہ مجھے یاد کر رہی ہیں۔ مجھے جانا ہوگا۔ میں تمہارے پاس کسی کو بھیجتی ہوں۔" اس نے نگاہ دوڑائی۔ کمرہ خالی تھا۔ لیکن باہر سے آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی عورت چلانے کی کوشش میں بار بار ناکام ہو رہی ہو۔ وہ خوف زدہ ہوئی۔

گھر کا دروازہ کھلا پا کر دوپہری بلا اندر آچکی ہے اس نے بیڈ تیزی سے چھوڑا......اور......بس ...... یہ آواز غراہٹ نما تھی...... "ماں نے جس کو میرے پاس بھیجا ہوگا وہ بلا اسے کھا جائے گی پھر وہ کمرے میں بھی آئے گی۔" دروازے کا ہینڈل گھوما۔ اس کے پاس بیڈ روم سے ملحق اسٹور میں جانے کا وقت نہیں۔ وہ بیڈ کے نیچے چھپ جاتی ہے اور وہ اپنی چپل بھی نیچے کھسکا لیتی ہے۔ کمرے میں آکر بھی عورت کی منت سماجت جاری ہے وہ بار بار خدا کے واسطے دے رہی ہے۔ بلا نے غرا کے اسے تھپڑ مارے تھے شاید اس کا گلا دبا دیا تھا۔ اب کمرے میں گھٹی گھٹی سسکیاں تھیں...... وہ بیڈ کے نیچے مردے سے بھی بدتر حالت میں تھی۔ کاش اس کی ماں نہ

فرزانہ کھرل

پھول مٹی

جاتی...... نانی ہی مرجاتی۔ کمرے میں اب وقت اس کی ماں سسک رہی ہوتی وہ بچی پسینے سے نچڑ کے پانی بن چکی تھی وہ اس سسکتی عورت کی آنکھ سے بہنے والا آنسو بن چکی تھی۔

☆☆☆

بقول مصباح علی کے اس کی زندگی میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا جو اس کے لیے پریشانی کا موجب ہو۔ وہ مزاجاً نڈر تھی' طبیعت کی تیکھی اور زبان کی تیز تھی' وہ روز مرہ درپیش چھوٹے موٹے ـــــ مسائل کو کپڑے پر پڑی گرد کی مانند ایک جھٹکا دے کر جھاڑ دیا کرتی تھی لیکن گزشتہ چند روز سے بظاہر مطمئن نظر آتی وہ لڑکی اپنے چین وسکون کے پنچھی ادھر ادھر اڑا چکی تھی اور اس معاملے کے ہر پہلو پر خوب سوچ بچار کے بعد آج اس نے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

آج کی تاریخ نے بھی اس کا ساتھ دینے کی جیسے ٹھان لی تھی۔ اس کا باپ بہروز علی اپنے بڑے بھائی کی عیادت کے لیے صبح سویرے ہی قصور روانہ ہوچکا تھا جس کی واپسی رات کو ہی متوقع تھی' سو آج صبح سے اس کے منصوبے سے منسلک امور خوش اسلوبی سے نمٹ رہے تھے' وہ ہر طرح سے مطمئن تھی پھر بھی ہاتھ میں پکڑی گہری بادامی چادر اوڑھنے سے قبل مزید تسلی کی خاطر ایک بار پھر طلحہ کو فون کرنا ضروری خیال کیا۔

"تمہیں اس شخص کے مالک ہونے کا پکا یقین ہے نا۔ مطلب سو فیصد؟" کال ریسیو ہوتے ہی مصباح نے رٹو طوطے کی طرح دن بھر کا ادا کردہ جملہ دہرایا تو کال ریسیو کرنے والے کا ضبط بھک سے اڑا۔

"تمہارے پاس صرف بیس منٹ ہیں۔ آجاؤ تو ٹھیک۔ ورنہ ٹی وی آن کرو تمہارا فیورٹ ڈراما چل رہا ہوگا۔" دھیمے مزاج کے حامل طلحہ کے سرد لہجے نے جیسے کانوں میں برف انڈیلی تھی۔

"اچھا...... اچھا آرہی ہوں۔" مصباح نے فون لمحوں میں بند کیا...... اس کا سیاہ چادر اوڑھ کے گھر سے نکلنا رکشہ یا وین میں سفر کی علامت تھا۔

"دیکھو تو شام ڈھلنے کو ہے اس وقت کہاں اور کیوں" ماں کے انہی دو سوالات سے چھٹکارا اسی صورت تھا کہ گلی محلے میں آنے جانے والی چادر ہی اوڑھی جائے۔ باہر آتے ہی اس نے اپنے پیچھے دروازہ بنا آہٹ کے بند کیا۔ اور باہر آتے ہی نگاہ گوشی آپا پہ گئی۔

"آہ۔" دل نے کس کج روی سے پانسا پلٹا تھا۔ گوشی آپا جاذب نظر اور انتہائی سلجھی ہوئی عورت تھیں جنہیں گزشتہ کئی سالوں سے ان کے مقدر نے بری طرح الجھا رکھا تھا۔ آج پانچویں روز بھی ان کی آنکھیں تواتر برس رہی تھیں۔ اور ان کے سامنے میز پر رکھی چائے آج بھی ٹھنڈی ہوچکی تھی۔

"اللہ کے رزق سے منہ نہیں موڑتے گوشی۔" اماں کے تسلی دلاسے اس وقت بھی جاری تھے۔ مصباح کے دل پر چیونٹیاں سی رینگیں۔ یہ گوشی نامی عورت اماں کو کس قدر عزیز تھی؟ اور کیا یہ لازم تھا کہ اس عورت کی اکلوتی بیٹی مجھے بھی اسی قدر عزیز ہوتی۔"

بے قراری ہر رگ میں دوڑی تھی۔ اس نے دوسری نگاہ اپنی ماں کی نم آنکھوں پر ڈالی۔ وہ محسوس کرسکتی تھی کہ گوشی آج کل کس طرح کے دکھوں میں مبتلا تھی۔

ایک گھر سے بھاگ جانے والی بیٹی کی جدائی۔ دوسرا لوگوں کی باتوں کا زہر پینا۔ سب سے بھاری دکھ اسے شوہر دے رہا تھا۔ جو اس کی بیٹی جگنو کا سوتیلا۔ باپ تھا اور جگنو کی گمشدگی نے جس کا حال باؤلے کتے جیسا کر رکھا تھا۔ مصباح کی سوچ میں نفرت گھلی، وہ خود کو سنبھالتی ماں کے سامنے آئی۔

"میں ذرا فارہ کے گھر تک جارہی ہوں۔"

اس نے نگاہ گوشی پر ٹکاتے ہوئے ماں سے اجازت طلب کی' گوشی نے سامنے کھڑی پچیس چھبیس سالہ اس لڑکی کو لحظہ بھر دیکھا' جس کی شخصیت میں دمکتا وقار اور اعتماد اسے کئی حسین چہروں میں بھی نمایاں رکھتا تھا۔

"میں سب جانتی ہوں۔ وہ جو تم بتا نہیں سکتیں۔ اور وہ جو جگنو کا وجود بتا دیتا تھا۔" مصباح نے گوشی کی کھلی آنکھوں میں انکشاف کا پہلا پتھر پھینکا۔ نظر چرانے میں ہی عافیت تھی۔ گوشی کی نگاہ بھی جھکی۔ ان کی لرزتی پلکوں کو دیکھ کر مصباح کو کسی شاعرہ کے الفاظ یاد آئے۔

یہ خاموشی تم کو بچالے گی سب سے۔
یہ چہرہ تمہارا چھپالے گی سب سے۔
یہ آوازیں جو بولتی ہی نہیں ہیں۔

کئی راز تو کھولتی ہی نہیں ہیں۔

گوشی نے چائے کا کپ لبوں سے لگالیا۔ جو ان کی اپنی زندگی کی مانند ٹھنڈا ٹھار تھا۔ وہ ماں کی اجازت لے کر آگے بڑھ گئی۔ زندگی کی سیدھی سادی ڈگر پر چلتے ہوئے وہ کسی دوراہے پر ٹھہر کے اس الجھاؤ کا شکار کبھی نہیں ہوئی تھی کہ اب کیا کیا جائے۔

اگلے چند منٹوں میں وہ اپنے گھر سے چند فرلانگ آگے اب طلحہ کے گھر کے سامنے تھی جس کے اندر ہمہ وقت ایک بھونچال کی سی حالت رہتی تھی۔

طلحہ اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ وہ مصباح علی کا اچھا دوست' اس کا ہم خیال' اس کا ہم نوا تھا۔ جو ہوچکا سو ہوچکا اور جو ہے جیسا ہے کی بنا پر زندگی گزارنے والوں میں سے وہ بھی نہیں تھا مصباح نے وہاں ٹھہر کے فارہ کو میسج کیا۔ جو مصباح اور طلحہ کی دوستی میں تکون کی حیثیت رکھتی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں اب صرف بلا کی سانسوں کی آواز سے زندگی کا احساس ہورہا تھا۔ ورنہ ہر چیز جیسے مرچکی تھی۔ دوپہری بلا اس عورت کو مار چکی ہے جسے اس کی ماں نے بھیجا تھا۔ اسی سوچ کے ساتھ بچی کا پسینے میں بھیگا وجود یکلخت ٹھنڈا ہوا۔ خاموشی' خوف' گرمی اور حبس اس کی سانس پر ایک ایک چیز بھاری تھی وہ جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

"رات کو میاں صاحب آئیں گے۔" ساکن دوپہر میں ایک آواز گونجتی ہے۔ یہ آواز...... وہ جیسے ہوش میں آئی۔ "دروازہ پہلی دستک پر کھول دینا۔" یہ آواز...... بچی نے اپنا بھیگا' ٹھنڈا ہاتھ اپنے منہ پر رکھا کہ چیخیں بے قابو ہوتی جارہی تھیں۔ کاش وہ بے ہوش ہوجاتی۔ اسی خواہش کے ساتھ اس کا ٹھنڈا وجود شعلے کی طرح بھڑکا۔ اور یکلخت بجھ گیا۔ اس ساکن دوپہر میں وہ بچی خوف سے مرگئی تھی یا اس کے اندر خوف مرچکا تھا بس ایک مرگ ہوچکی تھی۔ ان دیکھی دوپہری بلا مرگئی تھی اور حقیقت کا چہرہ بہت بھیانک تھا۔

☆☆☆

مصباح جب چوک تک پہنچی تو سرمئی چادر میں لپٹی فارہ اس کی منتظر تھی۔ دونوں ایک ساتھ آگے بڑھنے لگیں۔ قدم ملا کے چلنے کا یہ سلسلہ تھوڑی دیر کا ہی تھا۔

"تم پر ایک شمسی توانائی سے چلنے والی مشین کا گمان ہورہا ہے۔" مصباح تنتاتی ہوئی پلٹی۔

"ڈوبتے سورج کے ساتھ تمہاری چارجنگ ختم ہوچکی ہے فارہ بی بی۔" بالآخر اسے ٹوکنا ہی پڑا تھا کہ فارہ بے جان قدموں کے ساتھ اس کے لیے وقت کا زیاں ثابت ہورہی تھی۔ فارہ لمبے ڈگ بھرتی اس کے ساتھ ہولی اور ملگجی شام کو آہ بھر کے دیکھا پھر مصباح سے مخاطب ہوئی۔

"آج زندگی میں پہلی بار ہم نے گھر میں غلط بیانی کی ہے۔ وہ بھی گھر سے بھاگ جانے والی جگنو کے لیے' جس کی ماں کی شہرت ہمارے محلے میں ہمیشہ مشکوک رہی ہے۔ اگر سب کچھ غلط سلط ہوگیا تو۔" اس کی باتوں میں بھاری گلے کے ساتھ سہم کی ہلکی آمیزش تھی۔ وہ دونوں اب ایک لمبی کشادہ گلی طے کرنے کے بعد اپنے علاقے کی معروف ترین مرکزی سڑک پر تھیں۔

"دنیا کے بہت سے کاموں کے انجام ہونے میں ہمارا ہاتھ بالکل بھی نہیں ہوتا مائی ڈیر، جیسے پہلی بار پیدا ہونا، اور جیسے پہلی بار مر جانا۔ ہاہاہا" مصباح نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھتے خوامخواہ قہقہہ لگایا۔

"ان دو کاموں کے بعد تیسرا فعل محبت ہے جس کا ہو جانا بھی بے بسی کی ایک واضح شکل ہے۔ اس وقت ہم دونوں اسی بے بسی کا شکار ہیں۔ میں جگنو کے لیے۔ تم میرے لیے گھر سے نکل آئی ہو۔ تم جانتی ہو کچھ دیر تک واپس آجاؤ گی اور میں نہیں جانتی کہ اپنے اس انتہائی فیصلے کو مجھے کہاں تک بھگتنا ہوگا۔" لمحہ بھر کو اس کی آواز میں صحرا اتر آیا تھا۔

"اور مجھے انجام کی پرواہ نہیں۔" اگلے پل وہ کندھے اچکا کے بے نیازی سے گویا ہوئی کہ فارہ کا دل اسے پیٹنے کو چاہا۔ اس کے قدموں کی بے درد آواز سے مصباح اس کے غصے کا اندازہ لگا سکتی تھی۔

فارہ نے ترچھی نگاہ سے اسے دیکھا جس کے قدموں کی خاموش روانی سے ہر قسم کا خوف مفقود تھا وہ اس الٹی کھوپڑی کی لڑکی کو جواب دے کر مزید کچھ بھی الٹا سیدھا سننے کے موڈ میں نہیں تھی لیکن دل ہی دل میں ہمیشہ کی طرح وہ اس کی باتوں کی قائل ہو چکی تھی۔

اب ان کا رخ اس درمیانے چوک کی طرف تھا جہاں سے وہ پبلک ٹرانسپورٹ پکڑتی تھیں۔ مگر اس چوک کے آہنی گیٹ پر اڑنے والے محلے داروں کے کبوتروں تک کو شرفا کی لسٹ سے خارج کر کے اپنی اٹاریوں سے اڑا دیا جاتا تھا۔

اس گیٹ کے پار بادشاہی مسجد کے نواحی علاقے کی یادیں تازہ کرتی چوبارے ٹائپ کی عالی شان کوٹھیاں تھیں اور جدید دور کے پیش نظر یہاں زیر زمین ہائی فائی پناہ گاہیں بھی تھیں۔ اس قسم کی معلومات انہیں طلحہ کے علاوہ کون دے سکتا تھا۔ جس کی سگریٹ پان کی دکان اس مغرور گیٹ کے نکڑ پر خوب چلتی تھی۔ اس نے اس وقت بھی اپنی دکان کے سامنے کھڑی ان دونوں لڑکیوں پر ــــ اچٹتی سی نگاہ ڈالی جیسے وہ وہاں کسی گاڑی کی منتظر ہوں۔

وہاں کھڑی فارہ کو وہ بھی کبوتری یاد آئی جسے طلحہ نے چوبارے کی منڈیر سے پکڑ کے اس کے دادا کے حضور پیش کیا تھا اور پھر...... اس نے بے ساختہ اپنے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کے ساتھ کھڑی مصباح علی جس کے دل کا بارونق حصہ گھر سے فرار ہونے والی جگنو جیسے ساتھ ہی لے جا چکی تھی۔ مصباح نہیں جانتی تھی کہ وہ اس تلاش میں بڑے کے اپنے گرد کئی مسائل کا جال بن رہی ہے۔ اس کی مضطرب نگاہیں سڑک کی دوسری طرف کا جائزہ لے رہی تھیں جہاں متعدد پیٹرول پمپ، کیفے، اوسط درجے کے ہوٹل اور بیکری کی بے شمار دکانیں تھیں اس علاقے میں اترنے والی خاموش سی یہ شام ایک بڑے شور کی آہٹیں محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک ایئر کنڈیشنڈ مزدا تھا جو مختلف جگہوں پر آرڈر پر پھول پہنچاتا تھا۔ گزشتہ کئی سالوں سے اسے چلانے والا ڈرائیور چند روز سے غائب تھا اور اس مزدا کا وقتی ڈرائیور گزشتہ دنوں سے ایک ایسی الجھن کا شکار تھا جو کسی طور حل ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

ڈرائیونگ کیبن میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا شخص اس کا خاص ملازم تھا وہ اپنے صاحب کے مزاج کی سنجیدگی بھانپتے ہوئے بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

"تمہارے خیال میں اب قاضی کے قصے پر مٹی ڈال دینی چاہیے۔" پندرہ منٹ کی خاموش ڈرائیونگ کے بعد وہ ذرا سا رخ بدلتا اپنے ملازم رب نواز سے مخاطب ہوا۔

"تمہارے علم میں یہ بات ہوگی کہ اس علاقے میں قاضی کی شہرت کیسی تھی؟" اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے شام کی گہماگہمی پر اک بیزارکن نگاہ ڈالی۔

"یہ اندازہ تو۔ ہو چکا ہے کہ اس لڑکی کا تعلق اس کالونی سے نہیں تھا ورنہ یہ لوگ اب تک قاضی سمیت لڑکی کو پاتال تک سے نکال چکے ہوتے اور میں یہ گارنٹی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قاضی کا اس علاقے میں کسی سے دوستانہ وغیرہ نہیں تھا۔"

"ہنہ" سالم نے ہنکارا ابھرا۔ "بہر حال میں یہ معاملہ یہیں نپٹانا چاہتا تھا تاکہ کوئی قاضی کو ڈھونڈتا مجھ تک یا میرے فارم ہاؤس تک آتا۔ اب تمہاری یا میری تسلی تو ہو چکی۔" صاحب کا موڈ کچھ اچھا ہوا تو رب نواز کی اتری صورت پر بھی بہتری کے آثار نظر آئے۔ "بلکہ اب تو مجھے یقین ہو چکا ہے کہ وہ بے وقوف انسان لڑکی کے ورثاء سے نہیں بلکہ مجھ سے ہی چھپ کے کسی بل میں جا گھسا ہے لیکن تم اس سے رابطے کی کوشش کرتے رہنا۔ مجھے شک ہے کہ دو چار روز اور دھکے کھانے کے بعد وہ فارم ہاؤس کا رخ کرے گا اور اس بات کے لیے اسے سختی سے منع کر دینا۔"

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے سامنے پرسوچ سی نگاہ ڈالی۔ اس کے ملازم کا خاصا وزنی سر پرزور انداز میں اوپر نیچے ہوا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ایک بار پھر خاموش تھے۔ پھولوں سے لدا پھندا...... وہ مزدا...... سگنل پر رک چکا تھا جو ٹریفک میں سب سے آگے تھا۔

☆☆☆

اس نیم تاریک کمرے میں جس ہیولے نے دروازہ پار کیا وہ ایک عورت کا ہیولہ تھا۔ بچی کے وجود میں کپکپاہٹ ساکت ہوئی۔ "تم اس زندگی کے ہر خوب صورت خوشنما لباس پر اک بدصورت دھبہ ہو۔" وقت نے اس ہیولے کی بوجھل ایڑیوں پر تحریر کیا۔ بچی نے ان رنگتی ایڑیوں کو چھو کے ان پر قربان ہونا چاہا تھا۔ ان ایڑیوں کا جھلسا سفر اپنی نرم پوروں میں سمیٹ لینا چاہا تھا۔ پھر وہ دروازہ بے آواز بند ہوا۔ بچی کی آنکھ کے تمام آنسو خشک ہوئے۔ وہ چونکی...... وہ واش روم میں تڑاتڑ گرتے پانی سے چونکی تھی۔

"تم اس زندگی کے ہر خوبصورت اور خوشنما لباس کے قابل ہو۔" وقت نے گرتے پانی کی ہر بوند پر تحریر کیا، ہر بوند نے اسے اجلا کیا، اس کے غرور میں اضافہ کیا۔ وہ بیڈ کے نیچے سے رینگ کے باہر آئی۔ اس نے بھیگی سوجی آنکھیں مل کے دیکھا۔ جیسے دنیا کو پہلی بار دیکھا ہو۔ واش روم میں شاور فل کھلا تھا۔

"خدا کرے پانی ختم ہو جائے وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ شاور میں آنے والا پانی آگ بن جائے۔ نہیں یہ پانی کالا ہو جائے بدترین سیاہ۔ کسی بددعا پر بھی اس کی تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔

☆☆☆

جون کی ایک گرم ترین شام ڈھل چکی تھی۔ جب مصباح اور فارہ سگریٹ پان والے کی دکان سے ذرا آگے پسینے سے شرابور کھڑی تھیں جبکہ ان کی نگاہیں اس پچھلے چوک پر جمی تھیں جہاں ٹریفک سگنل

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

ایک تھی شال

رخسانہ نگار عدنان

مکمل ناول کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

قیمت - /500 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر:
32735021

پر رکی ہوئی تھی۔

"اب بھی وقت ہے جگنو کے قصے پر مٹی ڈالو، بس گھر چلتے ہیں۔" فارہ جیسے کھسیائی تھی۔

"دو گھڑی خاموش نہیں رہ سکتی ہو۔" اس نے اپنے بازو سے فارہ کا ہاتھ ہٹایا کہ اس کے لانبے ناخن گوشت میں پیوست تھے۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے دوبارہ ٹریفک پر نگاہ ڈالی۔ اس کی نگاہ کا مرکز ایک سفید مزدا ٹرک تھا جس نے اس چوک پر موڑ کاٹ کے وہ آہنی گیٹ پار کرنا تھا اور اس بارونق کالونی میں پھول پہنچانے تھے۔ سگنل کھلتے ہی مصباح الرٹ ہوئی اور فارہ کی ٹانگیں کپکپاہٹ کا شکار ہوئیں۔ گاڑیاں حرکت میں آئیں، کچھ دھیمی رفتار میں کچھ برق رفتار سے ان کا مطلوبہ مزدا ابھی کی سمت سب سے آگے تھا۔ چوک پر آ کے اس نے دھیمی رفتار میں جونہی موڑ کاٹا تو پلان کے مطابق طلحہ نے اس کا پچھلا دروازہ پیٹ ڈالا، مزدا جیسے رک گیا۔

"اوئے کیا مسئلہ ہے۔" رب نواز نے تیزی سے گردن گھما کر اشارتاً پوچھا۔

"جناب شیشہ تو نیچے کرو۔" پان والے نے شیشے پر ہاتھ بجاتے ہوئے جوابی اشارہ کیا۔ رب نواز نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔

"کہو کیا بات ہے؟" اس نے شیشہ بجانے والے خوش شکل لڑکے کو بغور دیکھا۔

"آج کل قاضی کی جاب پر کوئی نیا بندہ رکھ لیا ہے۔" طلحہ نے گردن اندر گھسیڑنا چاہی کہ وہ اچھا خاصا دراز قد تھا۔

"تجھے اس سے کیا مسئلہ ہے؟" رب نواز نے گھبراہٹ چھپاتے ہوئے سکون کے ساتھ پوچھا۔

اب سالم بھی ان کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

"جناب ہم سے حساب کتاب کیے بنا قاضی یہ ملازمت چھوڑ چکا ہے تو اب اس حساب کو بھی دیکھ لیں۔" ہاتھ آگے بڑھایا۔ "یہ رہی لسٹ۔" ہاتھ اندر گھساتے ہی طلحہ ڈور لاک کھول چکا تھا۔ یہ سب اس قدر تیزی سے ہوا کہ اس حرکت پر ششدر ہوتا رب نواز کچھ سمجھ پاتا۔ اگلے پل اس کی حیرت دو چند ہوئی جب اگلا دروازہ کھلتے ہی وہ لڑکی اچانک نمودار ہوئی اور رب نواز کو نیچے اترنے کا کہا۔ "مجھے چند منٹ ان صاحب سے بات کرنی ہے۔" وہ کچھ یوں آہنی لہجے میں مخاطب ہوئی کہ اس نے بوکھلا کے اپنے صاحب کو دیکھا جس کی حسیات نے گڑبڑ کا احساس پالیا تھا کہ قاضی کا سسرال میدان میں اتر چکا ہے۔

سالم نے پُرتکلف پہلو بدلتے ہوئے ملازم کو اترنے کا اشارہ کیا اور مکمل توجہ سے لڑکی کی جانب رخ موڑا۔ جس نے نشست سنبھالتے ہی اسے گھورنا شروع کر دیا تھا۔ اس ایئر کنڈیشن کیبن میں ماحول باہر سے مختلف تھا۔ اندر پھولوں کی خوش گوار مہک تھی۔ مصباح نے چند لمحے خود کو پرسکون ظاہر کرنے میں صرف کیے تو نگاہ کا غضب ناک تاثر بھی قدرے نارمل ہوا۔

"میں آپ سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں ملنا چاہتی ہوں۔" وہ مفاہمتی اور سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔ اسے اندازہ تھا کہ قاضی کے اس مالک کے بغیر جگنو کی دستیابی یا خیر خبر ناممکن تھی۔ وہ اسے چند لمحے پُرخیال نگاہوں سے دیکھتا رہا جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لڑکی کے انداز و اطوار الجھے اور خود کو گھبرانے کا ظاہر کر رہے تھے۔

"آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" ممکن ہے یہ میل ملاقات لڑکی تنگی کی بنا پر کرنا چاہتی ہو سالم کو بروقت خیال سوجھا تو ہلکا سا کھنکھار کے پوچھا۔

"آپ کے ڈرائیور کی گمشدگی کا سلسلہ بھی ہو سکتا ہے۔" مصباح نے غصہ ضبط کرتے ہوئے چادر درست کی۔

"معذرت کے ساتھ لیکن کیا میں جان سکتا ہوں کہ میرے ڈرائیور کی غیر حاضری پر آپ کیوں پریشان ہیں۔" اس کے سنجیدہ لہجے کا کوئی کونہ تو تجسس سے بھیگا ہوا تھا کہ مصباح کا دماغ کھول اٹھا۔ ونڈ اسکرین کے پار روڈ لائٹس ابھی اتنی تیز نہیں تھیں پھر بھی وہ دیکھ سکتا تھا کہ لڑکی نے اپنا غصہ کس ضبط سے کنٹرول کیا تھا۔

"پریشان تو آپ بھی ہیں ورنہ یہ ڈرائیوری اور آپ......" وہ تیکھے لہجے سمیت طنزیہ مسکرائی اور چہرہ موڑ کے ان پھولوں کو دیکھنے کی کوشش کی، جن سے خوشبو سمیٹی نہیں جا رہی تھی۔ اس کے کان میں ایک تار نما گول بالی تھی جس میں ایک موٹا سا سفید دمکتا موتی تھا۔

"میرا ڈرائیور تھا مجھ سے تنخواہ لیتا تھا، میں اس کی کسی بھی غیر اخلاقی یا اخلاقی حرکت کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا لہٰذا مجھے اس معاملے میں ملوث کرنا حماقت ہو گی۔" اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھائیں، وہ بات چیت مکمل ختم کرنے کے موڈ میں تھا مگر وہ لڑکی کسی اور موڈ میں تھی۔

"ابھی یہ معاملہ چند لوگوں کے علم میں ہے تو بہتر ہے اسے مل جل کے حل کر لیا جائے ورنہ۔"

وہ اسے نگاہ کے حصار میں رکھ کے چیلنج کر رہی تھی۔ سالم نے نہ صرف اس کے تپتے چہرے سے نگاہ ہٹائی بلکہ اس کے دھمکی نما ورنہ کو بھی یکسر نظر انداز کیا۔ پھر اس نے اپنے والٹ سے ایک کارڈ نکالا۔

"کل پورے سات بجے یہاں تشریف لے آئیے گا۔ لیکن ٹائم پر، میرے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا۔" وہ اکھڑے لہجے کے ساتھ گویا ہوا۔ مصباح نے اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑے کارڈ کو برہمی سے گھورا۔ دل تو چاہا اس شخص کی امداد پر لعنت بھیجتی اس منحوس مزدا سے اتر جائے۔ سالم نے روڈ کے دوسری جانب دیکھتے ہوئے مزدا اسٹارٹ کیا اور ہیڈ لائٹس بھی آن کیں۔ یعنی کہ اب جان چھوڑو۔

اسے اندازہ ہوا کہ وہ شخص مہذب تھا ورنہ کارڈ اس کے دامن یا قدموں میں پھینک سکتا تھا۔ اس نے جھٹکے سے کارڈ جھپٹا اور اگلے لمحے نیچے کود گئی۔ سالم نے گردن گھما کے اس پر اک گہری نگاہ ڈالی۔ باہر اب بھی لو کے وہی تھپیڑے اور دھرتی پر اترتی رات مصباح علی کی مانند ہی تپی ہوئی تھی، اس نے بازار کی جانب جاتی مزدا کو کھولتے دماغ کے ساتھ گھورا تھا۔

☆☆☆

مصباح علی کے اس محلے میں ایک متوسط طبقہ کئی نسلوں سے آباد تھا۔ وہاں آباد گھرانوں کی حیثیت کا اندازہ گھروں کے رقبے سے لگایا جا سکتا تھا۔ اس محلے کی مرکزی کشادہ گلی میں دس مرلے کے دو چار گھر ہی تھے۔ مصباح اور فارہ بھی انہی میں سے دو گھروں کی مکین تھیں۔ بیس سال قبل محلے کے ساتھ کا غیر آباد رقبہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئی ہاؤسنگ اسکیم میں ڈھل گیا۔ وہاں کے رہائشیوں کے رنگ ڈھنگ اور اس نئی کالونی سے متعلق افواہیں ان مڈل کلاس پڑوسی محلے داروں کے لیے تشویش ناک تھیں۔ جس کے نتیجے میں محلے کے بارسوخ افراد کی بیٹھکوں میں اس صورت حال پر کئی ناکام میٹنگیں ہوئیں پھر وقت کے ساتھ یہ شورش بھی کم ہوتی گئی اس کی ایک وجہ اس ہاؤسنگ اسکیم کے ساتھ ملحقہ وہ پوش کالونی تھی جہاں نہایت معقول اور رشوت خور افسران کی رہائش گاہیں تھیں۔ جن کی بدولت ان چوبارہ ٹائپ کوٹھیوں کے مکین بہت اونچی پرواز اڑتے تھے۔

اس کالونی کے اندر جانے کا ایک ہی راستہ تھا جہاں مسلح پہرے داروں کی پوچھ گچھ کے بنا وہاں پڑوسی محلے کے کبوتر ہی آزادی سے آتے جاتے تھے۔ یوں مصباح علی کا قدامت پسند محلہ اس جدیدیت کے دور نے پس منظر میں دھکیل دیا تھا کہ اب اس محلے داروں کو لوکل ٹرانسپورٹ بھی اس کالونی کے چوک پر ہی دستیاب تھی۔ کئی خوش تھے تو بہت سے لوگ ان چوباروں پر نگاہ جاتے ہی استغفار پڑھتے تھے۔

اب واپس اسی پسماندہ محلے میں جائیں تو کچھ مصباح کی فیملی سے بھی متعارف ہو لیتے ہیں۔ اس کے باپ بہروز علی کی شہر میں ایک لکڑی کی کشادہ

دکان ہے جہاں وہ اپنی فرنیچر مارکیٹ کو سستی اور مہنگی لکڑیاں بھی بیچتا ہے۔ ان کا گھر ایک دیوار کے فاصلے پر ہے' جس کے دوسری جانب پھول منڈی ہے۔ جہاں رات کے گہرے سکوت میں موسیقی کے مدھم سر ان کے صحن میں سنائی دیتے تھے۔ مصباح سمیت صحن میں کتابوں کو رٹنے لگاتی کئی لڑکیوں کے کان اس موسیقی کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ یہ گھنگھروؤں کی چھنا چھن بچیوں کے کچے ذہنوں میں جانے کیا بورہی ہوگی۔ بہروز صاحب تلملا کے دھاڑتے۔

''یہ طوائفیں...... ہونہہ' نجس عورتیں۔'' ان کا لہجہ متنفر ہوتا......

''اور ان کے دلال...... اف...... وہ پاکیزہ مرد'' ...... مصباح کی ماں تحمل سے مگر منہ توڑ جواب دیتی تو مصباح کی خوشی بے ٹھکانہ ہو کر یہاں وہاں ہر جگہ پھیل جاتی...... اس محلے میں جوان ہوتے بچوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس پڑوسی کالونی کو تہذیب یافتہ الفاظ کا لبادہ پہنا کے پھول منڈی کا نام دے دیا گیا کہ اب ادھر کے مزدور ٹائپ مزدوروں کا کام ادھر سے وابستہ ہو چکا تھا۔ سر شام دہی بڑے۔ فروٹ چاٹ اور گول گپوں کی ریڑھیاں لگنے لگیں۔ پکوان پکانے سے لے کر ہار گجرے پرونے تک حتیٰ کہ مرکزی سڑک پر کھلنے والی لانڈری کی دکانوں پر بھی اب زیادہ کام پھول منڈی سے ہی آتا تھا۔ ذرا اپنے ابا کو پھول منڈی سے آلینے دو' ان کچے پکے صفحوں میں پلنے والے نوجوان لڑکے لڑکیاں پھول منڈی کو پوش کالونی کا درجہ دیتے تھے پھر بھی اک عمر میں تجربی ہو ہی جاتی کہ درحقیقت پھول منڈی کیا ہے۔

☆☆☆

''جس طرح تم حکم صادر کرتی ہو نا۔ فلاں کا پھاڑ دو۔ فلاں کی تکہ بوٹی بنادو، ڈھمکاں کی ہڈی پسلی ایک کردو، اگر میں ان پر عمل کرنے والی ہوتی تو آج پنجاب کی تمام پولیس میرے پیچھے ہوتی۔'' قارہ کے لہجے میں سنجیدگی کے ساتھ رنج بھی تھا۔ مگر مصباح نے اس پر اک مشکوک نگاہ ڈالی جیسے اس نے یہ بات مذاق میں کی ہو۔

''میں آج بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔'' وہ قارہ سے نگاہ ہٹا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔

''میں تمہاری جگہ ہوتی تو اپنے آوارہ بہنوئی کا منہ توڑ دیتی...... تمہاری طرح اسے اپنی آپی یا خدا کے واسطے ہرگز نہ دیتی۔ اور تم کیا سمجھتی ہو' تمام واسطے دینے سے اس کی نیت درست ہو جائے گی۔'' وہ پلٹ کے استہزا سے گویا ہوئی اور گردن کو بے نیازی سے جھٹکا دے کر بال سلجھانے لگی۔ خاموش کھڑی قارہ شاید تادیر خاموش ہی رہتی کہ اس نے غور کیا تو اپنی دوست کی تیاری اور عجلت پر ٹھٹکی پھر معاملہ سمجھ میں آتے ہی اس کا تنفس تیز ہوا۔ وہ اسی تیزی سے اس کے قریب ہوئی۔

''تم اس مرد کے مالک سے......؟'' قارہ کی آواز اس قدر اونچی تھی کہ مصباح نے لپک کے کمرے کا ادھ کھلا دروازہ بند کیا۔

''اب تمام پاگل خانوں میں تمہاری کمی محسوس کی جاتی ہے قارہ بیگم!'' وہ اسے کینہ توز نظروں سے گھورتی دبی آواز میں غرائی۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال سلجھانے کا سلسلہ بحال کیا۔

''تم پرائی آگ میں کیوں کودنا چاہتی ہو؟'' وہ قریب آئی۔ اس نے اپنی سکھی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''چلو! اقریب اندازوں میں مبتلا ہیں مگر ہم تو جانتے ہیں کہ بجکوم نہیں ہوئی وہ اپنی مرضی و رضا سے بھاگی ہے۔'' مصباح نے اسے اک نظر دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو تم کچھ بھی نہیں جانتی ہو پھر وہ تیز قدموں سے چلتی بیڈ کے قریب آئی۔ اور جھک کے نیچے سے جوتا نکالا۔

''تم ایک اجنبی مرد سے ملنے جا رہی ہو۔ تمہیں خوف محسوس نہیں ہو رہا۔'' قارہ کا لہجہ کپکپا کے رہ گیا۔ مصباح کے چہرے کا رنگ بدلا۔ جس پر تاسف ابھرا۔ اک سوال ابھرا۔

''کیا صرف اجنبیوں سے خوف زدہ ہوا جاتا ہے۔'' کمرے کے وسط میں کھڑی قارہ نے جھٹ سے نگاہ چرائی تھی۔ مصباح نے بیڈ پر پھیلا لان کا دوپٹا اٹھایا اور اچھے طریقے سے اوڑھا۔

''ابھی میں نہیں جانتی کہ وہ اجنبی مجھے خوف میں مبتلا کر سکتا ہے یا میں اسے ڈرا پاؤں گی؟'' وہ ہلکا سا ہنسی۔

''پاگل خانوں میں صرف میری ہی نہیں کسی اور کی بھی محسوس کی جاتی ہے۔'' قارہ نے اس کی ہنسی پر کڑھ کے سوچا۔

''اس لیے مائی ڈیئر آج میں بنا کسی خوف اور ڈر کے اس کا سامنا کر سکتی ہوں۔'' اس نے یہ بات مزے سے کہی۔ ''اور بالفرض کسی موڑ پر میں خوف محسوس کروں گی یا وہ مجھے ڈرانا چاہے گا تو میں چیخ چلا کے اک زمانہ اکٹھا کر سکتی ہوں۔''

اس نے یہ بات کہہ کر بے نیازی سے کندھے اچکائے' وہ مسکرائی اور سائیڈ ٹیبل سے بیگ اٹھا کر اس کے قریب آئی۔

''اصل خوف تو وہ ہوتا ہے جو اپنوں کے ڈرائے جانے سے ہوتا ہے۔ پھر چیخنا چلانا تو دور کی بات، زبان ہلانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں اپنوں سے خوف زدہ لوگوں کے لیے ہجوم اکٹھا کر لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' اس کا لہجہ دھیما ہوا۔ اس نے قارہ کا رخسار نرمی سے چھوا...... جو اس خوف سے آشنا تھی...... جو خاموش لبوں کے ساتھ اس کی باتوں کی قائل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

طلحہ کے گھر کا دروازہ اکثر پہلی دستک پر ہی کھل جاتا تھا کہ اس کی ماں گھر سے باہر آنے کو تیار کھڑی رہتی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا، مصباح نے انہیں مسکرا کے سلام کیا۔ ساتھ ہی طلحہ سے تیسرے نمبر پر چھوٹے شاہو کا بھی پوچھا جس کا اصل نام شاہد تھا۔

''اگر وہ فارغ ہے تو بس ہم ابھی گئے اور ابھی آئے۔'' اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی وضاحت پیش کی۔ طلحہ کی ماں نے اسے سرتاپا دیکھا۔ آف وائٹ سوٹ کے ساتھ دوپٹا لیے وہ بالکل سادہ سے حلیے میں تھی لیکن نگاہ جب اس کے نفیس قیمتی جوتوں پر پڑی تو اس نے کہیں اور جانے کا ارادہ توڑتے ہوئے مصباح کے ساتھ جانے کا سوچا۔

''اے شاہو کون سا کام سنبھالتا ہے' نکمے باپ کی نکمی اولادوں نے بھلا کیا کرنا ہے۔'' وہ منہ ٹیڑھا کر کے بولی۔ ''ویسے کسی سہیلی کی طرف جا رہی ہو تو اس وقت میں بھی فارغ ہوں۔'' اب منہ کا زاویہ جھٹ سے درست ہوا۔ ساتھ ہی قمیص کی سلوٹیں بھی درست کیں۔ یعنی بالکل تیار۔

''اف'' مصباح کا دل پنڈولم کی طرح جھولا۔

''ان سے ملیے یہ ہیں نکمے شخص کی کارآمد بیوی جو صبح کے دس بجے سے لے کر رات کے دس بجے تک یہی ایک جملہ دہراتی ہیں کہ اس وقت تو میں فارغ ہوں۔ شاہو سے چھوٹے ویدو (وحید) نے ماں کی نقل ہو بہو اتاری، اس کا باپ اسے یونہی تو شیر نہیں کہتا تھا اس نے اوپری منزل کی منڈیر پر بیٹھ کے زبان چلائی تھی یہاں بچت کا امکان زیادہ تھا۔ ماں کا ڈنڈے کی جانب بڑھتا ہاتھ دیکھ کے وہ کہیں غڑاپ ہوا۔ مصباح نے ہونٹوں پر ہاتھ جمایا۔

جی خالہ! پھر چلیں۔'' وہ ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

''کیا فائزہ کی طرف جا رہی ہو؟'' خالہ نے فائزہ کے گھر کھائے کھانوں کا ذائقہ زبان پر تازہ کیا اور تصدیق کے بعد دہلیز پار کرنا چاہی۔

''ارے نہیں خالہ...... میں تو چوبرجی والی شنا کی طرف جا رہی ہوں۔ بے چاری کے شوہر کی جاب چھوٹے دو ماہ ہو گئے سوچا تسلی کے چند بول ہی کہہ آؤں۔'' اس نے چہرے پر کافی سے زیادہ اداسی طاری کی اور خالہ پر ترچھی نگاہ ڈالی' اسے اپنے پلان کے کامیاب ہونے کا سو فیصد یقین تھا۔

"آئے ہائے! مجھے تو اب یاد آیا کہ پاؤں میں صبح تڑکے موچ آئی تھی۔ اب دو چار سیڑھیاں اترنے سے بھی درد بڑھ سکتا ہے۔" ان کی ہائے وائے پر وہ رخ موڑ کے مسکرائی۔

"ہم نے کون سا پیدل جانا ہے' ٹیکسی آرہی ہے۔" وہ آگے بڑھی اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ارے نہیں بھئی پھر کبھی سہی۔" انہوں نے اپنا ہاتھ چھڑا کے شاہو کو با آواز بلند پکارا تو۔

"ارے اماں کاہے کی موچ۔ ابھی کچھ دیر پہلے گڈو کو مارنے کے لیے تو چھت پر چلی آئی تھیں۔" باپ کے شیر کے لیے خاموش رہنا کہاں آسان تھا۔ اس نے جوں ہی غار سے سر نکالا تو اس بار ماں کا نشانہ چوکا نہیں تھا۔ مصباح نے تاسف سے سر جھٹکتے ہوئے سامنے کھڑے شاہو کو چلنے کا اشارہ کیا جو دیکھنے میں سیانا۔ پرکھنے میں مست الست' بولنے میں کنجوس اور سننے میں صفر برابر تھا۔ وہ مقابل کی چیخ و پکار پہ ہی چونکتا تھا۔

☆☆☆

"پہلی جنگ عظیم کے دوران خواتین کی خدمات نظر انداز کی جارہی تھیں۔ اسپتال' جامعات اور لیبارٹری میں کام کرنے والی خواتین کو مردوں جیسے حقوق حاصل نہیں تھے۔" ساتھ والے ٹیبل پر چند باتونی خواتین کا یہ بحث و مباحثہ سنتے سنتے اسے پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ اب مصباح کی دلچسپی کا گراف بھی نیچے آچکا تھا کہ بات اب گھوم گھما کے موجودہ فیشن پر ٹھہر چکی تھی۔ اس نے کوفت بھرا پہلو بدلا اور اس شخص کے لیے کوئی بیسویں بار دانت کچکچائے جو اپنے تئیں نہایت قیمتی وقت کا مالک تھا۔ وہ اس وقت ایک کیفے ٹیریا میں تھی اب اس شخص کو کال کرنا ضروری تھا۔ اس نے کارڈ پر موجود نمبر ملایا۔ کیفے ٹیریا کے ہال میں کاؤنٹر پر موجود سالم نے انجان نمبر کو بھنویں سکیڑ کے دیکھا۔

"میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔" اس نے دوسرے فون پر سلسلہ منقطع کیا۔

"جی فرمائیے۔" اب وہ مصباح کی کال ریسیو کرچکا تھا۔

"میں پچھلے بیس منٹ سے آپ کے دیے ایڈریس پر موجود آپ کے قیمتی وقت کی قدر کررہی ہوں۔" وہ دبی آواز میں مخاطب ہوئی' وہ جھنجلایا ہوا لہجہ پہچاننے میں سالم کو کچھ وقت لگا۔ پھر وہ چونکا اور اپنی سیٹ چھوڑتے ہوئے اسے گزشتہ شام یاد آگئی۔ اس نے ہال میں نگاہ دوڑائی۔

"غالباً آپ وہی ہیں جو قاضی سے متعلق مسئلے میں انوالوڈ۔" اب وہ تیز قدموں کے ساتھ ٹیولپ ہال کی جانب آیا۔ مگر وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل کال منقطع کرچکی تھی۔ چند سیکنڈز بعد ہال کے وسط میں کھڑے شخص نے اسے تلاش کرلیا جو دنیا جہاں سے بے زار نظر آرہی تھی۔

"دراصل آج مصروفیت بہت تھی تو اس لیے۔" وہ کرسی سنبھالتے ہوئے نہایت مؤدب لب و لہجے میں گویا ہوا۔ شاہو نے اس کے ہاتھ میں قیمتی فون کو ایسے ہی دیکھا جیسے کوئی غریب اس قسم کے فون کو دیکھتا ہوگا۔

"جی آپ نے درست فرمایا' دراصل آج میں فارغ بہت تھی تو اس لیے آپ کے مقرر کردہ وقت سے ذرا جلدی آگئی۔" مصباح نے اسے اپنی جانب متوجہ پاکر انتظار کی کوفت کو اپنے لہجے کی کڑواہٹ سے بھگایا' وہ جس ذہنی اذیت کا شکار تھی چاہتی تھی کہ اس کیفیت میں اک زمانے کو مبتلا ہونا چاہیے۔ وہ لڑکی بنا کسی ہتھیار کے بھی جنگ لڑنے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھی' مقابل بیٹھے سالم کو اس بات کا اندازہ ٹھیک ٹھاک ہو چکا تھا۔

"آپ کیا لیں گی۔ کافی یا۔" اس نے حق میزبانی ادا کرنا چاہا۔

"نہیں کچھ بھی لینے کا موڈ نہیں' میں اپنے بھائی کو ایک بار چائے اور دو بار آئس کریم کھلا چکی ہوں......" وہ اس کی بات کاٹ کے درشتی سے گویا ہوئی کہ میزبانی کے آداب نبھاتا وہ دنگ رہ گیا۔

"مجھے اپنا رویہ نرم رکھنا چاہیے یہ میں کیا کررہی ہوں۔" اس نے خود کو سمجھایا اور لمحوں کے توقف سے جب وہ بولی تو لہجے میں نرمی در آئی۔ "دیکھیں ایک لڑکی کو بھگا لے جانا' یہ معمولی نوعیت کا فعل نہیں۔ آپ کو معاملے کی نزاکت کو سمجھنا چاہیے۔" وہ اصل موضوع کی طرف آئی۔ اس نے چہرے پر سے نادیدہ پسینہ ٹشو سے صاف کیا۔ سالم نے اسے خاصی حیرت سے دیکھا اور ذہن میں مناسب جملوں کو ترتیب دیتا لب کشا ہوا۔

"اگر قاضی لڑکی کو اس کے گھر سے اٹھوالیتا تو ثابت ہوتا۔ کہ لڑکی کی مرضی شامل نہیں تھی۔ اب وہ گھر سے باہر سڑک پر آکے اس کے ساتھ فرار ہوئی ہے۔ تو معاملہ برابر کا ہوا نا۔"

سالم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اس کی غصیلی آنکھوں میں جھانکا کہ غیر ارادی طور پر سالم کے مزاج میں نرمی عود آئی تھی۔ مصباح نے اس کڑوے سچ پر پل بھر کو دائیں بائیں جھانکا۔ وہ اس طرح کے ہزاروں سچ جگنو کی عزت پر قربان کرسکتی تھی اور اس نے ایسا ہی کیا۔

"آپ نے جو کہا کسی حد تک درست ہوگا مگر یہ بھی تو مانیے نا...... کہ آپ کے ڈرائیور نے سیدھی سادھی اٹھارہ سالہ جگنی کو کیسے کیسے سبز باغ دکھا کر گھر سے بھاگنے پر اکسایا ہوگا۔" وہ مصباح علی تھی تو کیا اتنے پر ہتھیار ڈال دیتی۔ وہ اس کے چہرے پر نگاہ جما کے یوں ڈھٹائی سے بولی کہ وہ حیران رہ گیا اور بس خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

"اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟" اس نے فون پر آنے والی کال کاٹ کے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں ان دونوں سے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ موڈ بدل کے نہایت سکون سے گویا ہوئی۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ اگلا بندہ حیرت کی کون سی دیواریں پھلانگ چکا ہے۔

اسے سامنے بیٹھی لڑکی کی دماغی حالت پر شک گزرا۔ اس نے مصباح کو عجب تاثر کے ساتھ گھورا تو نگاہ کان کی بالی پر ٹھہری۔ جس کا موتی خوب چمک رہا تھا۔ وہ اسے کوئی بھی جواب دیے بنا وہاں سے اٹھ جاتا تو وہ اس کا کیا بگاڑ سکتی تھی لیکن وہ اسے اپنے ہر جواب سے مایوس کرنا چاہتا تھا اس لیے خاصے تیز لہجے میں مخاطب ہوا۔

"آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے میں انہیں پلان کے مطابق کسی ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرا کے آیا ہوں اور ہم یہاں سے اٹھ کے سیدھا وہیں جاسکتے ہیں۔" وہ بات کے اختتام پر تمسخر سے ہنسا۔ اور مصباح کے ساتھ بیٹھے اس ٹین ایجر لڑکے کو دیکھا جو اپنے فون پر کسی گیم میں مصروف تھا۔ مصباح کا دل مایوسی میں ڈوب کے ابھرا۔

"آپ اس کے مالک ہونے کے ناتے اس سے رابطے کی کوشش تو کرسکتے ہیں۔ اس نے جگنو کو بتا رکھا تھا کہ مالک کے فارم ہاؤس کے علاوہ دنیا میں اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

"آپ اپنے فارم ہاؤس کا وزٹ کریں یا پھر مجھے اس کا اتا پتہ بتادیں میں اپنی طرف سے تسلی کرلوں گی۔" یہ تمام باتیں کرتے ہوئے اس کا دھیان اپنے لہجے میں اچھائی یا برائی پہ کہاں تھا' وہ بس تیزی سے مخاطب تھی اور جب خاموش ہوئی تو اس نے ماحول کے ساتھ اس شخص کی خاموشی کو بھی محسوس کیا جس کے چہرے پر سختی کے ساتھ غصے کی بھی جھلک تھی شاید وہ غصہ قاضی کے لیے تھا' دل میں خدشات سر اٹھارہے تھے کہ وہ فارم ہاؤس کے متعلق اور کتنوں کو بتا چکا ہوگا۔

"دیکھیں بی بی وہ میرا ملازم تھا کہ کبھی سامنا ہونے پر میں اس کے سلام کا جواب بھی سر کے خفیف اشارے سے دے دیا کرتا تھا۔" اس نے جھوٹ کا سہارا لیا' مجھ پر وقت ضائع کرنے کے بجائے آپ کو اس کے دوستوں سے رابطہ کرنا چاہیے۔" وہ کرسی پیچھے دھکیلتے ہوئے جھٹکے سے کھڑا ہوا۔

"اگر آپ مجھ سے تعاون سے انکاری ہیں تو آپ بری طرح پھنسیں گے۔ اب لڑکی کے گھر

اٹھتے اٹھتے اسے دھمکی دینا نہیں بھولی تھی۔ وہ جاتے جاتے رکا پھر پلٹ کے اسے دیکھا "اگر لڑکی والے کوئی اور تھے تو پھر یہ کون تھی؟

"یہ معاملہ میرے لیے قانوناً حل کرنا زیادہ آسان ہوگا...... انہیں رپورٹ درج کرانے دیجیے......" وہ پرشکن پیشانی کے ساتھ بولا۔ اس کی آواز میں پنہاں اطمینان نے مصباح کی خالی خولی دھمکی پر جیسے بم گرایا تھا۔ اب وہ ہونق کھڑی آگے بڑھتے اس شخص کی پشت کو گھور رہی تھی۔

☆☆☆

ایک ڈراؤنی سرگوشی...... "دروازہ کھولو" ہلکے ہاتھ سے پڑنے والی ایک دستک...... وہ نیند میں تکیے پر سر پٹختی ہے۔ دوسری دستک...... پھر بے شمار...... کسی عورت کا ہیولہ دروازے کے پار ساکن ہے۔ دروازہ کھولنے سے قبل اس عورت کی ایڑیوں سے بہتا قطرہ قطرہ درد ایک ایسی چیخ مارتا ہے کہ وہ ہڑبڑا کے جاگتی ہے۔ کاش وہ دستک سچ مچ کسی بلا کی ہوتی۔ جو کوئی اسم پڑھنے سے۔ خدا کو یاد کرنے سے خدا کا واسطہ دینے سے بھاگ جاتی۔ پلٹ جاتی۔ کوئی ورد...... کوئی کلمہ اثر دکھا سکتا تھا۔ لیکن دروازے کے پار بلا نہیں تھی۔

وہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ جسے چند دنوں سے وہ لگاتار دیکھ رہی تھی۔ خواب میں جو چہرہ اسے نظر آتا تھا وہ بے حد ڈراؤنا تھا۔ خواب ختم ہو جاتا آنکھ کھل جاتی۔

"مجھے ڈر کیوں نہیں لگ رہا۔" وہ خود کلامی کرتی، ہر بار خواب ٹوٹنے پر غصہ ڈر پر غالب آجاتا تھا۔

☆☆☆

آج اس کی قسمت اچھی تھی۔ ایک تو اس کی دستک پر دروازہ گوشی آپا نے کھولا تھا۔ اور اس کے چند قدم اٹھانے پر جو دستک دوبارہ ہوئی وہ یقیناً اس کے باپ کی تھی۔ جو پانچ یا دس منٹ وہ لیٹ ہو جاتی

...ماں کی بے غرضی کا سوچ کے اس کا دل ڈوب، ڈوب گیا کہ اس کی تمام خطائیں اس کا باپ ماں کے کھاتے میں رکھتا تھا۔ اس بار بھی دروازہ کھولنے والی گوشی ہی تھی۔ جو واقعی گھر جانا چاہتی تھی یا بہروز علی کی چبھتی نگاہ نے اسے اوجھل ہونے پر مجبور کیا تھا۔

فی الحال مصباح نے تمام تلخ و شیریں سوچوں کو جھٹکتے ہوئے اپنی ماں کے تحفظات پر طمانیت بھرے گہرے سانس لیے۔ کچھ دیر بعد وہ برآمدے میں تشریف فرما اپنے والد سے تایا کی فیملی کے احوال دریافت کر رہی تھی۔

"اپنے باپ کے لیے پہلے پانی پھر چائے لے کر آؤ۔" ماں کی کڑی نگاہ اور سپاٹ آواز کے پس منظر میں اگرچہ اس کے دیر سے آنے کی جواب طلبی عروج پر تھی (ذرا کیلی ہولو) ایسی صورت میں فوری حکم بجالاتے اس نے کچن کا رخ کیا۔

"یہ محترمہ گوشی صاحبہ رات کے چند گھنٹوں کے علاوہ غالباً ہمارے ہی گھر پائی جاتی ہیں۔" بہروز علی بیٹی کے اوجھل ہوتے ہی بیوی سے خاصے طنزیہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ مصباح کے قدم من بھر کے ہوئے اور صحن کے وسط میں ہی گڑ گئے۔

"آج پھر اس کے شوہر نے اسے پیٹنے کے بعد گھر سے نکال دیا تھا۔ بے چاری ڈسپنسری سے پٹی وغیرہ کروا کے ادھر ہی آگئی تھی۔" اماں نے یقیناً نگاہ چرا کے بات کی ہوگی۔

"اف خدایا۔" مصباح کا دل بیٹھا۔ گوشی کو آج پھر مار پڑی......

"باہر جیسے لفنگے سے نکاح کرتے وقت اس نے تم سے یا کسی محلے دار سے مشورہ نہیں لیا تھا۔ اب کس بنا پر ہمدردیاں بٹورنے آتی ہے۔" ابا کے لہجے میں غصہ تھا، طنز تھا یا استہزا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا لیکن وہ ستون کی اوٹ میں تھے۔

"تو کیا کرتی۔ بیوہ کو وارث کی ضرورت ہوتی ہے۔" آج گوشی کا مقدمہ لڑتے ہوئے اماں کا لہجہ دھیما تھا۔

"تو اب اس کا وارث بھلے مار کے پھینک دے تمہیں ان کے معاملات سے دور رہنا چاہیے اور یہ بات مصباح کو بھی سمجھا دو۔" ابا کے غصیلے لہجے پر مصباح نے اپنی مٹھیاں ضبط سے بھینچیں۔

"تمہاری سہیلی کو دوسری شادی کا شوق ہی بہت تھا۔" ورنہ دونوں ماں بیٹی کا گزارا محلے داروں کی امداد اور زکوٰۃ سے بھی ہو سکتا تھا۔" (گزارا تو محلے داروں کی عنایات پر بھی ہو سکتا تھا) مصباح نے تلخی سے سوچتے ہوئے پاؤں جیسے کسی دلدل سے کھینچا تھا۔

"اب وہ لفنگا اسے مارے پیٹے نہیں تو کیا پھولوں کے ہار پہنائے جس سے ایک بیٹی نہیں سنبھالی گئی۔" تکبر کا وہ کونسا زینہ تھا وہ نخوت بھرا ہنکارا۔ ابا کی اس بات پر اماں کا رنگ کیسا زرد پڑا ہوگا۔

"کوئی بھی ماں ایسا نہیں چاہتی بہروز! بس تقدیر غالب۔" اماں کی توبہ سے لبریز اور بھیگی آواز نے بیٹی کے دل میں آگ جھونک دی تھی۔ اس وقت ان کے صحن میں چلنے والی ٹھنڈی ہوا بھی اس کی بے چین طبیعت میں بحالی کا باعث نہیں بن پا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ علاقہ شہر سے ذرا ہٹ کے تھا۔ رات کے دوسرے پہر بھی اس علاقے سے ملحقہ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی جس کے ایک جانب کچی آبادی اور لہلہاتی فصلیں تھیں تو سڑک کے زیریں دوسری جانب تین چار کلومیٹر کی پختہ سڑک فصلوں کو چیرتی جس فارم ہاؤس کی طرف جاتی تھی وہ اس کے مالک نے خود بنوائی تھی۔ سڑک پر کھڑے ہوکے مشرقی سمت دیکھو تو اندھیرے میں وہ علاقہ ویران معلوم ہوتا تھا لیکن چار سو پھولوں کی خوشبو بتاتی تھی کہ آگے بسیرا ہے۔

رہائش گاہ پھولوں کے کھیتوں کے عین وسط میں تھی۔ سالم اس وقت اپنے فارم ہاؤس کے ٹیرس پر کھڑا تھا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر پریشانی کے بجائے الجھن تھی۔ وہ پرائے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اسے قاضی کے مسئلے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں

تھی۔ بے شک وہ کسی کی بھینس بھگا لے جاتا یا لڑکی۔ یہ قاضی کا ذاتی معاملہ تھا۔ وہ اس کے معاملے میں اس لیے ملوث ہوا تھا کہ لڑکی کا تعلق اگر بازار سے تھا تو وہ لوگ فارم ہاؤس تک آسکتے تھے وہ ٹیڑھے لوگوں سے بھی سیدھے انداز میں پیش آنے والا شخص تھا۔ اس لیے وہ ادھر کا معاملہ ادھر ہی نمٹانے کے لیے مرزا کی ڈرائیوری سے بھی فیض یاب ہو چکا تھا کہ بات ریپوٹیشن کی تھی۔ اچھا ہوا کہ شام کو وہ لڑکی غصے میں اپنے ارادوں سے آشکار کر گئی۔ اگر وہ لوگ رپورٹ میں قاضی کے ساتھ اس کا نام بھی درج کروا دیتے —— یہ خواہ مخواہ کی بدنامی تھی۔ بات اب بھی عزت کی تھی۔ اس لیے وہ لڑکی جیسے ہی کیفے ٹیریا سے نکلی تھی تو سالم کے ایک گارڈ نے اس کے گھر تک پیچھا کیا تھا۔

"مجھے رات بارہ بجے تک اس لڑکی سے متعلق مکمل معلومات چاہئیں۔ خصوصاً قاضی کے ساتھ بھاگنے والی لڑکی کا اسے تلاش کرنے والی بی بی کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔" اس نے بہروز علی کے گھر کا پتا رب نواز کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے خصوصی تاکید کی تھی۔ اور کچھ دیر قبل رب نواز نے اسے جو معلومات فراہم کی تھیں۔ وہ خاصی حیران کن تھیں۔ اس وقت بھی ٹیرس پر کھڑے سالم امین کا ذہن اسی نقطے پر اٹکا ہوا تھا۔ وہ مصباح نامی لڑکی خود کو محض جگنو کی محبت میں خوار کر رہی تھی جبکہ جگنو کے والدین ہر معاملے سے بے خبر تھے۔ اس کی سگی ماں اور سوتیلے باپ کو اپنی بیٹی کی گمشدگی کے کسی قاضی یا مجرم پر کوئی شک تک نہیں تھا پھر کیسی رپورٹ۔ گویا مصباح نامی لڑکی نے محض دھمکی سے کام نکلوانا چاہا تھا۔ وہ پان والا لڑکا اور یہ تفتیشی بی بی اگر سالم امین کو قاضی کا مالک ہونے کی بنا پر اس معاملے میں گھسیٹنا چاہتے تھے تو اسے اس سے کیا فرق پڑتا تھا، وہ خود کو مطمئن کر چکا تھا۔ اور یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا اندازہ تھا اور یہ اس کی زندگی کی پہلی بھول تھی۔

اس نے ریلنگ سے ہاتھ ہٹائے اور رات

...کھیتوں پر اڑنے والے پرندے ان کھیتوں کے مالک کی مانند ہی پرسکون اور گہری نیند سوتے تھے کہ ان آنکھوں میں اگنے والے خواب ابھی اس چار حرفی دیوار کے پار کہاں جھانکتے تھے جنہیں جوڑ دیا جائے تو وہ لفظ بنتا ہے جسے محبت کہتے ہیں کہ اس چار حرفی دیوار کے پار ہی درد بٹتا تھا اور سکون منتشر ہوتا تھا۔ ابھی دل نگر میں کوئی سودا گر ایسا نہیں گزرا تھا کہ جس کے ہاتھ سے وہ خوشبو خرید لیتا۔ ابھی چاند بس چاند تھا جسے دیکھ کے کوئی چہرہ یاد نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

چند سال پہلے بہروز علی نے جدید طرز کا اور خاصا مہنگا لکڑی کا جھولا بنوایا تھا جس کی رنگین لکڑیوں سے صندل کی خوشبو پھوٹتی تھی۔ وہ جھولا برآمدے سے صحن میں آیا اور صحن سے پھرتا پھراتا اب چھت پر آچکا تھا۔ کبھی جگنو اس کے ساتھ بیٹھی ہوتی تو رنگین ڈنڈیوں کو چھیڑتے ہوئے قاضی کا ذکر بھی چھیڑ دیتی تھی۔ اس کا لہجہ صندل کی مہک چرا لیتا تھا۔ مصباح اسے ٹوکتی رہ جاتی۔ نہ کوئی پتہ نہ کوئی ٹھکانہ ایسے بندے کا کیا اعتبار، وہ اس یاد سے چونکی اور چہرہ گھما کے جگنو کی سمت دیکھنا چاہا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلی جھول رہی تھی۔

ذہن میں ہزاروں سوال تھے لیکن جواب کہاں سے آتے۔ یا اللہ۔ مجھے کون بتائے گا کہ وہ کس حال میں ہے۔ پتا نہیں انہوں نے نکاح بھی کیا ہے یا وہ اسے یوں ہی لیے پھر رہا ہوگا پیچھے تو بربادی تھی سوچی اور آگے...... اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ وہ کیا سمجھتی تھی کہ مصیبتوں کی ٹرین جہاں ٹھہرے گی وہاں اک سبز باغ ہوگا۔ جس میں سنگ مرمر سے بنا تاج محل، ہر دور کے بادشاہ نے معصوم رعایا کے دلوں پر ظلم ہی ڈھایا۔ کہ دل والے زاد سفر میں مشکیں لے کر راستے بھر محبوبہ کو تسلیوں سے نوازتے ہیں کہ ہمارا مقدر بیاباں اور پیاس ہی نہیں۔ اک ذرا پڑاؤ ڈالنے کی دیر ہے مشکیزے میں پانی ہو نہ ہو کسی شاہجہاں سے سودائی کا تاج محل ضرور ہوگا۔ جگنو بھی کسی پڑاؤ کی منتظر ہوگی۔ مشکیزے سے پانی بھی ختم اور تاج محل، جو صرف بادشاہ کی حقیقت باقی ہر محبوب کا خواب۔ یہ ایک تاریک رات تھی۔ اس نے آسمان کی جانب دیکھا اسے آسمان سے کبھی بھی گلہ نہیں رہا تھا۔ تاریخ چہروں سے کیا گلہ۔ لیکن اسے آسمان کے مالک سے کئی گلے تھے اس کا دل بھیگا۔

اس نے جھولے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ تو جو اس کے صندل کی مٹی سی خوشبو کو چھوا۔ اس نے عمر کے ہر حصے میں ایک اچھی زندگی گزاری تھی اس کا سامنا کبھی معاشی مسائل سے نہیں ہوا تھا۔ اس کی کوئی خواہش تشنہ نہیں تھی۔ ہر ضد سے لے کر اپنی تعلیم کے مکمل ہونے تک ہمیشہ اس کی مرضی چلتی رہی تھی۔ پھر کیا تھا جو اسے بے چین رکھتا تھا۔ وہ کیا چاہتی تھی وہ کون تھی وہ کیا خود سے بچھڑ گئی تھی؟ وہ اپنا ہی پتا بھول بیٹھی۔ اس نے دوبارہ ذرا دھیان سے آسمان کو دیکھا جیسے بارش ہونے والی تھی آج کل تو اسے آئینہ دیکھ کے بھی یہی لگتا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔

☆☆☆

مصباح کے گھر کی پچھلی گلی میں ایک خستہ حال مکان گوشی آپا کا تھا جن کے ماں باپ نے انہیں کم عمری میں ہی بیاہ دیا۔ انہوں نے گھر گرہستی اپنی ساس سے سیکھی تھی۔ مصباح کی دادی اور گوشی کی ساس میں گہرا بہناپا تھا یوں ان کی بہوؤں میں بھی ایک دوستانہ سا پنپنے لگا۔ شادی کے کئی سالوں بعد ان کی ساس اور شوہر ایک ساتھ حادثے کا شکار ہو کر ملک عدم سدھار گئے تو چوبیس سالہ گوشی پر دنیا کی حقیقت عجب ڈھنگ سے کھلی۔

اس معاشرے میں ان کے دیور سے لے کر ہر ایک کے لیے ان کا وجود باعث کشش تھا باقی رشتے تو جیسے مرنے والے کے ساتھ مٹ چکے تھے۔

"تمہیں اب دیور سے نکاح کر لینا چاہیے۔" عدت پوری ہو چکی تو سب سے پہلے یہ مشورہ انہیں مصباح کی ماں نے دیا تھا وہ خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر بس اتنا کہا۔

"آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر، لیکن پھول منڈی میں گجرے پروتے ہوئے کسی دن اس نشئی نے مجھے اور میری بیٹی کو ساتھ ہی ٹانک دینا ہے۔"

کیا اس کے انکار کی وجہ صرف یہ خدشات تھے جنہیں وہ یقین کی سند سے نواز رہی تھی یا پھر وہ کسی اور کی جانب مائل تھیں۔ مصباح کی ماں تادیر ان کی جھکی آنکھوں کو دیکھتی رہیں کہ محلے میں گردش کرتی افواہیں ان کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھیں۔

"بھلے تمہارا دیور تمہیں گجروں میں ٹانک دے گا مگر تمہاری جگنو ایک اسی کے زیر سایہ محفوظ رہے گی۔" انہوں نے بطور دوست گوشی کو صحیح راہ پر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ایک ہفتے بعد سب نے سنا کہ گوشی نے اپنے شوہر کے چچا زاد بابر سے نکاح کر لیا تھا۔ وہ ایک بار پھر مصباح کی ماں کے سامنے نگاہ جھکائے بیٹھی تھیں۔

"مجھ جیسی بے آسرا اور بے سروسامان عورت جب بیوہ ہو جاتی ہے تو اس کے گھر کی دیواریں بونی ہو جاتی ہیں پھر ہوا کی دستکوں پر بھی وجود لرز اٹھتا ہے۔ میرا نشئی دیور میری بیٹی کا تو محافظ بن سکتا تھا لیکن اس غافل پڑے آدمی کو کیا خبر ہوگی کہ گھر کا دروازہ کب کھلا اور کب بند ہوا۔ گھر کے اندر کنڈی لگانے والے ہاتھ مضبوط ہوں تو دروازے کے پار ہوا بھی کترا کے گزرتی ہے۔" گوشی نے ذلت اور خوف کا جو آسیب اپنے وجود سے نکال کے بھگا دیا تھا وہ کہیں اور جانے کے بجائے گھر کے کسی حصے میں چھپ گیا تھا۔ اب وہ اپنی حریص آنکھوں سے گھر میں چلتی پھرتی جگنو کو دیکھتا تھا۔ گوشی نے اس آسیب کی خوشبو پالی تھی۔

☆☆☆

"آج پھر تم چھت پر کھڑی اس لڑکی سے گپیں لگا رہی تھیں۔" وہ بے توجہی سے ٹی وی کو بس گھور رہی تھی کہ ماں کی آواز پر چونک کے سیدھی ہوئی۔ پھر حیران ہوئی اور آنکھوں سے گلہ کیا کہ مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔

"محلے کے لڑکے جا کے تمہارے ابا سے شکایت لگاتے ہیں۔" اس نے یہ بات نگاہ چرا کے کی۔

"یعنی میرا...... پھول منڈی کی عورتوں سے بات کرنا ابا کو اور محلے کے مردوں کو پسند نہیں۔" وہ تمسخر سے ہنسی۔ "یعنی ابا سمیت اس محلے کے تمام مرد غیرت مند...... اور مجھ سمیت محلے کی کئی عورتیں بے غیرت ٹھہریں۔ آخر ہمارے گھروں کے مرد بھی تو وہاں آتے جاتے ہیں...... واہ...... اماں" اس نے پاگلوں کی طرح قہقہہ لگایا۔ "یعنی ہم عورتیں بے غیرت اور مرد غیرت۔"

"مصباح...... یہ کیا بکواس ہے۔" ماں دبی آواز سے دھاڑیں۔ کہ بیٹی کے جملے اگرچہ دل میں اتر گئے تھے مگر وہ جملے سماعتوں میں جذب ہونے والے نہیں تھے۔ "ان کے لیے ہوا الگ سے چلتی ہے نا۔ گندم الگ سے اگائی جاتی ہے۔ پھول منڈی کو بھی وہی سورج دھوپ دیتا ہے اور آسمان پر دوسرا چاند کب نکلتا ہے جو صرف ان چوباروں پر چمکتا ہو۔ وہ آسمان سے نہیں ٹپکتیں۔ انہیں ہم جیسی عورتیں ہی پیدا کرتی ہیں۔" اس نے ماں پر مسکراتی نگاہ ڈالی۔

"ایک دن آپ ابا سے بھی سب کہہ رہی تھیں نا۔" اس نے حسب عادت ماں کا غصہ اپنے کندھوں کی بے نیاز جنبش سے اڑانا چاہا۔ جن کی نگاہوں میں بے چارگی تھی۔ "وہ جواب صرف تمہارے ابا کے لیے تھا۔" اتنا کہہ کر ماں نے رخ بھی موڑ لیا۔ مصباح کی نگاہ ماں کے ناراض چہرے پر تھی جو اپنی اکلوتی اولاد سے نالاں تھیں جن کے لیے بیٹی کو سمجھنا مشکل ترین تھا۔ اس کے پاس بھی چند سوال تھے جو صرف ماں کے لیے تھے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ مصباح کو ہاتھ کے اشارے سے روکتی دروازے کی جانب بڑھیں تو اس نے ماں کی چال میں جھلکتی نقاہت شدت سے محسوس کی۔ اس لمحے اسے اپنے باپ کی توانا چال یاد آئی۔ کم از کم بیوی کو شوہر سے بیس سال چھوٹا ہونا چاہیے

وہ اکثر یہ بات سوچتی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی چھت کی منڈیر کے ساتھ چپکی جھروکوں سے گلی میں جھانکتی ہے گلی میں شور ہے بچے کھیل رہے ہیں۔ محلے کی بجلی گئی ہوئی ہے۔ "آج گلی میں مت جانا۔" اسے اپنی ماں کی نصیحت یاد ہے۔ وہ جھروکے میں آنکھیں گھسائے دیکھتی ہے۔ "میاں صاحب کی لاٹھی پڑ گئی نا۔ تو پھول منڈی کے بچوں سے کھیلنے کا بھوت اتر جائے گا۔" ایک لڑکی کی بوا اس کو ڈرا رہی تھی۔ جھروکے سے گلی بچی کا رنگ لٹھے کی طرح ہوا۔ اور جسم اکڑ گیا۔ میاں صاحب کی دھنک سے بڑا بھی کوئی خوف ہوگا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ غصہ ماں کی نصیحت پر غالب آچکا تھا۔ اگلے منٹ وہ گلی میں تھی۔ بوا کے ہاتھ سے لڑکی کا ہاتھ چھڑا کے وہ باقی بچوں کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ پارہ تقدیسہ باجو اور وہ گھپ اندھیرے میں کھیلتے بچے۔

"میں اپنے عہد کی وہ آنکھ ہوں۔ جو اماوس کی رات دیکھنے کی روادار نہیں۔ میں چاند کی پشت پر دیا جلانا چاہتی ہوں۔" بچی کے مسکراتے چہرے پر چاندنی چمک رہی تھی۔

☆☆☆

وہ کوشش کے باوجود اپنے دل کی رونق بحال نہیں کر پا رہی تھی۔ سو خود کو مصروف رکھنے کے لیے کچن میں چلی آئی۔ بریانی پکا کے اس کا ارادہ طلحہ کے گھر جانے کا تھا۔ بریانی دم پر لگا کے وہ کمرے میں آئی تو طلحہ کی کال آرہی تھی۔

"اس وقت کیا ہو رہا ہے۔" طلحہ نے معمول کا سوال کیا تو نا چاہتے ہوئے بھی آج کافی دنوں بعد وہ کچھ شریر ہوئی اور اسے چڑایا۔

"فی الوقت تو ٹی وی کے سامنے ہوں۔" طلحہ کا مشورہ تھا کہ فارغ بیٹھنے کے بجائے سی ایس ایس کی تیاری کرلو۔ طلحہ نے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

"میں تمہیں بتادوں کہ جگنی سے متعلق کوئی بھی خبر فی الحال ٹی وی پر نشر نہیں ہوگی ہاں مگر آنے والے دو چار دنوں تک شاید یہ ممکن ہو جائے۔" طلحہ کی سپاٹ آواز نے اس کا سکون تلپٹ کیا۔

"کک...... کیا مطلب؟" اس کا دل دھڑکا۔ حالانکہ اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

"کوشی کا شوہر بابر، جگنی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانا چاہتا ہے وہ بھی بمعہ اس کی تصویر کے۔ مطلب سب کچھ ہماری توقع کے مطابق ہونے جارہا ہے۔" طلحہ نے تھکا تھکا سا سانس لیا۔ مصباح کا دل جیسے بند ہونے کو تھا۔

"وہ تصویر خبر کے ساتھ اخبار میں بھی چھپے گی اور الیکٹرانک میڈیا پر بھی چلے گی...... بالآخر وہ دونوں پکڑے جائیں گے اور بالفرض وہ نا بھی پکڑے جائیں تو قاضی خوفزدہ ہو کے اسے کہیں بھی چھوڑ سکتا ہے۔ پھر جگنی کا انجام کیا ہوگا۔" اس کی آنکھوں میں تیزی سے پانی جمع ہوا۔ مگر وہ جلد مایوس ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے کسی امید سے جیسے خود کو چارج کیا اور جب بولی تو لہجہ حوصلہ افزا تھا۔

"صرف ایک دو دن تک تم اس کمینے بابر کو کسی بھی طرح تھانے کچہری سے دور رکھو۔ ہوسکتا ہے اس دوران جگنی سے رابطہ ہو جائے۔"

"مثلاً کس طرح؟" طلحہ کے دو لفظی سوال نے اس کی امید پر پانی پھیرا۔ وہ خاموش ہوگئی۔ کس طرح کے آگے اک اندھیر نگری تھی کس طرح ہوگا۔ جسے فلک بمشکل سے سرنکال کے مسکرائی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی الفاظ کہیں چھپ گئے۔

"تمہیں ایک بار پھر سالم امین سے ملنا چاہیے۔" ایک گہرے توقف کے بعد طلحہ کی آواز کان کے پاس ابھری جو امید سے عاری تھی۔ مصباح کے اندر باہر دھواں سا بھر گیا۔

"مجھے نہیں لگتا وہ بندہ ہمارے کسی کام آسکتا ہے۔" اسے سالم امین کا غرور یاد آیا۔ تو چہرے کی رگیں خود بخود تن گئیں۔

"کسی کے بارے میں اتنی جلدی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتے۔" وہ حسب عادت نرمی سے گویا ہوا۔ اس کے یقین میں کچھ تو تھا طلحہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ مصباح نے ایک شکستہ سانس بھر کے خود کو آمادہ کر ہی لیا۔

"لیکن میں اب اس شخص سے کیسے اور کہاں مل سکتی ہوں۔"

اگرچہ اس کے مزاج سے غصے کی گرد جھڑ سی گئی تھی مگر سالم امین کی اکڑ یاد آتے ہی لہجہ بے رونق ہوا۔

"تمہیں اسی وجہ سے شانت رہنے کا مشورہ دیتا ہوں کہ ہر وقت کا غصہ انسان کی مت مار دیتا ہے۔" وہ ہلکا سا ہنسا۔

"صرف تم ہی عقل کل ہو۔" وہ بھی ہلکا سا چڑی۔

"وہ ہر شام کیفے میریا میں گزارتا ہے۔" وہ کھنکھارا۔

"مطلب اسے ڈھونڈنا بھی پڑے گا۔ اس کا انتظار بھی کرنا پڑے گا۔ وہ ملازم تو نہیں کہ ہر شام وہیں گزارتا ہوگا۔" وہ اچھا خاصا تلملا کے بولی تھی۔

"ایک تو یہ میری معلومات اندیشوں میں مبتلا کرنے جیسی ہوئی۔ اور دوسرا میں نے کہا تھا کہ گمشدوں کو ڈھونڈنا ____ دریا سے موتی نکالنے جیسا ہی ہے۔" طلحہ کا جواب بھی خاصا جھنجھلایا ہوا تھا۔ اس کے خیالات کی رو، طلحہ کے جملے میں بھٹک کے اچانک تبدیل ہوئی وہ مسکرائی۔

"اور جو گم ہونے کا ڈرامہ کرتے ہوں انہیں کیسے ڈھونڈا جائے۔" اس کی ذو معنی بات وہ سمجھ چکا تھا۔ وہ مزید گویا ہوئی۔

"تمہیں کل کی تاریخ میں کچھ یاد آرہا ہے۔" اس کی آواز دھیمی اور مدھم ہوئی۔ وہ یوں خاموش ہوا جیسے فون بند کر چکا ہو۔ پتہ نہیں مصباح نے وہ زمین کہاں سے خریدی تھی۔ جہاں وہ اپنی مرضی کے خواب اگاتی تھی پھر انہیں تعبیریں بھی اپنی مرضی کی دینا چاہتی تھی۔ جبکہ طلحہ کی حیثیت اور اس کے حالات ایک نوکدار حقیقت تھے۔ کچھ اس کا اکلوتا خواب بھی بلبلے جیسا تھا تو کیا قائم رہ پاتا۔ اس کی آنکھ کی تہہ میں کہیں مٹ چکا تھا۔ اس نے عجب سی کیفیت میں گھر کے ایک گہرا سانس لیا۔

"ہاں مجھے یاد آرہا ہے کہ کل فارہ کی سالگرہ ہے شاید۔" اس نے اپنے ہی ادا کردہ لفظ (شاید) کو جیسے کان لگا کے سنا تھا۔ کچھ یقین تھے جن کی موم شمعیں رات کے کسی پہر خود بخود جل اٹھتی تھیں۔ وہ اس کے لہجے کے سرد پن کے برعکس بھی کچھ پرجوش سی ہوئی۔

"تو پھر کل یوں کرتے ہیں۔ میرے پاس اگلے ایک ہفتے تک بہت آڈرز ہیں بچی کی پہلی فلم ریلیز ہونے والی ہے ایک دو روز تک پھول منڈی میں بہت بڑی تقریب متوقع ہے ان شاء اللہ پھر بات ہوگی۔" وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل اپنی سنا کے خدا حافظ تک کہہ چکا تھا۔ مصباح کو اس کے رویے پر تاؤ آیا۔ اب وہ خاموش فون کو بری طرح گھور رہی تھی۔ اس کا دل بھی فون کی مانند خاموش ہوا۔ آج کل اس کے حسب منشا کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

بہروز علی کے گھر پر شام نیلگوں رنگ سمیٹے چھا چکی تھی۔ گو اندھیرے کی رفتار ابھی مدہم تھی۔ اس گھر کی مالکہ نے پھر بھی صحن کی تمام بتیاں جلا دیں تھیں۔ کچن میں ایک پرسکون قسم کی کھٹ پھٹ تھی۔ کچن میں مصباح کی موجودگی ایک محسوس ہوتے شور کا منبع ہوتی تھی۔ گھر میں اس کے قدموں کی آہٹ جیسے جابجا شوریدگی بانٹتی تھی (شور) وہ شور بہروز کو اکثر چبھتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ جب تک وہ لفظوں کے تانے بانے بنتا وہ ادھر ادھر ہو چکی ہوتی۔

اس وقت بھی گھر میں چھائی خاموشی سے پتا چلتا تھا کہ ان دونوں کے علاوہ گھر میں تیسرا کوئی نہیں...... بہروز نے قریب سے آتی نرم آہٹوں پر پلٹ کے دیکھا۔ اس کی بیوی چائے لے کر آرہی تھی۔ وہ بیٹی کی غیر موجودگی محسوس کر چکا تھا۔ اس لیے بیوی کے بیٹھتے ہی اس کے متعلق استفسار کیا۔

بیوی نے اسے دھیان سے دیکھا۔ شوہر کی آنکھوں سے بے چینی مترشح تھی۔

"مجھے اتنا ہی بتایا ہے اس نے کہ کسی اکیڈمی میں ایڈمشن کے سلسلے میں جا رہی ہوں۔" اس نے شوہر کو مختصر جواب دیا اور کپ میں چائے انڈیلنے لگی۔ "ہم نے اسے باقی زندگی پڑھاتے ہی رہنا ہے۔" بہروز کا لہجہ...... ہاتھ میں پکڑی چائے سے زیادہ گرم تھا۔ اس کی بیوی عذرا نے اس پر اک خاموش نگاہ ڈالی اور ٹرے میں موجود رومال سے ڈھکی پلیٹ کو دیکھا۔

"اس بار میں قصور گیا تھا تو بھابھی نے مجھ سے ایک رشتے کا ذکر کیا تھا کہ لڑکا پڑھا لکھا اور اچھے کاروبار کا مالک ہے، سب سے بڑی بات کہ ہماری طرح کمبوہ ذات کا بھی ہے۔" وہ بات مکمل کر چکا تو بیوی کی غائب دماغی محسوس کی۔ جو صحن میں پھرتی مرغیوں کی طرف متوجہ تھی مگر وہ غائب دماغی جیسی کیفیت میں نہیں تھی، وہ سن رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی کہ وہ شخص ایک باپ ہونے کے ناتے درست کہہ رہا تھا۔ اس نے کافی دیر بعد بہروز کو یوں دیکھا جیسے وہ آج کئی برسوں بعد گھر آیا ہو۔ جیسے وہ اپنی اکلوتی اولاد کی طبیعت اور مزاج سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔

"آج کل لڑکیاں اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے خواب دیکھتی ہیں بہروز صاحب۔" اس نے اندرونی بے چینی کے برعکس مسکرا کے بات کی۔ وہ جو سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھا ایک حیرت کے ساتھ سیدھا ہوا۔

"اس نے جتنا پڑھ لیا بہت ہے یہ بات اسے اچھی طرح سمجھا دو۔" بہروز نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر۔ کٹ کٹاک کرتی مرغیوں پر اک قہر آلود نگاہ ڈالی۔ جبکہ اس کی بیوی کے چہرے پر اک سکوت چھا چکا تھا۔ وہ ایک سادگی پسند نرم خو عورت تھی جو پانچوں وقت کی نماز وقت پر ادا کرتی تھی، وہ گھنٹوں اپنی بیٹی کی اچھی قسمت کی دعائیں مانگتی تھی۔ جس نے شاید بے خبری میں کہیں سے ڈھیروں کے حساب سے دھوپ خرید لی تھی کہ اس کی ذات میں رات کی سی ٹھنڈک مفقود تھی۔

اس کے چہرے پر چھایا سکوت کچھ وقت کے لیے تھا۔ آج اس نے خاموشی اختیار نہیں کرنی تھی۔

"وہ لڑکی جو مصباح بہروز علی ہے اسے منانا، سمجھانا۔ میرا، تمہارا یا پھر چند انسانوں کا کام نہیں، تمہاری بیٹی کو سمجھانے کے لیے ہزاروں افراد بھی کم پڑ جائیں گے۔" وہ خاموش ہوئی تو ماحول پر ایک سکوت سا چھا گیا۔ بہروز نے سہمی ہوئی مرغیوں سے نگاہ ہٹا کر بیوی کو کٹیلی نگاہ سے دیکھا جو شوہر کے بجائے اس پالتو بلے کو گھور رہی تھی۔ جس نے مالک کا اشارہ پا کر اس کی معصوم مرغیوں پر وحشت طاری کر رکھی تھی۔ بہروز کے چہرے پر لالی چھلکی۔

"کیا یہ تمہاری تربیت کی ناکامی ہے۔" اس کا طنزیہ لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر ایک دوسرے کو دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ مرد کیسے خود کو روشنی میں رکھ کر...... عورت کو ایک تنگ راہداری میں کھڑا کر دیتا ہے۔ جس کے آگے گھپ اندھیرا ہوتا ہے۔ اس کی بیٹی کی آنکھوں میں باپ کو دیکھتے ہی ایک ہرا بھرا درخت روز کٹ کے گر جاتا تھا۔ اسے یہ سائبانی پسند تھی۔ بیٹی کی خودسری کی وجہ باپ کا طرز زندگی تھا۔ کس قدر حوصلے سے کہہ رہا تھا کہ یہ تمہاری تربیت کی ناکامی ہے۔ وہ زبردستی مسکرائی اور رومال سے ڈھکی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"آپ کو پریشان ہونے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں میں نے اپنی بیٹی کی تربیت ایسی کی ہے کہ وہ ثواب اور گناہ کا فرق سمجھتی ہے۔ وہ خودسر ضرور ہے مگر متکبر نہیں۔ اس لیے اس کا عروج بے زوال ہوگا۔" اس نے مودبانہ انداز میں بات ختم کی اور قریب پڑی چپل اٹھا کر بلے کا نشانہ لیا۔

"تمہاری ان ہی باتوں نے اسے چڑھا رکھا ہے۔" بہروز نے اسے کینہ توز نگاہوں سے دیکھ کے خود ہی پلیٹ سے رومال ہٹایا۔ جس میں خوش رنگ مٹھائی تھی۔

"ابھی وہ اس گھر کی بیٹی ہے اس لیے سر چڑھی ہوئی ہے جب کسی کی بیوی بن جائے گی تو اسے پاؤں کی جوتی بنتے دیر نہیں لگے گی۔" وہ اس کے زہریلے مگر سرد لہجے پر ٹھٹکا۔ بیوی کی اس بات نے اسے تکلیف سے دوچار کیا تھا اور وہ یہ تکلیف ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے بلے پر بھی غصہ آرہا تھا جس نے چپل کھا کر مرغیوں کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے گلاب جامن اٹھایا۔ بیوی کے پیر کی جوتی والے جملے نے اس کا دل اچھا خاصا جلایا تھا اور وہ ادھار رکھنے کا قائل نہیں تھا۔

"تمہاری سہیلی نے اپنی بیٹی کی شادی کی خوشی میں بھیجی ہوگی۔" کیا تمسخر اڑاتا، کسی کی عزت اچھالتا ہوا سا لہجہ تھا کہ آج پہلی بار اس عورت کی اپنی آنکھوں میں بھی اس شخص کی نسبت کا ایک ہرا ابھرا درخت کٹ کے گرا۔ عذرا کے دل پر چابک پڑا۔

"استغفار...... متکبر لوگوں کا عروج بے زوال نہیں ہوتا۔" اس نے چائے کے برتن سمیٹتے ہوئے دکھتے دل کے ساتھ سوچا تھا۔

☆☆☆

آج چوتھے دن بھی اس کیفے ٹیریا کی ایک ٹیبل سنبھالے وہ مایوسی بھرے انداز میں سوچ رہی تھی کہ آج بھی اس کے حسب منشا کچھ نہیں ہونے والا۔ آج اس کا دل اس غریب بچے کی طرح رونے کو چاہ رہا تھا جس کے پاس ادھوری خواہشوں کا ایک انبار جمع ہو چکا تھا۔ وہ آج گھر سے تہیہ کر کے آئی تھی کہ اسے اس کیفے ٹیریا کے بند ہونے تک یہیں بیٹھنا ہے۔ آج اس کا باپ کاروبار کے سلسلے میں یا خدا جانے کس سلسلے میں شہر سے باہر جا چکا تھا۔ اور اس نے اب ماں کو تمام حقیقت بتانے کا سوچ رکھا تھا۔ وہ تین دنوں سے کسی کے انتظار میں جل جل کر اپنی انا کا غبار کتنی ہی دفعہ دھو چکی تھی۔

"وہ شخص ایک بار اسے نظر آجاتا تو وہ جست لگا کر اس کا گریبان پکڑ لیتی۔ اس کا دل سناٹوں میں اترا۔ اگر وہ واقعی مالک تھا تو پھر روز ہی آتا ہوگا اور اگر وہ بلاناغہ آرہا تھا تو اسے یقین تھا کہ وہ اس کی شکل دیکھتے ہی ادھر ادھر ہو جاتا تھا۔ اب تو ویٹرز بھی اسے دیکھ کے معنی خیزی سے مسکراتے تھے تو اس کی سانس جیسے اندر ہی گھٹ کے رہ جاتی تھی۔ اس کے غرور اور انا کے گرد اک غبار سا اڑنے لگتا۔ آج تو اس کے غرور کے قتل تک ہو چکے تھے۔ اس لیے رات اس نے بہت سوچا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو کسی بھی گلی کوچے میں قدم رکھتے ہیں تو وقت وہاں مشعلیں روشن کر دیتا ہے، سر جھکا کے کھڑا ہوتا ہے۔ تعظیم پر اتر آتا ہے اور ڈھیر سارا سوچنے کے بعد اس نے یہ حقیقت جان لی تھی آج وہ چادر کے بجائے شیفون کا قیمتی دوپٹا لیے تھی، وہ بریزے کا اسٹائلش سوٹ پہنے تھی، اس نے اپنے خوبصورت سیاہ بالوں کی پونی کر رکھی تھی۔ نفاست سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ اس کا فیشل زدہ چہرہ جگمگا رہا تھا۔

ٹیبل کے وسط میں پڑا اس کا کلچ قیمتی اور اسٹائلش تھا۔ آج وہ اس حساب سے بیٹھی تھی کہ دونوں ہالز کے کاؤنٹر اس کے عقب میں تھے مگر فاصلے پر نہیں تھے۔ وہ اک ذرا اسٹائل سے گاہے بہ گاہے عقب میں بھی جھانک لیتی تھی۔ سب سے خاص بات کہ آج وہ اکیلی تھی وہ ماں کو اپنی ایک دوست کی شادی میں شرکت کا کہہ کے آئی تھی۔ وہ آج جب کیفے ٹیریا میں داخل ہوئی تو اسے اپنے پہچانے جانے کا اندیشہ تک نہیں تھا۔ اس نے کیفے ٹیریا سے ملحق فلاور شاپ سے ایک بکے بھی خرید لیا تھا۔ اب وہ اعتماد سے بیٹھی جیسے اپنے کسی دوست کی منتظر تھی۔

☆☆☆

آج سالم امین نے کاؤنٹر کی نشست سنبھالتے ہی ایک ساتھ کئی خوش گوار سانس لیے۔ آج اس کے ہمراہ اس کا قریبی دوست ارحم بھی تھا۔ اس نے اپنے اور ارحم کے لیے کافی کا آرڈر دیا۔ اور ہال پر اک گہری نگاہ ڈالی تو مزید مطمئن ہوا۔ جبکہ اس کا سینئر ویٹر شان، صاحب کی اس ادا پر کھل کے مسکرایا۔ سالم نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے اس سے اشارتاً پوچھا

کے لہجے کی شوخی اور آنکھوں سے جھلکتی شرارت پر وہ پہلے تو کچھ سمجھا ہی نہیں۔ اور جب شان کے دوسرے واضح اشارے پر گردن گھما کے دیکھا تو ساتھ ہی دماغ بھی گھوما۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔اس کی حیرت گہری ہوئی۔اس کا ویٹر شان واقعی زیرک تھا کہ یہاں اس کی جاب ہی کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرتا تھا۔ اس مصباح نامی لڑکی کے خیالات کا سلسلہ اس کی نگاہ کے ارتکاز سے ہی ٹوٹا تھا۔اس کی نظریں سالم کے وجود کے آر پار ہوئیں۔

''او...... تو......'' سالم نے چہرہ دوسری جانب موڑا۔

''تم پریشان کس بات پر ہو رہے ہو۔'' ارحم نے اسے تفکر سے دیکھا۔

''یار ایک بی بی اپنے کسی مسئلے کی وجہ سے میرے پیچھے پڑی ہے۔'' پھر اس نے مختصر طور پر ارحم کو تمام کہانی کہہ سنائی۔ سب کچھ سننے کے بعد وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

''تم یوں کرو۔ اس کی کہانی پر مٹی ڈال کے اس کے ساتھ اک نئی کہانی شروع کرو۔'' ارحم کے لبوں پر شوخ مسکراہٹ ابھری۔

''مطلب کیا......'' اس کی آواز میں اک دلچسپی سی جھلکی۔

''مطلب یہ کہ لڑکی کو پٹانے کی کوشش کرو۔ اس کی سننے کے بجائے اسے اپنے دل کی جھوٹی موٹی کہانیاں سناؤ۔'' اس نے دھیمے اور مسکراتے لہجے میں کہا تو سالم کی دلچسپی کے تمام رنگ پھیکے پڑے جو اس کے چہرے پر بھی واضح تھے۔

''دیکھو اگر لڑکی واقعی اچھے کریکٹر کی ہوئی تو دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرے گی۔'' اس نے سنجیدہ بیٹھے سالم کو نہایت کارآمد گر بتایا تھا۔

''اور بالفرض وہ تجھ پر لٹو ہو بھی جاتی ہے تو چار دن ہوٹنگ شوٹنگ کرا کے جان چھڑا لینا۔'' وہ بدک کے پیچھے ہٹا اور ارحم کو یک ٹک دیکھے گیا۔

نے مصباح کی طرف بھی ذرا سا دیکھا تھا۔ ارحم کا قہقہہ فلک شگاف تھا۔

''صاف لگ رہا ہے تو کہ تو تو سوچ بھی چکا ہے۔''

سالم جھینپ کے مسکرایا۔

''اب میرے طلب گاروں کی لسٹ اتنی بھی نہیں۔'' اس نے وہاں سے اٹھتے ہوئے ارحم کو بلاوجہ گھورا تھا۔

''کیا کہنے یار...... دامن بچاتا ہے ہی کیے ہیں کہ خود سالم امین کسی کا بھی طلب گار نہیں' ہر کوئی اس کے پیچھے پڑا ہے۔'' ارحم کافی چڑتے ہوئے اپنے دوست کی اس بات کو خوب انجوائے کر رہا تھا۔ اس نے یونہی پلٹ کے دیکھا اس کے انداز کی لاپروائی بھک سے اڑی۔ اس کا دوست' جس لڑکی کے مقابل بیٹھ رہا تھا' وہ اسے کئی برسوں سے جانتا تھا۔ ارحم کی حیرت کا قد آسمان کو چھونے لگا وہ مصباح بہروز کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکی یونیورسٹی میں سب کے لیے خود ایک مسئلہ رہی تھی اب وہ خود ایک برائے پھندے میں پڑ کے سالم امین کے پیچھے پھر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ چھت پر جاتی سیڑھیوں کی سب سے اوپری سیڑھی پر منڈیر کی اوٹ میں بیٹھی ہے۔ وہ اڑتے پرندوں کو ڈوبتے سورج کو ڈھلتی شام کو آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھتی ہے۔ وہ ایک آسودہ سانس بھر کے مسکراتی ہے۔ ہر چیز شفاف ہے پھر وہ سیڑھی سے ملحق ننھی منڈیر کے ننھے جھروکوں سے آنکھیں چپکاتی ہے اس نوخیز عمر میں آگاہی کی سرگوشیاں عجب ہوتی ہیں۔ کچھ سرگوشیاں گھونگھٹ ہٹا کے ہلکا سا رخ دکھاتی ہوئیں' کچھ پورے وجود کے ساتھ سامنا کرتیں۔ وہ اب گلی میں کھیلنے کے بجائے ان ننھے مورچوں کو سنبھال کے گھونگھٹ میں چھپی حقیقتوں کو پہچاننے کی کوشش کرتی تھی جبکہ اس عمر میں نوخیز لڑکیوں کی آنکھیں چمکتے چاند پر نثار ہوتی ہیں مگر وہ گلی کے ملگجے

بھی ہے جو گلی میں کھڑی ایک پختہ عمر کی عورت بھی تک رہی تھی۔

گلی میں گہما گہمی ہے' آپس میں کھیلتے نوعمر بچیاں اور بچے ابھی بچپنا ہی کھیل رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں شام ہماری۔ رات تمہاری' سارے تارے میرے۔ آدھا چاند تمہارا۔ وہ الجھ رہی ہیں۔ وہ خوبصورت آوازیں۔ صرف وہ جانتی ہے کہ گلی کی نکڑ پر پرچون کی دکان کا مالک حاتم جو بوڑھا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کی آنکھیں جوان ہیں۔ جب مائیں دروازوں میں کھڑی ہو کر آواز لگاتی ہیں' بہت دیر ہوگئی گھر آجاؤ۔ پھر بچوں کے باپ گلی میں آجاتے ہیں' صرف وہ جانتی ہے کہ وہ اپنی اپنی بچیوں کے بجائے دوسروں کی بچیوں کو چھوتے تھے' بچیاں اس انجان لمس سے چونک جاتی تھیں۔ سیڑھیاں جیسے سرکنے لگتیں۔

پھول منڈی کے بچے وہاں ہوتے تھے اس منڈی کے مرد وہاں نہیں ہوتے تھے پر وہ مرد کون تھے جو اردگرد آس پڑوس میں رہنے والی نوعمر بچیوں کو خود سے لپٹا لیتے تھے۔ وہ حاتم کو دیکھتی تھی جو لڑکیوں کو سودا دیتے وقت ان کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا' وہ دیکھتی ہے۔ ارے تمہاری فراک کے بٹن کس قدر خوب صورت ہیں' حاتم تاشہ کی فراک پر ہاتھ رکھتا ہے جھروکے سے چپکی آنکھوں سے ننھے شعلے لپکتے۔ ایک' دو' تین وہ گلی کی سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتی' ماں پیچھے سے پکارتی رہ جاتی ارے واپس آؤ اب تم بڑی ہو چکی ہو۔

☆☆☆

مصباح نے اسے اپنی جانب آتے دیکھا اس شخص کی پرسکون چال دیکھ کے اس کے صبر کو جیسے کسی نے چھوا تھا لیکن اشتعال کام بگاڑ سکتا تھا۔ وہ قریب آیا۔ اور اس لڑکی کی نگاہ کے سپاٹ ارتکاز پر ہلکا سا چونکا' اس نے ایک ہاتھ سے کرسی پیچھے دھکیلی پھر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے ٹیبل پر رکھے بکے اٹھانا چاہا۔ جسے مصباح نے اپنی طرف کھسکا لیا تھا وہ

ہلکی آواز میں مخاطب کیا۔

''کیسی ہیں آپ۔'' وہ بس خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھے گئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ ''میں جیسی بھی ہوں مجھے دیکھو اور جان لو۔ کہ رانجھے نے کان چھدوا کے اس میں ایک بالی ڈال لی تھی۔ تو بس ثابت ہوا کہ وہی بھیس بدلتے ہیں جو شہر محبت میں بھٹکتے ہیں۔'' اس نے شیفون کے دوپٹے کو سر پہ ٹکانے کی کوشش کی۔ پھر پلکوں کو جنبش دی۔ وہ کیسی تھی اسے یہ بتانے سے غرض نہیں تھی۔

''آپ کو بتانا چاہیے تھا کہ آپ کون ہیں۔'' وہ اس کی خوش رنگ آنکھوں میں جھانک کے مخاطب ہوا۔ تو اس کے لہجے میں جیسے نیند سی پنہاں تھی۔ مصباح کی نگاہ میں سرد مہری تھی۔ گلہ تھا کہ درد وہ سمجھنے سے قاصر ہوا۔ وہ یوں احتیاط سے گھور رہی تھی جیسے وہ نظر موڑ لے گی تو وہ غائب ہو سکتا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ ''میں وہ ہوں کہ اس لمحے جس کی انا' جس کا غرور ایک اعلیٰ نسل کے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کے کہیں میری راہ دیکھ رہا ہے۔ میں وہ ہوں جو غلام گردشوں کے باسیوں کو چند نذر شمعیں تھما آتی ہوں جو کبھی مدھم نہیں پڑتیں میں وہ ہوں جو بھیس بدل کے کشادہ ایوانوں کی راہداریوں پہ قدم رکھ دوں تو سلطان قصر اپنا تخت و تاج میرے نام کر دیتا ہے۔'' لیکن اس نے بس اک بوجھل سا سانس ہوا کے سپرد کیا۔

''آپ پوچھیں گی نہیں کہ میں گزشتہ تین روز سے۔'' وہ جملہ مکمل کیے بنا جیسے جھینپ کے کھنکھارا تھا۔

''آپ سے اللہ پوچھے گا۔'' اس نے یہ جواب بے ساختہ دیا تھا۔ یعنی اس کی تین روزہ غیر حاضری کا جرم اس پر لاگو کر کے اسے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا۔ وہ بظاہر اچھے موڈ کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ کے بولا تو لہجہ بھی مستحکم ہی تھا۔

''چلو گزشتہ زندگی کی بچت کے ساتھ' اگر ان تین دنوں کی پوچھ گچھ ہوگی تو مجھ سے پھر میں پکا جنتی ہوں۔'' مصباح کی رگوں میں خون نے ابال کھایا۔

کی تمام زندگی پر بھاری ہو۔" اس نے اس شخص کے لبوں پر ٹھہری مسکراہٹ کو ایک بددعا کے ساتھ اڑانا چاہا تھا۔ سالم کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب اور وہ لمحوں میں سنجیدہ ہوا۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ یہ لڑکی تنی گردن اور شکن آلود پیشانی کے ساتھ اپنی مٹھیوں میں لاچاری اور بے بسی بھینچ کے بیٹھی ہے۔ چند گھڑیاں اسے بغور دیکھنے کے بعد جب وہ بولنا شروع ہوا۔ تو وہ حیران ہوئی۔ اور اس قدر کہ نگاہ اس کے چہرے پہ جم کے رہ گئی۔ وہ ایک ایک چیز کی وضاحت کرتا ان کے متعلق اس قدر معلومات رکھتا تھا۔ مصباح علی ولد بہروز ولد رحمت علی۔ وہ بالکل ساکت بیٹھی تھی۔

کچھ دیر گزری اور مصباح کو ماننا پڑا کہ بقول طلحہ کے یہ شخص واقعی کام کی چیز تھا۔ یہ بڑے اثر ورسوخ کا مالک تھا اور اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔

"میری ناقص عقل کے مطابق یہ ایک عام سی لو اسٹوری ہے۔ پھر بیچ میں ظالم سماج، اور پھر رسموں رواجوں پر لعنت بھیجتے ہوئے دونوں کا گھر سے بھاگ جانا۔" وہ کندھوں کو لاپروائی سے اچکاتا خاموش ہوا۔ "اس لڑکی کے ماں باپ کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تو آپ نے اسے دردِ سر کیوں بنا رکھا ہے بی بی خوش رہیں اور ہمیں بھی خوش رہنے دیں۔" وہ ارحم کی نصیحتیں یکسر بھلا چکا تھا' اس نے ٹیبل پر موجود گاڑی کی چابی اٹھائی۔ وہ ایک دم پریشان ہوئی جیسے وہ اگلے لمحے اسے دروازے سے باہر کھڑا دکھائی دیا تھا' اسے فیصلہ کرتے بس ایک لمحہ لگا اور اس نے جو بات کی تھی تو سالم امین اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے ٹھٹک کے رکا۔

☆☆☆

وہ گھر میں دبے پاؤں ہی آیا۔ صحن میں مکمل خاموشی جبکہ چھت پر ہلڑ بازی مچی تھی۔ ماں یقیناً کچن میں تھی۔ آج موسم بھی خراب تھا' کچھ تھکاوٹ بھی محسوس کی تو وقت سے پہلے دکان بند کر کے چلا آیا۔ ...

عروج پر تھی کہ کل گلی میں فارہ سے اس کا سامنا ہوا۔ تو وہ اک نگاہ ڈالے بنا قریب سے گزر گئی تھی۔ یعنی وہ ناراض تھی کہ طلحہ نے اسے فون پر بھی مبارک باد نہیں دی تھی۔ وہ لاتعلقی کی حد ہی تو پار کرنا چاہتا تھا پھر یہ بے کلی کیسی تھی۔ کہ دل آنکھوں کی نمی سا بھیگ رہا تھا۔

مصباح کے ساتھ فارہ ان کے گھر کبھی کبھار ہی آتی تھی۔ آتی تو وہ یہاں دردِ دل کی دوا لیتے تھی لیکن طلحہ نے طبقاتی اونچ نیچ کی آگاہی پا کر وہ دکان جلد ہی بند کردی تھی وہ اس فارہ کو اب محتاط نگاہ سے دیکھتا تھا جو اس محلے کے سب سے دولت مند شخص کی بیٹی تھی۔ وہ بارش ان کا لڑکپن ڈھلنے کے ساتھ ہی خواب ہو چکی تھی کہ پانی سنگ خواب باندھ کے جس میں وہ بھیگا کرتے تھے طلحہ کسی دن حقیقت کی تیز دھوپ میں وہ خواب جھلساتی دھوپ کی نظر کر چکا تھا مگر فارہ آج بھی بارش میں ان خوابوں سمیت بھیگی تھی' اس نے تھکے ہوئے انداز میں سانس بھر کے تکیہ درست کیا۔

"میرے حصے میں ایک بوٹی بھی نہیں آئی۔" یہ چنگھاڑتی آواز ویدو کی تھی' طلحہ کے ماتھے پر ایک موٹی سی شکن ابھری۔ اس نے لیٹنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔

"اب دن بھر کے تھکے ہارے طلحہ کو میں صرف آلو مٹر پیش کروں گی؟" اس کی ماں نے ویدو کو بوٹی نہ دینے کا جواز دینے کے ساتھ ہی شاید گرم چمٹا اس کے ہاتھ پر مارا تھا جس کے نتیجے میں ویدو کی ہائے ہائے خاصی بلند تھی۔

"ہم چاروں بڑے اس چھوٹے سے گھر اور نکمے باپ کے لیے کیا کم تھے بعد میں ہادو، گڑیا اور سنبل کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

"اللہ...... یہ ویدو......" طلحہ کے کان سرخ ہوئے۔ ویدو نے اپنے نایاب خیالات کا اظہار کرتے ہوئے گڑیا کو زور کی دھپ لگا کر گرم چمٹا پڑنے کا بدلہ لے لیا تھا جس کا بھوپوں زور سے بجنے لگا۔

"ابا کو ان تین منحوسوں کے بعد ہی گھر بدر ہونا چاہیے تھا ورنہ۔ ...

سپنس تھا۔

"ورنہ کیا۔" اماں بھی شیرنی کی مانند دھاڑی، اور اگلے پل طلحہ کو کچن کے دروازے پر دیکھ کر وہ سب کے سب گیدڑ بن چکے تھے۔ طلحہ نے ویدو کو سرخ آنکھوں کے ساتھ گھورا۔ اور آٹھ سالہ گڑیا کا ہاتھ پکڑ کے اسے صحن میں لے آیا۔ کچھ دیر بعد اس سے چھوٹے امان نے اس کے سامنے میز رکھی تو اس کے پیچھے ہی اس کی ماں کھانے کی ٹرے لیے چلی آئی۔ "ایک تو آج گھر میں چوروں کی طرح ہی آئے اور پھر سیدھا کمرے میں چلے گئے۔" وہ خفت میں مبتلا تھی کہ آج ان کے اچھے رویوں کا ڈرامہ فلاپ ہو چکا تھا۔ جو وہ سب طلحہ کی موجودگی میں ایکٹ کرتے تھے۔ اس نے ماں کی بات کا جواب دیے بنا پلیٹ میں موجود بوٹی کو گھورا۔

"اماں میں آپ سے سو دفعہ کہہ چکا ہوں کہ ایک وقت میں آنے والے گوشت یا سبزی کی ایک ہی ہانڈی بنایا کریں۔ آج بوٹی کی اس کی باری کل فلاں کی باری۔ آپ کے اسی وطیرے سے سب بے صبرے پن کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح ماں سے نرم لہجے میں ہی مخاطب تھا۔

"دو کلو بھی اکٹھا پکالوں تو ان بچوں کے پیٹ نہیں بھرتے۔" وہ کھسیاہٹ کا شکار ہوئی مگر ہار نہیں مانی۔

"ہم پاکستانی سیاست دان نہیں ہیں اماں۔" ویدو کی خاموشی ایسی ہی تھی کہ کیل کانٹوں کے پاس غباروں کو چھوڑ دیا جائے۔

"آپ کو برا لگے گا مگر آپ کی بے جا بحث نے اسے زبان دراز کیا ہے۔" اس نے ویدو کو ڈانٹنے کے بجائے ماں کی اصلاح کرنا چاہی تھی۔ جو جز بز سی ہورہی تھی۔

"جب گھر کے حالات دگرگوں ہوں تو منہ میں گڑ بھر کے بات نہیں کی جاسکتی طلحہ۔"

"آپ کی ایسی ہی باتوں سے بچے شکر کے معنی بھولتے جارہے ہیں۔ اور یاد رکھنا اماں جہاں ...

... اسے آج حقیقتاً رنج پہنچا تھا کہ اس کی موجودگی میں سب اچھا ظاہر کرنے والے پس منظر میں ایک دوسرے پر جوتے اور بیلنا اچھالتے تھے۔

"اس گھر میں کچھ ایسا ہے کہ جس پر شکر کیا جائے۔" اف اس قدر خالی خولی لہجہ اور کفر کی حد کو چھوتی بات، جیسے گھر بار پانی، ہوا، وہ چاندنی رات، ہر چیز غائب ہوں کہ خدا کی ہر نعمت جھٹلا دی گئی تھی۔ وہ بیابان میں کھڑا تھا اس نے آنکھیں پھاڑ کے ماں کا غصے سے تپا چہرہ دیکھا۔ "یہ گھر' یہ عزت' یہ صحت، یہ رزق، وہ بھی حلال اور محنت سے کمایا ہوا۔ شکر کرنے کے لیے اگر یہ سب کم ہے تو اتنا کافی نہیں کہ آپ کے سامنے آپ کو زمانے کے سرد گرم سے تحفظ دینے والا جوان بیٹا موجود ہے۔" اس بات پر اس کی ماں کی نگاہ اچانک جھکی تھی۔

"شکر اس بات پر بھی کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی ساتوں اولادیں صحت مند ہیں۔ صد شکر کہ آپ کو کسی بیمار یا معذور کی پٹی سے لگ کر نہیں بیٹھنا پڑتا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے اماں دین وہی قائم ہے جہاں شکر قائم ہے ایک عورت ایک بیوی میں شکر گزاری بھلے نا ہو۔ مگر ایک بچوں کی ماں میں یہ جذبہ بے حساب ہونا چاہیے پر گھر میں موجود تمام نعمتوں کا شمار۔ شمار سے باہر ہو جاتا ہے۔" اس نے گڑیا کو اپنی گود سے اتارا۔ اور لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔

"حالات جیسے بھی ہیں اماں۔ مگر منہ میں گڑ رکھا جاسکتا ہے۔" ویدو نے ماں کی طرف گڑ کا ڈھیلا بڑھایا جو کسی خیال میں کھوئی اس کی ماں نے پکڑ بھی لیا۔

"دیکھنا بچو! اب ماں شام تک میٹھی میٹھی باتیں کرے گی۔" وہ پلیٹ کے باقی بہن بھائیوں سے مخاطب ہوا۔ طلحہ کی ماں کے اندر اک دیوار سی گری تو دوسری جانب ایک منظر سا واضح ہوا۔ اس کا پڑھا لکھا شوہر ناکارہ نہیں تھا۔ آفس میں اس کے چند کولیگز نے کوئی فراڈ کیا تھا تو ساتھ اس کا نام بھی اچھالا جانے لگا یوں اس کی ختم نوکری گئی پھر اس کی لاکھ کوششوں

...ان دنوں ان کے شوہر کو نکمے پن کے طعنے مار مار کے اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ آج حافظ کھنگالنے پر اسے تسلی کے چند الفاظ بھی یاد نہیں آئے جو برے دنوں میں اس کے شوہر کے لیے ڈھارس اور حوصلے کا باعث بنتے۔ ان کڑے دنوں میں وہ صبر کا ہلکا سا مظاہرہ بھی نہیں کر پائی تھی۔

ان ہی دنوں طلحہ نے اسکول چھوڑ کر سگریٹ پان کی دکان سنبھال لی تھی اور پرائیویٹ امتحان دیتا رہا تھا وہ شروع سے ہی باادب اور صابر و شاکر تھا تو اللہ نے اس کی کمائی میں برکت بھی خوب ڈالی تھی اس کا ایم اے انگلش باپ پان کی دکان چلانا اپنی بے عزتی سمجھتا تھا۔

"بیٹے کی کمائی پر روٹیاں توڑتے شرم نہیں آتی۔" وہ دن رات بیوی کے اس قسم کے طعنوں سے تنگ آ کر گھر سے خاصا دور اک درگاہ پر جا بیٹھا۔ جہاں تین ٹائم مفت کا کھانا مل جاتا تھا اگرچہ وہ مانگتا نہیں تھا پھر بھی کچھ لوگ اس کی جھولی میں خیرات ڈال جاتے تھے۔ اس سے ملنے زیادہ تر وید و جاتا تھا۔ وہ کئی سوغاتوں کے ساتھ واپس آتا جو اس کی ماں اپنا حق سمجھ کے وصول کرتی۔ اور بیٹے کے ہاتھ میں شوہر کے میلے کپڑے دیکھ کے سو صلواتیں سناتی جو ہمیشہ وید و یا ارمان دھوتا تھا۔ طلحہ کی ہزار منتوں کے باوجود اس کا باپ ہمیشہ گھر آنے سے انکاری ہوا۔ اب تو طلحہ نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

اس کے منہ میں گھلتے گڑ کا ذائقہ اچانک نمکین ہوا۔ تو خیالات کا سلسلہ ٹوٹا اور وہ چونکی۔ کیا وہ رو رہی تھی۔ کاش وہ کڑے دنوں میں صبر کا مظاہرہ کر پاتی تو اس کا شوہر آج دوبارہ کسی اچھی پوسٹ پر ہوتا۔ کیا خبر آج طلحہ بھی ایک آفیسر ہوتا۔ دنیا میں ہر چیز پیسے کے بغیر نہیں ملتی مگر اچھے رویے اور زبان کی خوب صورتی خریدنے کی چیزیں نہیں ہوتیں۔

☆☆☆

"آپ میری پوری بات سنے بغیر یہاں سے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے ٹھٹکا۔ ان رات جیسی آنکھوں میں وہ حکم پلکوں کی نوک پر جم کے کھڑا تھا۔ باادب با ملاحظہ، جو یہاں خیمہ زن ہے اب وہ آراستہ خواب گاہوں کے آرام بھول جائیں۔" وہ اپنی کرسی پر دوبارہ ٹکا۔ اسے ارحم کا مشورہ بروقت یاد آیا جسے وہ کچھ دیر پہلے رد کر چکا تھا۔ اس نے کسی ہیرو ہی کی طرح آستینیں موڑیں اور ٹیبل پر کہنیاں ٹکائیں۔ اس لڑکی کا انداز کسی قد آور ستون جیسا ہی تھا۔ وہ اپنی نہایت مناسب آنکھوں کو بھینچتے ہوئے کچھ آگے جھک کے بولا۔

"آپ کی اچھی بھلی زندگی کو جو بات ڈسٹرب کر رہی ہے میں اس کی تفصیل سننے کو بالکل تیار ہوں۔" بلکہ وہ ایک اسٹائل سے مسکرایا۔

"میں اس وقت دنیا کا فارغ ترین انسان ہوں۔" وہ اپنے تمام تر نقلی جذبات آنکھوں میں رکھ کے مسکرایا۔ اس نے مصباح کے چہرے پر اک تناؤ کی سی کیفیت دیکھی۔ ان دونوں نے کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھا۔ جیسے دو افراد کسی پاگل خانے سے بھاگ کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں۔ وہ جز بز سا ہوا کہ وہ اس کے رومانٹک انداز پر نہ شرمائی تھی۔ نہ گھبرائی تھی بلکہ اسے متنفر کر رہی تھی کہ اپنی آنکھوں کا رویہ سخت رکھو۔ پھر وہ پانی کے دو گھونٹ پی کے اس سے مخاطب ہوئی۔

"جگنو نے گھر سے بھاگ کے شاید ٹھیک ہی کیا۔" وہ اس کی بات پر ایک دم سیدھا ہوا۔ "اور میری اچھی بھلی زندگی کو یہ بات ڈسٹرب کر رہی ہے کہ میں بے خبر ہوں کہ ان کا نکاح ہو چکا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہوا۔ تو وہ ایک نامحرم کے ساتھ رہ رہی ہے یہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہے۔" مصباح نے چند گہرے سانس لیے اور آنکھوں میں اترے پانی کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔

"اس دنیا کے فارغ ترین انسان سے میری صرف اتنی درخواست ہے کہ ایک بار وہ جگنو کو یا تال سے بھی ڈھونڈ کے میرے مقابل لے آئے۔" اسے پانے کی کوشش میں لگا وہ بندہ اب متحیر بیٹھا تھا۔ اگر وہ رب نواز سے معلومات نہ لے چکا ہوتا تو یقین سے کہہ سکتا تھا وہ لڑکی کسی پاگل خانے سے بھاگی ہوئی ہے جو بھی قصر کے باغ میں چہل قدمی کرتی۔ اسے خیمہ زن ہونے کے حکم دیتی تھی تو اگلے لمحے کسی کنیز کی طرح درخواست کرتی اسے سلطان قصر کے عہدے پر بٹھا دیتی تھی اور التجا یہ تھی کہ مجھے زنداں میں کھلنے والا پھول چاہیے' بھلے وہ زنداں زمین کی آخری تہہ میں ہو۔ اس وقت سرکتی شیفون کے پیچھے اس کے ریشمی بال تک پریشان تھے۔ سالم کے چہرے پر فکری مندی جھلکی۔ اس نے دیکھا کہ وہ کوشش میں ناکام ٹھہری تھی کہ آنسو گالوں پر پھسل آئے تھے۔ جنہیں وہ ٹشو سے صاف کر رہی تھی۔ وہ گنگ تھا وہ ایک معمولی سی لڑکی کی عزت کی خاطر خود کو کئی دنوں سے ذلیل کر رہی تھی۔ شفاف چہرے کے ساتھ سادہ سی چادر اوڑھنے والی وہ لڑکی اس کے کیفے ٹیریا میں جس جگنو کے لیے بھیس بدل کے آئی ہوئی تھی۔ کیا وہ بہت خاص تھی؟ اس کی بالیوں کے سفید موتی بہت مغرور تھے۔ اس نے مصباح کے چہرے پر نگاہ جمائی اور کچھ یاد آنے پر چونکا۔ یہ بھیس جگنو نامی لڑکی کے لیے نہیں تھا۔

"تو پھر میں کیا سمجھوں؟" وہ سامنے ٹیبل پر دھرا اپنا کلچ ہاتھ میں لے کر اس کے جواب کی منتظر تھی۔

☆☆☆

"تمہاری خفیہ قسم کی سرگرمیاں میری سمجھ سے باہر ہیں۔" آج ماں نے تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا حالانکہ وہ گھر آتے ہوئے فارہ کو بھی ساتھ ہی گھسیٹ لائی تھی۔

"اماں آج میں بھی آپ سے کچھ نہیں چھپانا چاہتی۔" اس نے اس کہانی سے مزدا کے مالک کا قصہ گول کر کے جگنو کے بھاگ جانے کی روداد ماں کو سنائی۔ اس کی ماں کا وجود سن ہوا۔ اس نے عادتاً ادھر ادھر دیکھا۔ شکر ہے شوہر گھر پر نہیں تھا۔

"جو ہونا تھا ہو گیا جب وہ تمام رشتے اور دوستیاں ختم کر کے گھر سے جا چکی ہے تو تمہارے لیے بھی بہتر ہے کہ اس کا دھیان اب چھوڑ دو۔" ماں کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی جو بیٹی کا ہاتھ جھٹک کے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

"یہ قاضی کا قصہ گوشی آپا کو بھی بتا دینا چاہیے تھا۔" فارہ نے اپنی طرف سے ایک معقول مشورہ دیا تھا تو ساکت بیٹھی مصباح نے اسے حسب عادت گھورا۔

"تا کہ وہ اس کمینے شوہر کی مار کھا کے سب کچھ اگل دیتی۔ بے چاری گوشی۔ بیٹی کی وجہ سے کس مصیبت میں پھنس چکی ہے۔" مصباح کے لہجے میں دکھ اترا۔

"اس کی بیٹی کا گھر سے بھاگ جانا بہتر سمجھو۔" مصباح نے جیسے کسی گہری کھائی میں کھڑے ہو کے جواب دیا تھا۔

"کیا یہ کسی بھی لڑکی کے لیے بہتر ہو سکتا ہے۔" فارہ کے کان کی لو تک سرخ ہوئی۔

"اس نے یہ سب ماں کو اذیت سے بچانے کے لیے کیا ہے۔" فارہ کی بات پر اس کا غصہ سرما میں سرگوشیاں کرتی آسمانی بجلی کی مانند چمک کے معدوم ہوا۔

"واہ بیٹی کا گھر سے بھاگ جانا گوشی جیسی عورتوں کے لیے ہی باعث راحت ہوتا ہو گا۔" وہ گردن کو تمسخرانہ جھٹکا دے کر بولی تو اس کا تکبر پہلی سیڑھی پہ کہاں تھا وہ جست بھر کے بہت اونچائی تک گیا تھا۔ مصباح نے اسے تڑپ کے دیکھا۔

"لوگ تو تمہاری تربیت کو بھی بیچ میں گھسیٹ لیتے ہیں کہ مصباح بہروز اس جیسی لڑکی پر صدقے واری ہوتی رہی۔" وہ سہیلی کی اس بات پر تیزی سے جلنے والی لکڑی کی طرح لمحوں میں خاکستر ہوئی۔ پھر ایک بوجھل توقف کے بعد جیسے بجھ کے گویا ہوئی۔

"جگنو نے جو کیا اس فعل کے لیے اسے اللہ معاف فرمائے گا۔"

"اور......" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی "اور اس کے ہر فعل پر اسے مصباح علی نے بھی معاف کیا۔" وہ اتنی بڑی بات کہہ کے اس قدر پرسکون کیسے بیٹھی

کی مانند، کوئی بھی اور سنتا تو حیران ہوتا مگر فارہ تو اسے دیکھ بھی رہی تھی جو بارش میں دھلے پتوں کی مانند تروتازہ سی بیٹھی تھی اور جب فارہ کچھ بولنے کے قابل ہوئی تو خوب بولی۔

"یہ محلہ، یہ معاشرہ، مولوی، مفتی، عالم، سب دھواں ہو چکا۔ وہ اخلاقی حدود، معاشرتی اقدار، ہر چیز زمین برد ہوئی' اس روئے زمیں پر بس ایک مصباح بہروز باقی ہے جس نے ایک گناہ گار کو معاف کر دیا ہے۔" فارہ نے قہقہہ ضبط کیا اور مزید بولی۔ "جب وہ قادر مطلق معاف کرتا ہے تو معافی مل جاتی ہے۔ مگر تمہارے معاف کر دینے سے کیا اس لڑکی کو باقی لوگ بھی معاف کر دیں گے۔" اس کی آواز میں تحقیر تھی۔

"جو حقیقت جانتا ہے وہی مقرر کرتا ہے۔ کتنی سزا۔ اور کتنی معافی، کتنی، پکڑ، کتنی رعایت۔" اس نے اپنا جملہ تیزی سے مکمل کیا۔ "یہ محلہ، یہ معاشرہ، مولوی، مفتی، اور تم" اس نے فارہ پر انگلی تانی۔ "تم سب لوگ کرو باتیں کس نے منع کیا ہے۔" اس نے عادت کے مطابق کندھوں کی خفیف جنبش سے فارہ کی ہر دلیل کو جھٹکا کہ اس کی آنکھوں میں جے سکون کو فارہ منان دیکھتی رہ گئی اب وہ اپنی پریشانی اس سے شیئر کرنا بھول چکی تھی۔

☆☆☆

"جس کے ساتھ اس کا معاشقہ چل رہا ہے وہ اس کے ساتھ گئی ہے بابر اس طرح کی بکواس صرف گوشی آپا کے سامنے کرتا ہے۔" وہ اس وقت چھت پر کھڑی ہنی سے گپ شپ لگا رہی تھی۔

"وہی تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ جس محلے داروں کے سامنے جھوٹ موٹ کے آنسو بہا کے کہتا پھرتا ہے کہ ہماری بچی گم گئی ہے یا اغوا ہو چکی ہے۔" وہ ہمیشہ کی طرح ہنی کی خوبصورت آواز پر کھوئی گئی تھی اور شکل دیکھو تو کیا کوئی اس قدر بھی حسین ہو سکتا تھا۔ ہنی اپنی کوٹھی کے عقبی ٹیرس پر کھڑی تھی ان دونوں

...کمروں کے درمیان چھ سات فٹ کی ایک ہی حائل تھی۔ "آج کل کہاں ماری ماری پھر رہی ہو۔" ہنی نے یہ بات جانے کس بنا پر کی تھی مصباح مطلب تو نہیں سمجھی پھر بھی جواب دینا ضروری خیال کیا۔

"اور تو کچھ نہیں آج کل جاب کی تلاش میں ہوں۔" اس نے مسکرا کے جھوٹ بولا۔

"ارے بھئی جاب کیوں۔" ہنی حیران ہوئی۔ "کسی دن لے اپنے ابا کی تجوری کی چابی اڑا لو۔" وہ یہ بات کہہ کے کھلکھلائی۔

مصباح نے برا سا منہ بنایا۔

"تجوری بھری ہوتی تو چابی بھی اڑا لیتی۔ کرارے نوٹوں کی خوشبو پھول منڈی کی بالکونیوں میں اڑ اڑ کے۔ میری اماں کا دل خاک کرتی رہتی ہے۔" لیکن وہ اپنا یہ خیال ہنی پر بھی ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔

"پرسوں میں نے تمہیں ایک کیفے ٹیریا میں دیکھا تھا۔" ہنی ریلنگ پر ہاتھ رکھ کے آگے کو جھکی...... مصباح کے دل پر چھری چلی۔ ہنی کی آواز میں ایک شرارت تھی مصباح نے چہرے پر اترا پسینہ صاف کیا۔

"وہ دراصل جاب کے سلسلے میں اپنے ایک یونیورسٹی فیلو سے ہیلپ لینا چاہتی ہوں تو اس سلسلے میں۔" اس نے بات سنبھال ہی لی۔ اگلے ہی لمحے ہنی نے اچانک سوال بدلا۔

"طلحہ کا کیا حال ہے؟" مصباح نے اسے آنکھیں سکیڑ کے دیکھا۔ "گزر رہی تو ہو رہا ہے۔ آتے جاتے پوچھ لیا کرو۔" وہ بس اتنی خبر رکھتی تھی کہ ہنی طلحہ کو پسند کرتی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اسے کس حد تک پسند کرتی ہے۔

"وہ ہمیں اپنا حال بتاتا ہی نہیں۔" ہنی ایک اداس آہ بھر کے مسکرائی۔

"حال تو وہ ہم سے بھی چھپاتا ہے بہت گھنا ہے۔" مصباح کا چہرہ کسی خیال کے تحت چمکا تھا اس کے ذومعنی قسم کے تاثرات نے ہنی کے دل پر ستم ڈھایا تو برسوں سے محفوظ سوال لبوں تک آ ہی گیا۔

"طلحہ تمہیں پسند کرتا ہے۔" اف وہ کیا

...خوبصورت لہجے میں بس چبھن تھی' مصباح بھونچکی رہ گئی ——— وہ مسکرا نہیں سکی اس وقت ہنی کا چہرہ ایک کھلی کتاب تھا' مصباح اس نے کتاب کو بغور پڑھا۔ طلحہ جسے پسند کرتا تھا وہ جانتی تھی۔ فارہ اور طلحہ تو ایک ساتھ کھیل کود کے جوان ہوئے تھے وہ طبقاتی اونچ نیچ کو نوک پر رکھتے تھے مگر اس چھوٹی سی دکان کے مالک طلحہ میں ہنی کو کیا خوبی نظر آئی تھی۔

"مجھے کوئی ناپسند کر سکتا ہے۔" وہ اس مختصر دورانیے میں بہت آگے سوچ چکی تھی۔ سو گردن اکڑا کے اترائی ہنی کے اندر یخ بستگی سی پھیلی۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود کہہ نہیں پائی کہ پھر وہ کون تھا جوان سیاہ آنکھوں میں انہماک سے تک رہا تھا۔

اس نے سامنے کھڑی لڑکی کو رشک سے دیکھا۔ جو خوش رو تھی جس کی شخصیت میں تیکھا پن تھا جو بالکل بھی حسین نہیں تھی وہ پھر بھی دعوے دار تھی کہ وہ منتخب ہونے والوں میں سے ہے۔ مصباح کے گھر کی چھت قدرے نیچی تھی۔ اور اس قدر آور کوٹھی کی ٹیرس منڈیر کی اونچائی تک تھی۔ ہنی کی آنکھوں میں نمی اتری۔ چھت نیچی ہونے کے باوجود وہ لڑکی آسمان چھو رہی تھی یا آسمان اسے چھو رہا تھا' تب ہی ہلکی بارش شروع ہوئی' اس کی آنکھوں کے آگے دھند کی چادر دبیز ہوئی۔

"تمہارے قدموں میں سارا زمانہ بیٹھ جائے سو بیٹھ جائے سوائے طلحہ کے" ہنی نے حکم کہاں دیا تھا بس بند لبوں سے التجا کی تھی۔

"خدا کرے تمہیں اس شخص سے محبت ہو جائے مصباح بہروز۔ مسکراہٹ جس کے ہونٹوں پر ٹھہر کے اترائی ہے اور اسے تم سے محبت ہو جائے۔" اس کی دعا میں بلا کی شدت تھی۔ وہ تمہاری بالیوں میں پڑے موتی بھی شمار نہ کر پائے ہنی نے ہلکی کن من میں جھجکتی اس لڑکی کو اپنی دعا کے سپرد کر دیا تھا۔

☆☆☆

مشہور مقولے کے مطابق بارہ بجے سے قبل کی

...نیند خالص پچے سونے کے برابر کی ہاتی کی تمام رات گھوڑے بیچ کے سونے والے بھی بس چاندی اور پیتل ہی خرید سکتے تھے، یعنی نیند کے نام پر خود فریبی، اس نقطے پر سوچیں تو اللہ کی رحیمی پر کیوں نہ پیار آئے۔ کہ نیند کی یہ دولت محنت کش اور تھکا ماندہ طبقہ ہی لوٹتا تھا جبکہ امیروں کے حصے میں پیتل چاندی، بادشاہ اور وزراء اس سے بھی محروم، تو نیند کی اس قیمتی دولت کو کو لوٹنے والوں میں پاکستان کے صدر صاحب کے علاوہ دوسرا بندہ یقیناً سالم امین تھا۔ یعنی ایک تو امیر، پھر امیر تر، تو رات گیارہ بجے تک اپنے معمول کی مصروفیات نپٹا کر سو جانے والا بندہ آج بے چینی کی حالت میں ٹیرس اور کمرے کا فاصلہ کیوں ناپ رہا تھا۔ اس کی ایک ٹھوس وجہ تھی۔ آج ڈنر کے بعد رب نواز نے صاحب کو چائے پیش کرنے کے ساتھ خلاف معمول اخبار بھی پیش کیا تو اس امیر تر، شخص کا ماتھا ٹھنکا۔ اخبار جو تمام ملازمین کے ہاتھوں گھومتا گھماتا وقت عشاء سالم کے سامنے پہنچا تھا اس میں ایسی کون سی خبر تھی۔ اس نے اخبار کے اندرونی صفحہ پر ایک حاشیہ زدہ خبر کو پڑھا۔ وہ خبر پڑھنے کے بعد اپنے ملازم رب نواز کو یوں دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

☆☆

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

صائمہ اکرم چوہدری

شہزاد

شہزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دلکشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹڑی پار کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے ۔ ان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

مینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزاد جسے اعلیٰ تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہزاد کی آمد مینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آ چکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور مینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در شہوار اسے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

یہ جان کر کہ منال، ہادی کی بہن ہے در شہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ منال اور برہان کی بے تکلفی سے اسے انابیہ کے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار درانی، شہزاد کے پاس کچھ کام کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سیفی کے فون سے مشتعل ہو کر مینا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے، اس بات پر ہادی اور شہزاد بہت چراغ پا

ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات و واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کا نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبیٰ کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبیٰ کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا، ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے، وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیصہ کو ارسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع غنی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے، شہزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے، ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے در شہوار مزید بری لگتی ہے۔

انابیہ، در شہوار اور مناہل کی بے تکلف گفتگو سن کر صدمے کا شکار ہو جاتی ہے اور در شہوار اور برہان کے ساتھ بے رخی سے پیش آتی ہے جسے وہ دونوں بہت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد کے برابر میں گھر لینے پر مونیکا شدید غصے کا اظہار کرتی ہے۔ ہم زاد کو شہزاد اور ارتضیٰ کا ساتھ بہت برا لگتا ہے۔

صندل کے گھر والے، شہزاد کے چوکیدار کے رشتے دار ہیں اور اسی حوالے سے وہ شہزاد کے گھر ملازمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

مسز قریشی کے ڈنر میں برہان اور در شہوار کو دیکھ کر ہادی کو دھچکا لگتا ہے۔ وہ مناہل کو اشاروں میں برہان سے دور رہنے کا کہتا ہے مگر وہ اس کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ طوبیٰ اور نمیرہ کی باتوں سے برہان کو در شہوار اور ہادی کے بارے میں پتا چلتا ہے وہ اپنی ماں کو بتاتے ہیں اور در شہوار کی شادی ارسل سے کرانے کا مشورہ دیتے ہیں، اس رشتے پر داجی کو بھی اعتراض نہیں۔

ہم زاد، شہزاد کو اپنی فیملی کے بارے میں بتاتا ہے۔ ارسل کی کوششوں سے روحیل کا دوست صارم خان، رومیصہ کے حق میں گواہی دیتا ہے جس سے کیس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ منال کو یونی ورسٹی میں برہان اور انابیہ کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوتا ہے۔

برہان کی شادی کا مناہل کو سخت برا لگتا ہے۔ وہ دبئی جانے لگتی ہے مگر ہادی کے سمجھانے پر اپنا ارادہ بدل لیتی ہے۔

برہان اور تاجدار بیگم کی خواہش پر در شہوار کا رشتہ ارسل سے اور شاہ میر کا رشتہ نمیرہ سے طے کر دیا جاتا ہے۔ داجی کا یہ فیصلہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی پریشان کن ہے۔

مونیکا امتحان دے کر ذوالکفل کے ساتھ عمرے پر چلی جاتی ہے اور گھر والوں کو شادی اور اسلام قبول کرنے کا بتا دیتی ہے۔

صارم کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ ہم زاد شہزاد کی سیکیورٹی کا بندوبست کرتا ہے۔ رومیصہ کو ڈاکٹر خوش خبری سناتا ہے یہ خبر رومیصہ اور ارسل کے لیے پریشانی لاتی ہے۔

ارسل رومیصہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہے تو وہاں پتا چلتا ہے کہ رومیصہ ماں بننے والی ہے۔ ارسل بہت خوش ہوتا ہے، رومیصہ خوف زدہ ہو جاتی ہے آگے کا سوچ کر وہ بچہ ختم کرانے کا کہتی ہے۔ ارسل غصے میں رومیصہ کو تھپڑ مار دیتا ہے۔

میر ہاؤس میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں۔ در شہوار سب سے بدتمیزی کرتی ہے۔

برہان، مناہل کے اچانک غائب ہو جانے پر پریشان ہیں۔ وہ سعد سے ملتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ اسے ان کی شادی کے بارے میں پتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ بات تو ہادی اور مناہل کو بھی پتا ہے۔

سعد کو اچانک مناہل میں دلچسپی ہو جاتی ہے۔

شیری رضا سے میجر توصیف کے بارے میں پوچھتی ہے وہ دراصل ہم زاد کا راز جاننا چاہتی ہے۔ ہم زاد شیری کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کی سیکیورٹی کی جانچ کے لیے آتا ہے اور شیری کے پسندیدہ پرفیوم کی بوتل لے جاتا ہے۔

در شہوار، ارسل کے کمرے میں جا کر بدتمیزی کرتی ہے اور اس کے کمرے کا سامان توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ برہان اور تاجدار بیگم معاملہ سنبھالتے ہیں۔ در شہوار ہادی کو فون کر کے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

شیری، ارتضیٰ کے ساتھ، صارم کے والد سے بات چیت کرنے جاتی ہے۔ راستے میں ہم زاد کی کال آتی ہے کہ ان کی گاڑی کا تعاقب کیا جا رہا ہے اور ارتضیٰ ان کا نشانہ ہے۔ ہم زاد، شیری کو گاڑی سے اترنے کا کہتا ہے کہ......

ہم زاد شہریار کو فون کرتا ہے کہ ارتضیٰ کی گاڑی سے اتر کر وہ ان کی گاڑی میں آ جائے۔ اسی دوران ان کے پیچھے پڑے لوگ فائر کھول دیتے ہیں اور ارتضیٰ زخمی ہو جاتا ہے شہزاد کے پاؤں پر بھی چوٹ لگتی ہے۔

شہزاد ہادی کے گھر آئی ہے۔ اور اوپر کے پورشن سے آنے والی نسوانی چیخ سن کر گھبرا جاتی ہے۔ ہادی بہانے سے اسے مسز قریشی کے کمرے میں بھیج دیتا ہے۔ اوپر آتا ہے تو خون دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ در شہوار اپنے آپ کو زخمی کر لیا تھا۔ وہ حمزہ کے ہمراہ اسے اسپتال لے جاتا ہے۔

شہزاد مسز قریشی کے گھر سے واپس آ کر بھی الجھن میں رہتی ہے۔ حمزہ سے بات کرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سے ناراض ناراض ہے۔ وہ اسے کہتا ہے کہ وہ اگلے دن اس کے آفس آ کر بات کرے گا۔

نور محل میں مایوسی چھائی ہے۔ جہاں وہاج کے کارنامے کو ڈسکس کیا جاتا ہے۔ وہاج کی ماں بار بار اپنے بیٹے کی طرف داری کرتی ہیں۔ فارحہ کہتی ہے کہ وہ میڈیکل رپورٹ اگر درست ہے تو زیادتی کرنے والا بندہ وہاج نہیں کوئی اور ہے۔

ذوالکفل اپنی بیوی کے ساتھ اپنے آبائی گھر آتا ہے لیکن وہاں انہیں قبول نہیں کیا جاتا ــــ بلکہ اس کے بابا مونیکا کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔ جس سے وہ طیش میں آ کر گھر سے نکل جاتا ہے۔

میر وہاج' اسد کے پاس موجود ہے اور اسد ہی وہ شخص ہے جو میر وہاج کے ساتھ شامل ہے۔ رومیصہ اور ارسل کو برہان ایک ریسٹورنٹ میں دیکھتا ہے اور ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ صندل کیس کی پہلی پیشی مسز قریشی پر بھاری پڑتی ہے۔ گھر آ کر وہ در شہوار سے مدد مانگتی ہیں۔ شہزاد اور حمزہ کا جھگڑا ہوتا ہے۔

لودھراں میں ایک شام وہاج اسد کے فلیٹ سے نکل جاتا ہے ایک سنسان سڑک پر کوئی اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتا ہے۔ اس کا وجود مردہ ہو جاتا ہے۔

بیسویں قسط

وہاج کے قتل کی خبر پورے پاکستان میں آگ کی طرح پھیلی اور بہت سے لوگوں کو بیک وقت خوشی اور دکھ کا احساس بخش گئی۔

وہ سارے لوگ جو اس خاندان کے حوالے سے کسی نہ کسی ظلم یا زیادتی کا شکار ہوئے تھے، انہیں اطمینان ہوا۔ اللہ کی بے آواز لاٹھی جب کسی کو آ کر لگتی ہے تو اسے ایسے ہی ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

میر ہاؤس کے مکینوں کی تو گویا کسی نے کمر ہی توڑ دی۔

راتوں رات سارا خاندان اپنے آبائی شہر ملتان پہنچا۔ سب کے چہروں پر چھائی ہوئی سراسیمگی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ لوگ اس حادثے سے کس قدر بوکھلائے ہوئے تھے۔ میر حاکم کے خاندان کی سیکیورٹی میں ایک دم اضافہ کر دیا گیا۔ ان کی آبائی حویلی، اور مختلف گھروں کے باہر پولیس کی نفری بڑھا دی گئی، کچھ بھی تھا وہ اس وقت حکومت وقت میں تھے۔

میر وہاج کی لاش، پیٹرولنگ پولیس کو ملی اور ان کے والٹ سے نکلنے والے کارڈز نے تصدیق کر دی، اور ساتھ ہی مختلف حکومتی ادارے متحرک ہو گئے، میر ہاؤس میں تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

فارحہ بھابھی کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ ان کا ذہن اس چیز کو بالکل بھی قبول نہیں کر رہا تھا اس لیے ان کو مسلسل ٹرنکولائزر دے کر سلایا جا رہا تھا جبکہ تاجدار بیگم خود بھی اپنے حواسوں میں نہیں تھیں۔ وہ ان کی ماں تھیں اور ویسے بھی وہ پچھلے کافی دنوں سے اپنی اس اولاد کے حوالے سے شدید ذہنی اذیت کا شکار تھیں۔ وہاج کی ناگہانی موت کو قبول کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ابھی تو سفاک میڈیا ان کی اس چیز کو لے کر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہا تھا اور پورے اہتمام کے ساتھ ان کے زخموں پر نمک چھڑک رہا تھا۔

وہاج میر، محتشم صاحب اور تاجدار بیگم کی سب سے لاڈلی اور پہلی اولاد تھی جس کی پیدائش پر پورے تین دن حویلی میں جشن منایا گیا تھا، وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا، وہ اگر میر حاکم کا چہیتا تھا تو اپنی ماں کی آنکھوں کا تارہ۔

اس نے زندگی میں جو چاہا، وہی حاصل کیا، اسے اپنے گھر کے بڑوں کو خوش رکھنے کا ہنر آتا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ میر حاکم کو سب سے زیادہ اپنے اسی پوتے سے امیدیں تھیں جو سیاست کے میدان میں ان کا جانشین بننے کی مکمل اہلیت رکھتا تھا۔

اسی میر وہاج —— پر بے دردی سے گولیاں برسائی گئی تھیں اس کا سارا وجود چھلنی تھا اور چہرے کو شناخت کے قابل نہ چھوڑنے کے لیے اسے بُری طرح سے مسخ کر دیا گیا تھا، اس کی لاش پر ایک نظر ڈالنا بھی دشوار تھا۔

وہ اس وقت عبرت کی جیتی جاگتی تصویر بنا ہوا میڈیا کی اسکرین پر چھایا ہوا تھا، اس کے ماضی کے قصے دبے دبے انداز میں ہیڈ لائن کی سرخیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ میر فیملی کے لیے تو گویا یہ ہی یوم حشر تھا، جہاں ان کے اعمال ٹی وی اسکرین پر ان کے سامنے دکھائے جا رہے تھے۔

میر وہاج کے ساتھ ساتھ اس بار میر خاقان کی خفیہ شادیاں بھی موضوع گفتگو تھیں، میڈیا ایک دم سے پینترا بدل چکا تھا، اور یہ بات میر حاکم کے لیے زیادہ تشویش کا باعث تھی، انہیں اس وقت اپنے پوتے وہاج کی تدفین سے زیادہ کچھ اسکرز تک لفافے پہنچانے کی فکر تھی، جو الیکشن کے دنوں میں ان کے لیے ہمدردی کا ووٹ حاصل کرنے میں ان کی بھرپور مدد کر سکتے تھے۔

ان کا دماغ ایسی سچویشن میں بھی متحرک تھا، اور ان جیسا حوصلہ، ضبط اور ہمت ان کی کسی بھی اولاد میں نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت وہی سب کے سوالات کے جوابات دے رہے تھے۔

”میر صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں، اس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”کیا یہ آپ کے سیاسی مخالفین کی کوئی چال تو نہیں تاکہ الیکشن میں آپ کا مورال ڈاؤن کیا جا سکے؟“

”کیا اس قتل کیس کی کڑیاں صندل کیس کے ساتھ ملائی جا سکتی ہیں۔۔؟“

”اب میر وہاج کی سیٹ پر آپ کے خاندان کا کون سا شخص الیکشن لڑے گا؟“

”آپ لوگ ان سب حالات سے نبٹنے کے لیے کیا حکمت عملی طے کریں گے؟“

یہ سارے وہ سوالات تھے جو میڈیا کے نمائندے بڑی حویلی سے نکلنے والے ہر فرد سے پوچھ رہے تھے، لیکن اس موقعے پر صرف میر حاکم کا ضبط دیدنی تھا، وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ صبر و تحمل کا پیکر بنے ہوئے بہت تفصیل سے اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

بڑی حویلی میں لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور وہاج کی تدفین کے مراحل ٹی وی پر لائیو دکھائے جا رہے تھے۔ محتشم صاحب کی آنکھیں ضبط کی کوشش میں لال ہو رہی تھیں، کچھ بھی تھا وہاج ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور زندگی میں پہلی بار انہیں اپنے اس بیٹے سے کچھ مسئلہ ہوا تھا ورنہ وہ تو باپ کا ہمیشہ سے ہم نوا رہا اور سیاست میں گہری دلچسپی کی وجہ سے وہ اس گھر کے سب مردوں کا پسندیدہ تھا، ورنہ برہان، ارسل اور شاہ میر نے ان سب کو مایوس کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

حویلی کے زنان خانے میں اس وقت بے شمار عورتیں اکٹھی تھیں اور کچھ دبے دبے لفظوں میں درشہوار کے بارے میں بھی پوچھ چکی تھیں کیونکہ اس خبر کو ابھی تک پورے خاندان سے چھپایا جا رہا تھا۔ طوبیٰ، اناہیہ اور ندرت بیگم تینوں کا ایک ہی بیان تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور ڈاکٹرز نے اسے کسی سے بھی ملنے سے منع کیا ہے، چونکہ اس وقت فارحہ بھابھی اور تاجدار بیگم کے سلسلے میں ڈاکٹرز کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے کسی کو اس بیان پر شک بھی نہیں ہوا۔ شاہ میر تاجدار بیگم کے کمرے سے نکلا تو سامنے سے آتی ہوئی طوبیٰ ٹھٹک گئی۔ سفید رنگ کے شلوار کرتے میں اس کا اچھا خاصا رنگ، مدھم اور آنکھیں ضبط کی کوشش میں سرخ لگ رہی تھیں۔

”میرو! کیا کہا ہے ڈاکٹرز نے؟“

”کیا کہہ سکتے ہیں وہ ان حالات میں، یہی کہ شدید ڈپریشن کا شکار ہیں وہ۔“ وہ افسردگی سے بولتا ہوا اس کے ساتھ بڑی حویلی کی پچھلی طرف چلا آیا، طوبیٰ کی آنکھیں شدت گریہ کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔

”صدمہ بھی تو چھوٹا نہیں ہے میرو۔“ طوبیٰ کی آنکھوں سے آنسو چھلکے۔

”ہاں صدمہ چھوٹا نہیں ہے لیکن صندل کی آہ لگی ہے انہیں۔“ شاہ میر کا زہریلا لہجہ اسے چونکا گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی، سگے بھائی کی موت اور ایسی صورت میں جب میت بھی گھر میں موجود تھی، کم از کم اس قسم کی بات کرنے کا حوصلہ کوئی کر سکتا ہے، لیکن وہ شاہ میر تھا، جو اپنے مخصوص بے دھڑک انداز میں غلط بات کو غلط کہنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ اسی لیے اپنے بڑوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔

”کیا ہوا؟ ایسے بے یقینی سے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ اس نے بھی اس کی حیرانی کو نوٹ کیا۔

”مجھے توقع نہیں تھی کہ تم ایسی بات کرو گے۔“ وہ صاف گوئی سے گویا ہوئی۔

”ذرا باہر جا کے مردانے میں بیٹھو اور لوگوں کی سرگوشیاں سنو، اللہ کی قسم دل کرتا ہے انسان خودکشی کر لے۔“ وہ ایک دم پھٹ پڑا۔

”پتا نہیں، ہم دوسروں کے ساتھ زیادتی کرتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اوپر بھی کوئی ذات ہے، جو صرف ان کی نہیں تمام کائنات کی مالک ہے اور جس کا یہ کہنا ہے کہ کوئی ذرہ برابر بھی کسی کے ساتھ زیادتی کرے گا تو اسے اس کا حساب دینا پڑے گا۔“ وہ جذباتی انداز میں بولتا چلا گیا۔

☆ فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	قیمت:	-/300 روپے
☆ زرد موسم	راحت جبیں	قیمت:	-/1000 روپے
☆ حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	قیمت:	-/400 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

"لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مکافات عمل ہے اور میر خاندان کے زوال کا آغاز ہو چکا ہے، اس لیے انہیں اپنے گناہوں پر توبہ کرنی چاہیے۔" شاہ میر کی اس بات پر طوبیٰ کو ایک دم چپ لگی۔

"اور داجی اس موقعے پر بھی اپنی سیاست چمکانے سے باز نہیں آ رہے، تم جا کر دیکھو، لگتا ہی نہیں ان کے سامنے ان کے سب سے لاڈلے پوتے کی میت پڑی ہوئی ہے۔" اس کے گلے میں بے شمار آنسو اٹکے اور اس کی آواز کانپنے لگی۔

"ٹیک اٹ ایزی شاہ میر۔" اس نے شاہ میر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیسے ایزی لوں، وہ گناہ گار سہی، انہوں نے جو صندل کے ساتھ کیا، بہت غلط کیا لیکن یار وہ میرا بھائی بھی تھا، وہ محتشم کی اولاد بھی تھا، وہ کسی کا شوہر بھی تھا لیکن وہ داجی کے لیے محض ایک لاش ہے جس کی قیمت وہ لگا رہے ہیں۔" اس نے بازو کی پشت سے بے دردی کے ساتھ اپنے آنسوؤں کو واپس دھکیلا۔

"پلیز شاہ میر۔" وہ پریشان ہوئی۔

"وہ بابا سے اور چچا سے بھی کہہ رہے ہیں کہ اس ایونٹ کو بھی ہمدردی کا ووٹ لینے کے لیے استعمال کرو، میں ایسی گندی سیاست پر اور ایسی حکمرانی پر سو بار لعنت بھیجتا ہوں۔" وہ بےزاری سے بولا۔

طوبیٰ نے اس کے کندھے سے بازو ہٹا کر اس کے ہاتھوں کو نرمی سے پکڑا اور اسے سہلانے لگی، وہ اس کی کیفیت کو سمجھ سکتی تھی، وہ جان سکتی تھی کہ وہ اس وقت اذیت کے کس پل صراط سے گزر رہا ہے، وہ اس گھر میں سب سے مختلف تھا اور اس لیے اس کے حصے میں آنے والا درد بھی زیادہ ہوتا تھا۔

"یار لوگ کیسے کر لیتے ہیں اپنے پیاروں کی لاشوں پر سیاست؟ ان کا دل نہیں کانپتا کہ موت کا فرشتہ ان کے گھر کی دہلیز کو چھو کر گزرا ہے، کل کو ان کی بھی باری آ سکتی ہے؟ کیا یہ دنیاوی عیش و عشرت، یہ عہدے، یہ منصب، کسی کی جان سے زیادہ قیمتی ہیں۔" وہ بری طرح سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کے یہ سارے جملے ارسل نے اپنے ہوش و حواس میں سنے، جو اسی کی تلاش میں ادھر آیا تھا۔

"پاگل ہو گئے ہو شاہ میر! آہستہ بولو، کوئی سن لے گا۔" وہ بوکھلا گیا۔ طوبیٰ نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا، پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔

"سن لے۔ میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں ـــــ" بغاوت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"تم چلو باہر محتشم ماموں پوچھ رہے ہیں تمہارا۔" ارسل زبردستی اس کا بازو پکڑ کر اسے باہر کی طرف لے گیا، طوبیٰ جانتی تھی وہ اس وقت جس قیامت سے گزر رہا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ پورا خاندان یہی سمجھتا تھا۔ وہاج کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور اسے کسی سیاسی دشمنی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

☆☆☆

درشہوار کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہوا۔

اس نے اپنی دھڑکن تھمتی محسوس کی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی؟" درشہوار کو اپنی پھٹی ہوئی آواز اجنبی لگی۔

"یہ سچ ہے بیٹا۔ میر وہاج کا مرڈر ہو چکا ہے اور اس وقت سب نیوز چینلز پر ایک ہی خبر چل رہی ہے۔ تمہیں اس موقعے پر بہت حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ میں جانتی ہوں یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں۔" مسز قریشی براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

درشہوار کا رنگ فق تھا، اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کو بہہ نکلنے کا راستہ ملا، اس کے پورے وجود میں

…میں گھونپا ہو۔

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔" اس کے لبوں سے لفظ پھسلے تو مسز قریشی کو اس کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہوا۔

"یہ ایک تلخ حقیقت ہے بیٹا، تم جا کر ٹی وی اسکرین پر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہو۔" مسز قریشی کی بات پر اس کا دل گہری کھائی میں ڈوبا۔ اس نے چند لمحے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا اور پھر وہ دوپٹے سے بے نیاز، ننگے پاؤں، پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں پہنچی۔

اس حادثے کی اطلاع ملتے ہی محمد ہادی بھی فوراً مری سے نکل آیا تھا، وہ ابھی ابھی گھر پہنچا تھا اور اس وقت ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں پکڑے ٹی وی کے مختلف چینلز بدل بدل کر دیکھ رہا تھا، جہاں ایک ہی حادثے کی تصویریں دکھائی جا رہی تھیں۔ اس نے زندگی میں پہلی بار پلک جھپکے بغیر درشہوار کو دیکھا۔ اس وقت اس کے چہرے اور سرد خانے میں پڑی کسی لاش میں اسے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔

وہ رو رہی تھی، ہادی کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ٹی وی اسکرین پر وہاج کا چہرہ نمودار ہوا، جسے دیکھتے ہی وہ بلکنے لگی، اسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی، وہ وحشی آنکھوں کے ساتھ دیوار پر لگی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں میر ہاؤس پر ٹوٹنے والی قیامت کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔

سامنے اس کا باپ تھا جسے میر برہان اور ارسل نے اپنے بازوؤں کے ذریعے سہارا دے رکھا تھا۔ ان سے ایک قدم بھی اٹھانا دشوار تھا۔

اس کے چچا میر خاقان کے چہرے پر پھیلا درد اور کرب، درشہوار کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ کیمرہ اب اس کے بھائی شاہ میر کو فوکس کیے ہوا تھا، جو اس وقت ضبط کی جیتی جاگتی تصویر بنا ہوا تھا، وہ اس سارے ہنگامے میں ایک طرف خاموشی سے کھڑا تھا۔

درشہوار کو یہ سارے مناظر خنجر کی طرح اپنے وجود میں اترتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی جیسے یہ کوئی بھیانک خواب ہو۔

جیسے ہی ٹی وی اسکرین پر وہاج کا پورا وجود دکھائی دیا، درشہوار کو لگا کسی نے الٹی چھری کے ساتھ اسے ذبح کرنے کی کوشش کی ہو۔ یہ اس کا وہ سگا بھائی تھا جس نے اس کے سب سے زیادہ لاڈ اٹھائے تھے۔ جس نے اسے انگلی سے پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔

یہ اس کا وہی بھائی تھا، جو ماں کی گھوریوں سے بے نیاز، اس کا اسکول کا بیگ چاکلیٹ اور اس کی من پسند اشیاء سے بھر دیتا تھا، جو اس کے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی کو دور کرنے کے لیے گھوڑا بن کر اسے اپنی پیٹھ پر سوار کر لیتا اور تاجدار بیگم سے خاموشی سے ڈانٹ کھا لیتا۔

جس نے اس کے وہ تمام شوق پورے کیے تھے جو اس خاندان کی لڑکیوں کے لیے سوچنا بھی گناہ تھے، وہ اس خاندان کی پہلی لڑکی تھی، جسے سب سے زیادہ چاہا گیا، جس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کے تینوں بھائیوں کے لیے حرف آخر ہوتا۔ اس کی سوچیں بے وزن گالوں کی طرح فضا میں بکھرنے لگیں، ماضی فلیش بیک کی طرح اس کے ذہن میں چلنے لگا۔

درشہوار کے اسی بھائی کا چہرہ پٹیوں میں قید تھا اور اس کے جسم سے روح آزاد ہو چکی تھی، اور وہ اپنے کیے کی سزا دنیا میں ہی بھگت کر اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

وہ جانتی تھی اس وقت اس کا خاندان کرب کی کس بھٹی میں جل رہا ہوگا، وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی ماں کو سنبھالنا اس موقعے پر پورے خاندان کے لیے کس قدر دشوار مرحلہ ہوگا، اور بدقسمتی سے وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فارحہ

درشہوار کو پہلی دفعہ اپنے وجود سے نفرت محسوس ہوئی، اس کی ایک محبت نے اسے خاندان بھر کی محبتوں سے محروم کر دیا تھا۔ وہ صدمے کی سی کیفیت میں چلتی ہوئی ٹی وی اسکرین کے پاس پہنچی، وہ وہاج کے چہرے کو چھو کر محسوس کرنا چاہتی تھی۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ اپنے ماں جائے کو اسکرین سے کھینچ کر نکال لے اور دیوانہ وار اس کے منہ کو ایسے ہی چومے جیسے وہ بچپن میں اسے پیار کرتا تھا۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ ایک ہولناک عذاب میں مبتلا ہو چکا تھا۔

ہادی کو یقین ہو گیا وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے، مسز قریشی بھی اس کے پیچھے ٹی وی لاؤنج میں پہنچ گئیں، وہ اس کی حالت کا بخوبی اندازہ لگا سکتی تھیں، بے شک اس کا بھائی صندل کا گناہ گار تھا لیکن خون کے رشتے اپنے پیاروں کے گناہوں سے دانستہ نظریں چرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

درشہوار کا جسم اب لرز رہا تھا، وہ پاگلوں کی طرح روتی ہوئی اپنے دونوں بازو پھیلا کر اسکرین سے لپٹ گئی، اس کے منہ سے نکلنے والی چیخوں نے مسز قریشی کے گھر کے در و بام ہلا دیے۔ ایک لمحے کو تو ہادی کو بھی اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

''بھائی!'' اس کی آواز پست اور درد بھری تھی۔

ہادی کا دل زندگی میں پہلی بار دکھ کے احساس سے بھرا، اس نے مسز قریشی کی طرف دیکھا، جن کی اپنی آنکھیں نم تھیں، بے شک وہاج کی موت سے وہ ایک جیتی ہوئی بازی ہار چکی تھیں لیکن اس سے پہلے وہ ایک انسان بھی تھیں اور ایک ماں بھی۔

''بیٹا! خود کو سنبھالو، اس طرح رونے سے مرنے والے کی روح کو تکلیف ہوگی۔۔'' انہوں نے بامشکل اسے ٹی وی کی اسکرین سے الگ کیا۔

''میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی آنٹی۔'' وہ روتے ہوئے بے ربط بول رہی تھی۔ ''مجھے اپنے گھر جانا ہے، مجھے اپنی ماں سے ملنا ہے۔

خدا کے لیے مجھے آپ ملتان بھجوا دیں۔'' مسز قریشی نے پریشانی سے ہادی کو دیکھا، اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ماں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں آج کی فلائیٹ سے بکنگ کروا کے ارسل کو فون کر دیتا ہوں۔'' ہادی کے منہ سے نکلنے والے جملے نے مسز قریشی کو پریشان کیا۔

''آر یو ان یور سینسز، اس موقعے پر اس کا جانا پورے خاندان کو ایک نیا تماشا دکھا دے گا۔''

''ممی! وہ اس کا سگا بھائی ہے، اس موقعے پر اسے جانا چاہیے۔'' ہادی جلد از جلد اس سے جان چھڑا لینا چاہتا تھا اور اس سے بہتر کوئی موقع نہیں تھا۔

''میں تمہیں اس قدر احمقانہ فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' مسز قریشی خفا ہوئیں۔

''ممی! اس موقعے پر درشہوار کے وہاں پہنچنے سے بہت سے لوگوں کے سوالات ختم ہو جائیں گے اور مجھے پتا ہے میر فیملی نے ابھی تک اس بات کی کسی کو بھی کانوں کان خبر ہونے نہیں دی۔'' ہادی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہ اسے مار دیں گے بیٹا۔'' مسز قریشی کو اس وقت درشہوار سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

''وہ اپنے خاندان کی ہر لڑکی کو مار سکتے ہیں لیکن اسے نہیں۔'' ہادی گھر میں اس کی اہمیت سے آگاہ تھا۔

''آپ پلیز اسے جانے دیں، میں ملتان جانے والی اگلی ہی فلائیٹ میں اس کی بکنگ کروا دیتا ہوں۔''

ہادی نے اس کے سلگتے ہوئے وجود سے دانستہ نظریں چرا کر بامشکل اپنی ماں کو رضامند کیا۔ اسی وقت جب دونوں ماں بیٹا اس الجھن میں مبتلا تھے، منامل نے اپنے بریف کیس کے ساتھ گھر کے لاؤنج میں قدم رکھا، وہ کسی کو بھی بتائے بغیر واپس پاکستان آ چکی تھی اور اب پھٹی پھٹی نگاہوں سے برہان کی بہن درشہوار کو دیکھ رہی تھی، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس دشمن جان کو بھلانے میں اسے اتنا ٹائم لگا ہے، گھر جاتے ہی اس کی بہن سے سب سے پہلے اس کا سامنا ہو جائے گا۔

جیسے ہی اسے ساری حقیقت کا علم ہوا، اس کا تو دماغ ہی کھول اٹھا، وہ دل ہی دل میں اپنی ممانی اور ہادی دونوں سے ہی خفا ہو چکی تھی، اس کی آمد کے بعد ہادی کو ایک سپورٹر اور مل گیا تھا اور دونوں نے بھاگ دوڑ کر کے پہلی فلائٹ میں درشہوار کو بٹھایا، انہیں علم تھا وہ جنازے تک وہاں پہنچ جائے گی لیکن جیسے ہی وہ اسے ایئر پورٹ ڈراپ کر کے واپس آئے تو مسز قریشی کی حالت خاصی خراب تھی اور ان کا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا تھا، ہادی اور منامل دونوں کے حقیقتاً ہاتھ پیر پھول گئے، وہ جانتے تھے کہ انہوں نے کس چیز کی ٹینشن لی ہے، وہ دل سے قطعاً بھی اس بات کے لیے راضی نہیں تھیں کہ درشہوار اس صورت حال میں اکیلی اپنے گھر واپس جائے کیونکہ اس خاندان کی سفاکی کی داستانیں وہ کافی لوگوں سے سن چکی تھیں۔

☆☆☆

''بہت اچھا ہوا میر حاکم کے خاندان کے ساتھ۔'' ثمینا بیگم کا زہر آلود جملہ سٹنگ روم میں گونجا۔

''مام!'' شہزاد نے تاسف بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور چپ رہی، اسے ان کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

''ان شاء اللہ کتے کی موت مریں گے یہ سب۔'' وہ بے زاری سے سر جھٹک کر مزید بولیں۔ ''یہ لوگ سمجھتے تھے پیسے اور اختیارات کے ذریعے پوری دنیا کو اپنے آگے لگا لیں گے لیکن یہ بھول گئے تھے اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔''

ثمینا بیگم نے میز پر رکھا اپنا پرس اٹھاتے ہوئے استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگایا، ان کے سامنے بیٹھی ہوئی شہزاد اور رومیصہ نے ہلکی سی ناگواری کے ساتھ ان کی طرف دیکھا، جو بلیک کلر کی شیفون کی ساڑھی میں قیامت ڈھا رہی تھیں۔

''وہ گناہ گار سہی لیکن ایسی موت ڈیزرو نہیں کرتا مام! آپ دیکھیں، اس کے چہرے پر بری طرح سے گولیاں برسائی گئی ہیں۔'' ایسی بات کہنے کی جرأت شہزاد ہی کر سکتی تھی لیکن رومیصہ تو اس وقت ساکت پلکوں کے ساتھ سانس روکے اسکرین پر ارسل کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

وہ تو مر کر بھی یقین نہیں کر سکتی تھی کہ اس کا تعلق اس خاندان سے نکل سکتا ہے جس سے اس کی سگی بہن اور ماں کو شدید نفرت تھی، جس نے اس کی بہن کو ناکوں چنے چبوانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔

''میرا بس چلے تو اس خاندان کے ایک ایک بندے کو پکڑ کر گولیوں سے اڑا دوں۔'' ثمینا ایک دم کے چہرے پر پھیلا شدید تنفر شہزاد اور رومیصہ کو چونکا گیا، رومیصہ اپنی پریشانی بھول کر ماں کو دیکھنے لگی جن کی متنفر نگاہیں اس وقت اسکرین پر میر حاکم پر جمی ہوئی تھیں۔

''ایسا کیا نقصان کر دیا ہے انہوں نے آپ کا، جو ایسا سوچ رہی ہیں آپ۔۔'' رومیصہ ایکدم جل کر بولی۔

''کبھی موقع ملا تو بتاؤں گی، ان لوگوں کے بہت قرض واجب ہیں، بہت سے لوگوں کی طرف۔۔'' وہ اپنا سیل فون اٹھا کر کمرے سے نکل گئیں، انہیں سیف الرحمٰن کے ساتھ ایک ڈنر پر جانا تھا۔

''اوشی میڈ؟'' رومیصہ نے شہزاد کی طرف دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

...ٹیک اٹ ایزی میری جان۔۔" شہزاد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"انسانیت بھی کسی چڑیا کا نام ہے، یوں کسی کی موت پر ایسے خوش ہوتا ہے کوئی۔؟" رومیصہ کے تو ویسے ہی اعصاب تنے ہوئے تھے اس لیے سارا غصہ تیتا بیگم پر اتر رہا تھا۔

"تم ان کو چھوڑو، اپنا خیال رکھو، آنکھوں کے نیچے حلقے کتنے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔" شہزاد نے دانستہ اس کی توجہ دوسری جانب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن رومیصہ اس وقت شدید قسم کی کھولن کا شکار تھی۔

ٹی وی اسکرین پر میر فیملی کے افراد میں ارسل کا نام ان کے نواسے کی حیثیت سے بار بار آ رہا تھا اور اس وقت ان کے گھر کے باہر کے لائیو مناظر دکھائے جا رہے تھے جب اس نے ارسل کو میر برہان کے پاس کھڑے دیکھا اور فوراً ہی اس کا نمبر ملایا۔ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا، اس نے خود ارسل کو اپنا سیل فون جیب سے نکال کر اپنی کال کاٹتے ہوئے دیکھا، وہ اس وقت اچھے خاصے اضطراب کا شکار لگ رہا تھا۔

"مجھے مسز قریشی کی طرف جانا ہے رومی۔۔" شہزاد اپنا سیل فون اٹھا کر کھڑی ہوئی، اس کے چہرے پر ہلکی سی تشویش تھی۔

"خیریت؟"

"آئی ڈونٹ نو، وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔" اس کی نظریں سیل فون پر آئے ہوئے ہادی کے ٹیکسٹ پر جمی ہوئی تھیں، اس نے اسے فوراً اپنے گھر آنے کی درخواست کی تھی، وہ ہادی کے اس اچانک میسج پر پریشان ہوتی گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل آئی۔

آدھے گھنٹے بعد اس کی گاڑی جیسے ہی مسز قریشی کے گھر میں داخل ہوئی، سامنے حمزہ کی گاڑی دیکھ کر اس کے قدم رکے، اس کا مطلب تھا وہ بھی اس وقت یہاں موجود تھا۔ شہزاد نے جب سے اسے ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا تب سے اس کی اپنی نیندیں حرام ہو چکی تھیں لیکن اس کے لیے اس لڑکی سے زیادہ پریشانی کی بات حمزہ کی نظروں میں موجود اجنبیت اور بیگانگی تھی، اسے علم تھا کہ وہ اس کی کوئی کولیگ یا دوست بھی ہو سکتی ہے اور شہزاد اس معاملے میں قطعاً بھی تنگ نظر نہیں تھی لیکن وہ اس طرح اسے نظر انداز کرے، یہ بات اس کے لیے تکلیف دہ تھی۔

وہ اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ سامنے کا منظر دیکھتے ہی اسے حیرت کا دھچکا لگا، مسز قریشی ہاتھ میں ٹشو پکڑے اپنے آنسو صاف کر رہی تھیں ان کے بالکل برابر میں کچھ خفا خفا سی مناہل اور سامنے والے صوفے پر ہادی اور حمزہ براجمان تھے۔ اسے دیکھتے ہی حمزہ نے اپنا سائیڈ پر رکھا سیل فون اٹھا کر خود کو مصروف دکھائی دینے کی ایکٹنگ شروع کر دی تھی۔

"تھینکس گاڈ! آپ آ گئیں شیری، آپ ہی سمجھائیں مام کو۔" ہادی اسے دیکھ کر بے اختیار کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کا عنصر غالب تھا۔

"مسز قریشی! سب ٹھیک ہے ناں؟" شہزاد کے لیے ان جیسی مضبوط اعصاب کی حامل عورت کی آنکھوں میں آنسوؤں کا دیکھنا انتہائی اچنبھے کی بات تھی۔ اس لیے وہ پریشانی سے مناہل سے ملی، جو خود بھی افسردہ دکھائی دے رہی تھی۔

"ذرا سی بات کو حواسوں پر سوار کر رکھا ہے انہوں نے۔" ہادی کے لہجے میں ماں کے لیے محبت ہی تھی۔

"یہ ذرا سی بات نہیں ہے ہادی۔" وہ ایک دم بھڑک اٹھیں۔

"مام! یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے، جس کو اپنے حواسوں پر سوار کیا جائے۔۔" اس نے دوبدو جواب دیا۔

"یاد رکھنا، اگر زرد ہوا کو کچھ ہوا تو میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پاتی ہوئی ناگواری سے بولیں جبکہ شہزاد یہ سارا قصہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"ممی! سمجھا کر بھیجا ہے اسے اور ویسے بھی وہ مر جائے گی لیکن میرا نام نہیں لے گی اپنے خاندان کے سامنے۔" ہادی کی بات پر مناہل نے بُرا سا منہ بنایا۔

"بے فکر رہیں، یہ ساری خاک میرے ہی سر میں ڈلے گی۔" وہ بیزاری سے گویا ہوئی۔

"لیں اب یہ محترمہ خفا ہو گئیں، شام سے یہی سلسلہ چل رہا ہے، ایک کا قبلہ درست ہوتا ہے تو دوسرا رخ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔" وہ ہلکا سا جھنجھلا گیا۔

"میرا خیال ہے، تم ان خواتین کو بیٹھ کر اکیلے میں بات کرنے دو۔"

حمزہ اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے کر کھڑا ہوا، اس نے ایک دفعہ بھی نگاہ اٹھا کر شہزاد کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ دانستہ اس کو نظر انداز کر رہا تھا۔ شہزاد کے اندر چھن کر کے کچھ ٹوٹا۔ وہ اپنے سیل فون پر آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو گیا اور بات کرتے ہوئے لونگ روم سے نکل گیا۔

شہزاد کو تھوڑی ہی دیر بعد مسز قریشی کی پریشانی کا مکمل پتا چل چکا تھا اور ایک گھنٹے کے بعد جب وہ انہیں اچھی طرح سے تسلی دے کر ان کے پاس سے اٹھی تو وہ کافی مطمئن ہو چکی تھیں اور اس بات پر شرمندہ ہو رہی تھیں کہ ہادی نے اسے رات کے اس وقت خوامخواہ زحمت دی، شہزاد نے جیسے ہی لان میں قدم رکھا، سامنے حمزہ اور ہادی بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ حمزہ نے صرف ایک نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس ایک نظر میں اس قدر لاتعلقی تھی کہ شہزاد کو اپنا دل کھائی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

"آپ جا رہی ہیں؟ ممی کچھ ریلکس ہوئیں کہ نہیں؟" ہادی اسے دیکھتے ہی فکرمند انداز میں کھڑا ہوا۔

"ڈونٹ وری، ایسے ہی تھوڑا اسٹریس لے لیا تھا، لیکن اب کافی ریلکس ہیں وہ۔۔" شہزاد نے بھی اس بار حمزہ کو مکمل نظر انداز کیا۔

"تھینک یو سو مچ شیری! مجھے پتا تھا، آپ انہیں کنوینس کر لیں گی، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کو ٹیکسٹ کر بیٹھا۔" وہ ہلکا سا شرمندہ ہوا۔

"اٹس اوکے ہادی! مسز قریشی کے لیے تو میں ہر وقت حاضر ہوں۔"

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی اور اس کی اس بات پر حمزہ نے بڑی جتاتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، عین اسی لمحے شہزاد کی نگاہیں اس سے ملیں، وہ اس کی نگاہ کے سب ہی زاویوں کو سمجھتی تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس وقت اس میں موجود طنز کی آمیزش کو محسوس نہ کر پاتی۔

"اوکے، ہادی میں بھی نکلتا ہوں، ان شاء اللہ کل ملتے ہیں۔"

حمزہ بھی ہاتھ میں پکڑا کافی کا خالی کپ میز پر رکھ کر ایک دم اٹھا، تو شہزاد کے ساتھ ساتھ ہادی نے بھی تعجب بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، وہ کندھے اچکا کر انہیں خدا حافظ کہہ کر اپنی گاڑی لیے باہر نکل آئی۔

وہ اپنی سوچوں میں گم ڈرائیو کر رہی تھی جب اسے حمزہ کی گاڑی اپنے گاڑی سے تھوڑے فاصلے پر محسوس ہوئی، وہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ شہزاد کے چہرے پر بے ساختہ ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اگرچہ وہ کافی مہارت کے ساتھ اس کے پیچھے تھا لیکن اس کی گاڑی کو اگر شہزاد ہی نہ پہچان پاتی تو ان کے درمیان موجود محبت کی سچائی پر انگلی اٹھائی جا سکتی تھی۔

اس کا گھر شہزاد کے گھر سے مختلف سیکٹر میں تھا اور وہ مسلسل اس کے پیچھے تھا، اسلام آباد کی سڑکوں پر رات کو ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی اس لیے حمزہ کے لیے خود کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھنا خاصا مشکل ہو رہا

تھا۔ وہ بیک مرر سے اب باقاعدہ اس کی اس حرکت کو انجوائے کر رہی تھی، اسے پہلی دفعہ اپنا ذہن تھوڑا پرسکون محسوس ہوا، یقیناً اس کے دل میں اس کے لیے کچھ تھا تب ہی تو رات کے اس پہر وہ اس کے پیچھے تھا، اور اسے یقین تھا کہ وہ اسے گھر تک پہنچائے بغیر واپس نہیں جائے گا۔ جیسے ہی وہ اپنی گلی میں داخل ہوئی حمزہ کی گاڑی تیزی سے اسے اوورٹیک کر کے آگے نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی شہرزاد کے دل میں اس کے لیے موجود بدگمانی کے رنگ بھی خاصے مدھم پڑ گئے، آج اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

☆☆☆

بڑی حویلی میں قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے پورا شہر یہاں امڈ آیا ہو، جوان موت پر کچھ لوگ تو حقیقتاً افسردہ تھے تو کچھ مخالفین ایسے موقعے پر بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اس خاندان کے ساتھ بہت اچھا ہوا۔ میر محتشم کے کندھے جھکے ہوئے لیکن حاکم صاحب کا طنطنہ ابھی بھی برقرار تھا۔ ان کا سیاسی حلقۂ احباب تو تھا ہی لیکن اس وقت ان کے سپورٹرز، رشتے دار، اور ملنے ملانے والوں کی بھی بہت بڑی تعداد یہاں موجود تھی۔

وہاں موجود لوگ میر وہاج کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے اور حاکم صاحب کے کچھ سیاسی حریف تو دبے دبے لفظوں میں یہاں تک کہہ رہے تھے کہ اس خاندان نے محض ہمدردی کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے گھرانے کے ایک فرد کی قربانی دی ہے، کیونکہ گھٹیا قسم کی سیاست میں کوئی رشتہ انسان کا اپنا نہیں ہوتا، جب دماغوں پر اقتدار کی ہوس ہو تو انسان سب سے پہلے اپنے بُرے بھلے کی تمیز ہی کھوتا ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اکثر خونی رشتے اپنے قریبی رشتوں کے خون کا خراج دے کر ہی اس مقام تک پہنچے تھے۔

جنازے سے ایک گھنٹہ پہلے درشہوار پیلے رنگ کی ٹیکسی میں بڑی حویلی پہنچی تو اسے گیٹ پر سیکیورٹی گارڈز نے روک لیا، وہاج میر کے قتل کے بعد تو ویسے ہی پولیس خاصی الرٹ تھی۔ حاکم صاحب کا اپنی ذاتی اثر و رسوخ کون سا کم تھا، اس لیے چند ہی گھنٹوں میں ان کے گھرانے کے کئی افراد کی سیکیورٹی بڑھا دی گئی تھی۔ حویلی کے لان میں جہاں میت رکھی تھی وہاں صرف خاص خاص لوگوں کو جانے دیا جا رہا تھا جبکہ عوام الناس کے لیے سامنے خالی پلاٹ میں شامیانے لگا کر انتظامات کیے گئے تھے، حویلی کے سامنے والے روڈ پر ہر طرف گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں۔

ایک طرف مختلف چینلز کے نمائندے کھڑے تھے جو وہاں پہنچنے والی ہر اہم شخصیت سے اس واقعے پر ان کا مؤقف جاننے کے لیے بے چین تھے تو دوسری طرف لائیو کوریج دکھائی جا رہی تھی۔

درشہوار کو اس بات کا قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اپنے ہی گھر میں جانے کے لیے اسے وہاں موجود لیڈیز پولیس کو اپنی شناخت کروانا ہو گی، اس نے سیاہ رنگ کی بڑی ساری چادر کے ساتھ خود کو سر سے لے کر پاؤں تک لپیٹا ہوا تھا اور چہرے پر بھی نقاب تھا، لیکن اس کی آنکھوں سے گھر کا کوئی بھی فرد اسے آسانی سے پہچان سکتا تھا، اس لیے وہ نظریں جھکائے گیٹ کی طرف بڑھی تھی، اسے اسلام آباد سے ملتان اور ایئرپورٹ سے حویلی پہنچنے میں تین گھنٹے لگے تھے، ہادی نے اپنے تمام سورسز کا استعمال کر کے اسے پہلی فلائیٹ سے بھجوا دیا تھا۔

وہ اس وقت لیڈیز پولیس کے ساتھ اندر جانے کے لیے بحث کر رہی تھی اور یہ منظر ارسل نے قدرے فاصلے سے حیرانی سے دیکھا اور سامنے موجود لڑکی کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ادھر آیا، اسے ایک دم اپنے سامنے دیکھ کر درشہوار ہلکا سا سٹ پٹائی لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

دوسری طرف ارسل کی نظریں جیسے ہی اس کے ساتھ ملیں، اس کا دماغ بھک کر کے اڑا لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

پاس ہی ہو درشہوار! کیا کرنے آئی ہو تم یہاں۔'' اس نے چند گہری سانسیں بھر کر خود کو پرسکون کیا۔

اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس پچویشن میں درشہوار کا آنا ایک اور قیامت برپا کر سکتا تھا لیکن سامنے بھی درشہوار تھی، جس کی آنکھیں اگرچہ شدت گریہ کی وجہ سے متورم تھیں لیکن ان میں موجود بغاوت اور اعتماد جوں کا توں تھا۔

''مجھے حویلی کے اندر لے چلو ارسل! وہاج بھائی کو آخری دفعہ دیکھنا ہے مجھے۔'' اپنی بات مکمل کرتے ہوئے جذبات پر قابو نہ پا سکی۔ پر حدت قطرے اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔

لیڈیز پولیس کو شاید اندازہ ہو گیا تھا، اس خاتون کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے، اس لیے وہ تھوڑا ہٹ کر کھڑی ہو گئیں، اب تجسس بھرے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''تم ایک ایسا عذاب ہو جو ہمارے اوپر مسلط کر دیا گیا ہے، کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی۔'' وہ غضب ناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میرا سگا بھائی مرا ہے ارسل! کوئی مجھے یہاں آنے سے روک سکتا ہے؟'' درشہوار رو پڑی اور اس کا دل تھوڑا نرم پڑا۔

''اب چلو میرے ساتھ اور خبردار کسی کے سامنے کوئی بکواس کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ کسی کو علم نہیں تم کیا کارنامہ سرانجام دے چکی ہو۔'' وہ غصے سے اس کا بازو پکڑ کر حویلی کے پچھلی سائیڈ والے دروازے کی طرف بڑھا۔

''خدا کے لیے ارسل! مجھ پر رحم کرو، ورنہ میں مر جاؤں گی، مجھے وہاج بھائی کو دیکھنا ہے۔'' وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

''ساری زندگی تمہارے ان ہی الٹے سیدھے کاموں نے ہمیں ذلیل کروایا ہے۔'' وہ سلگ اٹھا۔

شاہ میر اور برہان دونوں لوگوں کے ساتھ لان میں کھڑے تھے، انہوں نے تعجب سے ارسل کے ساتھ موجود مکمل پردے میں کسی خاتون کو دیکھا جس کا بازو غصے سے پکڑے ہوئے وہ تقریباً گھسیٹتے ہوئے حویلی کی پچھلی سائیڈ سے اندر کی طرف لے جا رہا تھا، شاہ میر نے اس کی پیروی کی اور برہان کچھ لمحوں کے لیے وہیں سوچ میں گم ہوئے اور پھر خود بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔

ارسل انتہائی مشتعل انداز میں اسے لے کر تاجدار بیگم کے کمرے میں داخل ہوا، جہاں ان کی خراب حالت کے پیش نظر خاندان بھر کی خواتین کا داخلہ ممنوع تھا، ان کے پاس اس وقت انا بیہ تھی، جو ارسل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتی درشہوار کو دیکھ کر بری طرح حواس باختہ ہوئی۔ اس کی ٹانگیں سن ہو گئیں۔

''لو دیکھ لو ہمارا تماشا، یہی دیکھنے آئی ہو ناں؟'' ارسل نے غصے کی انتہا کو چھوتے ہوئے اسے دھکا دینے کے انداز میں اندر کیا تھا، جبکہ درشہوار اس وقت کسی بھی ذلت یا بے عزتی کی پروا نہیں لا رہی تھی، اسے اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ اس گھر میں اس کا استقبال بدترین انداز میں کیا جائے گا، اس کی نظریں تاجدار بیگم پر پڑیں اور اس کے دل پر گویا گھونسا پڑا۔

''امی!'' درشہوار جذباتی انداز میں تاجدار بیگم کی طرف بڑھی، جو اس وقت نیند کے انجکشن کے زیر اثر سو رہی تھیں، لیکن ان کے چہرے پر پھیلی زردی اور صدمے کی کیفیت اتنی نمایاں تھی کہ درشہوار کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

ارسل کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتا شاہ میر بھی سامنے کا منظر دیکھ کر بھونچکا رہ گیا، درشہوار، تاجدار بیگم کا ہاتھ پکڑے بُری طرح سے رو رہی تھی۔ شاہ میر کے اندر طیش کی لہر نمودار ہوئی، وہ مشتعل انداز میں اس کی طرف

[illegible]
آنکھیں ابل کر باہر آئیں اور گلے سے ایک بھنچی ہوئی آواز نکلی۔

''کس کے ساتھ منہ کالا کر کے آئی ہو گھٹیا لڑکی، تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہاں آنے کی؟'' شاہ میر اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔

''پاگل ہو گئے ہو شاہ میر! کیا گھر میں ایک نیا تماشا شروع کرو گے۔''

ارسل نے بھاگ کر اس کی گردن شاہ میر کے ہاتھوں سے چھڑائی، درشہوار کا منہ سرخ ہو چکا تھا اور وہ اب بُری طرح سے کھانس رہی تھی، انابیہ نے خوف زدہ انداز میں یہ منظر دیکھا اور رہی سہی کسر برہان کی آمد نے پوری کر دی، وہ خوش شاکڈ نظروں سے سامنے کا منظر دیکھ رہے تھے، جبکہ شاہ میر اندرونی کیفیت کے زیر اثر اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ وہاج کے ساتھ ساتھ درشہوار کو بھی زندہ ہی دفن کر دے۔ اسے اپنے غصے پر قابو رکھنا ناممکن ہو رہا تھا۔

''میں چھوڑوں گا نہیں اس منحوس کو، اس نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔'' شاہ میر ایک دفعہ پھر اسے مارنے کے لیے لپکا، تو ارسل بیچ میں آ گیا، برہان ساری بات سمجھ چکے تھے اور دماغ ان کا بھی کھول رہا تھا۔۔

''برہان بھائی، پلیز اس بے وقوف کو سمجھائیں۔ کیوں ایک نئی مصیبت کھڑی کر رہا ہے ہمارے لیے۔۔'' ارسل جھنجلا گیا۔

''کہاں سے آئی ہو تم؟'' برہان نے ذرا سختی سے شاہ میر کا بازو پکڑ کر ایک طرف اور درشہوار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غصے سے پوچھا۔ وہ خود بھی اس وقت شدید طیش کے عالم میں تھے لیکن شاہ میر سے زیادہ موقعے کی نزاکت کو سمجھتے تھے۔

''کوئی غلط کام نہیں کیا میں نے، مناہل کے پاس تھی میں۔'' درشہوار نے برہان کی سماعتوں میں بم پھوڑا۔

برہان کا رنگ اڑا، اور انہوں نے سخت بے یقینی اور صدمے کی سی کیفیت کے ساتھ اپنی بہن کو دیکھا، جس نے ان کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا تھا، وہ کچھ لمبے سانس روک کے اسے جانچتی نگاہوں سے دیکھتے رہے، وہ ایک انچ بھی نہیں ہلی تھی۔

برہان کے دماغ میں عجیب سے خیالات کی یلغار ایک ساتھ ہی ہوئی کہ کیا یہ مناہل کی سازش تھی اس نے اپنا بدلہ لینے کے لیے اس کے خاندان کی عزت کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ من میں کوئی پھانس تھی، جس کی چبھن ایسی شدید تھی کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔

''کون ہے یہ مناہل؟'' شاہ میر نے زہر آلود لہجے میں پوچھا۔

''برہان بھائی بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔۔'' اس کی آواز میں ایسی کاٹ تھی کہ برہان کے ساتھ ساتھ انابیہ بھی اسے دیکھتی رہ گئی۔

''میں اب بھی کہتی ہوں، خدا کی قسم میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔'' اس کے لہجے کا بوجھل پن سب ہی کو بُرا لگا۔

''میں مانتی ہوں میں نے آپ سب کے ساتھ بہت بُرا کیا، لیکن میں اپنی غلطی پر سخت شرمندہ ہوں، مجھے مار دیں لیکن یہاں سے جانے کا مت کہیں۔'' وہ بہت بُری طرح سے رو رہی تھی۔

''شاہ میر تم اور ارسل، جنازہ تیار ہے اور تم لوگ اسے آخری دفعہ وہاج بھائی کا چہرہ دکھا دو، باقی حساب کتاب بعد میں ہوں گے۔'' برہان نے نظریں چرا کر کہا اور درشہوار سوکھی لکڑی کی طرح چٹخی، وہ اب بلند آواز میں سسکیاں لے رہی تھی۔

''لیکن برہان بھائی، دا جی اور بابا۔'' شاہ میر ہکلایا۔

''میں سب کو ہینڈل کر لوں گا، لیکن تم میں سے کوئی بھی اب اوور ری ایکٹ نہیں کرے گا، ویسے بھی خواتین بار بار اس کا پوچھ رہی ہیں۔۔'' برہان نے اپنی بات مکمل کی اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

شاہ میر بے یقینی سے ارسل کا چہرہ دیکھنے لگا، وہ دونوں مناہل نام کی کسی بھی خاتون سے واقف نہیں تھے، صرف انابیہ اسے اچھی طرح سے جانتی تھی، اور وہ یہ نام سننے کے بعد سر جھکائے مسلسل اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو گھور رہی تھی، اور ایک لمحے کو بھی اس کی نگاہوں کا ارتکاز نہیں ٹوٹا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی مناہل کے نام پر برہان کے جلتے وجود پر ایک دم سے برف کیوں آن گری تھی۔

☆☆☆

مارتھا اور جارج کی سرد نگاہیں، مونیکا اور ذوالکفل پر جمی ہوئی تھیں۔

اگرچہ دونوں کا استقبال یہاں بھی خوش دلی سے نہیں ہوا تھا لیکن کم از کم انہیں اس ذلت اور اذیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جو بڑی حویلی والوں نے ان کے نصیب میں لکھ دی تھی۔ دونوں دل سے ان سے شرمندہ تھے اور اس وقت نگاہیں جھکائے بیٹھے تھے۔

''آپ مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیں لیکن میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی، جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔'' مونیکا کا لہجہ ندامت سے پر تھا۔

''تم نے ایک بار بھی نہیں سوچا ہم اپنی کمیونٹی کے لوگوں کو کیا جواب دیں گے۔'' مارتھا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا منہ تھپڑوں سے لال کر دے۔ وہ آج بغیر بتائے اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گھر آ چکی تھی۔

''میں اس چیز کے لیے بہت زیادہ شرمندہ ہوں آپ سے۔'' مونیکا کا سر مزید جھک گیا۔

''پورے خاندان نے ہمارا بائیکاٹ کر رکھا ہے اور تمہارے باپ کے لیے پہلے مسائل کم تھے جو تم ان میں مزید اضافہ کرنے چلی آئی ہو۔'' کافی دیر سے خاموش بیٹھے جارج نے بھی ناراضی سے گفتگو میں حصہ لیا۔

''آئی ایم سوری بابا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے، اگر میں ذوالکفل سے شادی نہ بھی کرتی تو اپنی کمیونٹی کے کسی لڑکے سے شادی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی کم از کم میری زندگی میں۔'' اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔ اس کی بات پر اس کے والدین چونکے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' انہوں نے ناگواری سے پوچھا۔

''میں نے ان سے شادی کے لیے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ اسلام قبول کرنے کے بعد ذوالکفل نے میری درخواست پر مجھے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے اور اس بات پر ان کا بھی پورا خاندان ان سے خفا ہے۔'' مونیکا نے اصل بات بتائی تو کچھ لمحے تک اس کے والدین تو گویا قوت گویائی سے محروم ہو گئے۔

''تم یہ کہنا چاہتی کہ تم نے اپنا مذہب کسی لڑکے کے لیے نہیں چھوڑا؟'' جارج نے جانچتی نگاہوں سے بیٹی کا پرسکون چہرہ دیکھا۔

''ہرگز نہیں، مجھے اسلام قبول کرنا ہی تھا، اس کے بعد کسی بھی مسلم لڑکے کو اپنی زندگی کا ساتھی بناتی، وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔'' اس کے دوٹوک انداز پر مارتھا اور اس کے شوہر کو چپ لگ گئی، کیونکہ مونیکا کا لہجہ اس کی سچائی کی گواہی دے رہا تھا۔

''میں بھی آپ لوگوں سے بہت شرمندہ ہوں اور مجھے خوشی ہوگی، اگر آپ ہمیں کھلے دل سے معاف کر دیں گے۔'' ذوالکفل نے نرم لہجے میں ان دونوں کو مخاطب کیا تو انہوں نے چونک کر اس نوجوان کا چہرہ دیکھا۔

ذوالکفل کی گفتگو اور رکھ رکھاؤ سے انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کا تعلق کسی ٹھیک ٹھاک گھرانے سے ہے، ان کی بیٹی نے سوائے مذہب کے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔

"ظاہر ہے، اب ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔" جارج نے سب سے پہلے ہتھیار ڈالے۔

"لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، اسے ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔" ذوالکفل نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"اب یہ خوش رہے یا نہ رہے اس کی قسمت، اب اس کے لیے واپسی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔" جارج نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"لیکن میری دلی خواہش ہے کہ آپ لوگ مجھے دل سے معاف کر دیں۔۔۔" مونیکا نے جذباتی انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"خداوند سے ہماری دلی دعا ہے کہ تم جہاں رہو، خوش رہو۔" جارج نے نظریں چرا کر کہا۔ وہ ان کے دل کا ٹکڑا تھی اور وہ زیادہ دیر تک اس سے خفا نہیں رہ سکتے تھے، اس لیے انہوں نے اسے معاف کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"میں تم دونوں کے لیے کمرہ سیٹ کرواتی ہوں۔۔۔" مارتھا بھی کچھ سوچ کر کھڑی ہوئی اور اس کے منہ سے نکلنے والے اس جملے نے دونوں کو پرسکون کیا۔

رات کے وقت جب سرد مہری کی برف کافی حد تک پگھل چکی تھی، مونیکا، باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس چلی آئی، اسے ایک ہی گھنٹے میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا یہ فیصلہ حقیقتاً اس کے خاندان کو خاصا مہنگا پڑا ہے۔

"اس گھر کا کیا بنا، وہ لوگ جو دھمکیاں دے رہے تھے؟" مونیکا کو ایک دم یاد آیا کہ جب وہ یہ گھر چھوڑ کر گئی تھی تو اس وقت یہ مسئلہ خاصے زور و شور سے چل رہا تھا۔

"اس آدمی کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ پچھلے ایک ماہ سے اپنے گاؤں گیا ہوا ہے، لیکن ہمیں اب پتا چلا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اور ہے۔" مونیکا نے روٹی توے پر ڈالتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں، کون لوگ ہیں اس کے پیچھے؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہمارے گھر پر بڑی حویلی والوں کی نظر ہے اور وہ یہاں پر کوئی پلازہ کھڑا کرنا چاہتے ہیں، وہ آدمی تو صرف مڈل مین ہے اور اس کو ہر قیمت پر یہ کمرشل جگہ خالی کروانے کے آرڈرز ملے ہوئے ہیں۔" مارتھا نے پریشانی سے بتایا۔

"وہ بڑی حویلی کے شاہ صاحب؟" مونیکا کا دل ایک دم دھڑکا، کیونکہ وہ جانتی تھی، اس حویلی میں اس کا سسرال آباد ہے اور اس بات سے اس کے والدین آگاہ نہیں تھے کہ ذوالکفل کا تعلق اسی شہر کے ایک نامور خاندان سے ہے۔

"اس شہر میں ان کے علاوہ کون اتنا لالچی اور خود غرض ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کمزور اور غریب لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہے، خداوند انہیں ذلیل و خوار کرے۔" مارتھا کی رائے ان کے بارے میں خاصی منفی تھی۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"اس علاقے کا بچہ بچہ جانتا ہے، یہاں پر ان کی حکومت چلتی ہے اور ان کی مرضی کے بغیر تو یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"آپ پریشان مت ہوں، میں ذوالکفل سے بات کر کے یہ مسئلہ سلجھانے کی کوشش کروں گی۔" کچھ دیر سوچ و بچار کے بعد مونیکا نے ماں کو تسلی دی۔

"وہ بے چارہ کیا کر لے گا؟ اسے کیا پتا ان حویلی والوں کی گھٹیا حرکتوں کا؟"

"ان سے زیادہ حویلی والوں کو اور کوئی نہیں جان سکتا۔" مونیکا کی بات پر روٹی بیلتی ہوئی مارتھا چونکی۔

"کیا مطلب؟ تمہارا شوہر کیسے جانتا ہے ان کو؟" اس کی فکر مندی فطری تھی۔

"اس لیے کہ یہ حویلی والوں کا ہی خون ہے، میرا مطلب ہے شاہ جی، اس کے سگے والد ہیں۔" مونیکا کی بات پر مارتھا کا ہاتھ کانپا اور روٹی ہاتھ سے چھوٹ کر شیلف پر جا گری۔ اس کا ہاتھ گرم توے سے ٹکرایا تو اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ پیچھے کیا، جو اس وقت آگ کی حدت سے سرخ ہو چکا تھا، لیکن یہ حدت اس آگ سے کم تھی جو مونیکا کی بات سن کر اس کے دل میں اٹھی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں ٹہلتے ہوئے شہرزاد کو ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔

یہ اس کی شروع سے عادت تھی، وہ جب بھی کسی چیز پر غور و فکر کرتی تو اٹھ کر ٹہلنے لگتی اور دماغ میں اس وقت اسی مسئلے سے تعلق رکھنے والی چیزیں چل رہی ہوتیں اور کوئی نہ کوئی حل جب تک نکل نہ آتا، وہ سکون سے نہ بیٹھ پاتی۔ اسے آج حقیقتاً درشہوار کے بارے میں جان کر حیرت ہوئی، اگرچہ واج کی موت نے اسے بھی پریشان کیا تھا کیونکہ صندل کیس کا اہم ملزم ہی اگر بیچ سے نکل جاتا تو باقی کیس کی کوئی وقعت ہی نہ رہتی، لیکن اس سے بھی پریشان کن درشہوار کی بغاوت تھی اور وہ مر کر بھی اس بات کا یقین نہیں کر سکتی تھی کہ اس خاندان کی کوئی لڑکی اس حد تک نڈر ہو سکتی ہے۔

اسے اب پہلی بار احساس ہوا تھا کہ مسز قریشی نے اتنے عجلت بھرے انداز میں صندل کیس کو لانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا کیونکہ اس موقعے پر میر فیملی کو کسی اور مسئلے میں الجھانا ضروری تھا اور وہ اپنی حکمت عملی سے اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہی تھیں۔

"یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی لڑکے کی شہ کے بغیر کوئی لڑکی اتنا بڑا قدم اٹھالے؟" اس سوچ نے اسے الجھا دیا تھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں، مسز قریشی اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے اس سے غلط بیانی کر رہی ہوں۔۔۔" شہرزاد کو اگلی سوچ نے پریشان کیا لیکن اس کے دماغ نے فوراً ہی اس چیز کو رد کر دیا۔

"نہیں، ان جیسی اصول پسند خاتون ایسا کیوں کریں گی بھلا۔" اس کے دماغ نے دلیل پیش کی۔

"مجھے حمزہ سے پوچھنا چاہیے، اس سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا ہوگا کہ اصل سچویشن کیا ہے۔" اس نے جیسے ہی سیل فون اٹھایا تو اسے یاد آیا، ان دونوں کی تو آپس میں ناراضی چل رہی ہے۔ وہ ہلکی سی کوفت کا شکار ہوئی۔ اس نے کچھ لمحے سوچا اور پھر تھک ہار کر حمزہ کا نمبر ملایا۔

تیسری بیل پر اس کی کال کاٹ دی گئی، شہرزاد کو اپنی شدید قسم کی ہتک کا احساس ہوا، اس نے غصے سے کانٹیکٹ لسٹ نکالی اور اس میں سے حمزہ کے سارے نمبر ایک ایک کر کے ڈیلیٹ کر دیے، وہ اب خود بھی اس سے ناراض ہو چکی تھی۔

اسی وقت ملازمہ ہلکا سا دروازہ بجا کر کمرے میں داخل ہوئی، اس کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کا عنصر غالب تھا۔ شہرزاد اس کا چہرہ دیکھ کر چونکی۔

"کیا ہوا رشیدہ؟ سب خیریت تو ہے ناں؟"

"رومیصہ بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، شام سے الٹیاں کر رہی ہیں وہ۔" رشیدہ کی اطلاع پر اسے کرنٹ لگا۔

"تم نے ماما کو نہیں بتایا؟" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پریشانی سے بولی۔

"وہ ابھی تک گھر واپس نہیں آئیں۔۔۔"

شہرزاد نے کمرے کے دروازے سے پلٹ کر وال کلاک کی طرف دیکھا، اس وقت رات کے سوا بارہ بج

رہے تھے، وہ لاپروائی سے سر جھٹک کر رومیصہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی، اس وقت اس کے لیے سب سے اہم اس کی بہن تھی اور اتنا تو وہ بھی جانتی تھی، رومی کی کنڈیشن دن بہ دن گر رہی ہے، اور وہ اس کے اور مام کے بار بار کہنے کے باوجود ان کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس نہیں جا رہی۔

شہرزاد جس وقت کمرے میں داخل ہوئی، اس وقت رومیصہ واش روم میں تھی اور دروازہ بند تھا، وہ پریشانی سے اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی، اس کا سیل فون سائیڈ میز پر رکھا ہوا تھا اور اس وقت اس پر ارسل کا نام بلنک کر رہا تھا، چونکہ فون سائیلنٹ موڈ پر تھا اس لیے اس کی آواز رومیصہ تک پہنچنے سے قاصر تھی، شہرزاد کو یہ نام دیکھ کر تھوڑا عجیب سا احساس ہوا۔ اس کے دماغ میں حمزہ کے کہے ہوئے جملے گونجے۔

کال ایک دفعہ آ کر بند ہو چکی تھی، اور ٹھیک ایک منٹ کے بعد دوبارہ سے وہی نمبر اسکرین پر بلنک کرنے لگا۔ شہرزاد نے کال اٹینڈ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے آہستہ سے کال اٹینڈ کر کے سیل فون اپنے کان سے لگا لیا، رشیدہ منتظر نگاہوں سے اس کے سامنے کھڑی تھی، شہرزاد نے اسے انگلی کے اشارے سے باہر جانے کو کہا۔

دوسری طرف موجود ارسل وہاج کی تدفین اور مہمانوں سے نبٹ کر اسے کال کرنے خاص طور پر لان میں آیا تھا، اسے رومی کی صبح سے آنے والی بیس کالز سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نہ صرف اس کے لیے پریشان تھی بلکہ ہو سکتا ہے اس سے ٹھیک ٹھاک خفا بھی ہو۔

شہرزاد نے جیسے ہی کال اٹینڈ کی، وہ منہ سے ایک لفظ نہیں بولی، جبکہ دوسری جانب موجود ارسل اس کی خاموشی کو اس کی ناراضی سمجھ کر شروع ہو گیا۔

”آئی ایم سوری میری جان! مجھے پتا ہے تم مجھ سے ٹھیک ٹھاک خفا ہو، لیکن بائے گاڈ ایسی چویشن میں پھنسا ہوا تھا کہ تمہاری کوئی کال نہیں لے سکا، ہمارا پورا خاندان اس وقت شدید قسم کے جذباتی دھچکے سے دوچار ہے۔“ ارسل کے بے تکلفانہ انداز پر شہرزاد چونک گئی۔

”پلیز رومی! بولو تو سہی یار، ٹرسٹ می یار، جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا، اچھا تم یہ بتاؤ، گائناکولوجسٹ کے پاس گئی تھیں، آج ہماری اپائنٹمنٹ بھی تھی۔“ ارسل کی اس بات نے شہرزاد کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہری دوڑا دی۔

اسے لگا وہ اب کبھی نہیں بول پائے گی۔

”رومی! میرا نہ سہی اپنے ہونے والے بچے کا ہی خیال کر لو، پلیز تھوک دو غصہ، کچھ تو بولو، میں دو چار دن میں واپس آنے کی کوشش کرتا ہوں میری جان، پھر بیٹھ کر اس مسئلے کا کوئی سیریس حل نکالیں گے۔“ دوسری طرف ارسل اس کے نہ بولنے پر ٹھیک ٹھاک پریشان ہو چکا تھا۔

شہرزاد کو لگا جیسے کسی نے خنجر اس کی پیٹھ میں گھونپ دیا ہو، یا کسی نے چھری کے ساتھ اسے ذبح کر دیا ہو—— رومیصہ کی خراب حالت کی اصل وجہ جان کر اسے لگا جیسے کسی دہکتی ہوئی بھٹی میں آن گری تھی۔

اسی وقت رومیصہ واش روم دروازہ کھول کر باہر نکلی اور سامنے بیڈ پر بیٹھی شہرزاد کے ہاتھ میں اپنا سیل فون دیکھ کر اس کے پاؤں زمین پر جم گئے، اسے لگا جیسے وہ قیامت تک اپنی پلکوں کو جنبش نہیں دے پائے گی کیونکہ شہرزاد کی آنکھوں میں اس وقت تنفر، بدگمانی اور ناراضی کا ایک جہان آباد تھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے، اور اس کی سرد نظریں رومیصہ کے وجود پر گڑی ہوئی تھیں۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ

... for more novels and digests

وہ کون تھی؟

اس بات سے تو وہ دونوں یکسر نابلد تھیں مگر وہ جو کوئی بھی تھی، ان کی زندگیوں کو گھن لگا گئی تھی۔

اجالا تین برس کی تھی اور سویرا فقط چھ ماہ کی جب وہ ان کے باپ کی دہلیز عبور کر کے ان کی زیست پر اپنی ممتا کے دروازے بند کر گئی تھی۔

دادی کے دھپ اور جھڑکیاں سہتے یہی الفاظ سننے کو ملے کہ ان کی ماں بھگوڑی تھی۔ شوہر کے گھر اور عزت پر چار حرف بھیج کر کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

دادی کے انتقال کے بعد دوسری ماں ان کی جانشین ثابت ہوئی پیکر نفرت!

مٹی کے چولہے میں لکڑیاں جھونک کر انہیں پھونک مار مار کر سلگاتے دبے پاؤں رخصت ہو گیا۔ نہ تو اس کے ہاتھ میں کوئی کھلونا آیا تھا اور نہ ہی کسی نے گڑیا تھمائی تھی۔ تیزی سے لڑکپن اور جوانی کی جانب قدم بڑھے تو اس نے بنا کسی کی ہدایت کے آنچل کو اپنے وجود کا حصہ بنا لیا۔

کہنے کو صرف اماں سوتیلی تھیں مگر ابا کا رویہ سوتیلوں سے کم ہرگز نہ تھا۔

وقت ان ہی رنگوں سمیت اپنی اڑان بھرتا گیا۔

ابا کے رویے میں بھی کوئی بدلاؤ پیدا نہ ہو سکا۔

ان دونوں میں سے کوئی انہیں کھانا دیتا تو وہ

حمیرا عروش

اجالا اور سویرا

وہ دونوں اس کی آنکھوں کی چبھن تھیں۔ وہ ان کے بال سنوارتی تو اتنی زور سے کھینچتی کہ نازک وجود بل کر رہ جائے۔ نہلاتی تو ایسے زور زور سے دھپ رسید کرتی کہ کمر پر انگلیوں کے نشان ثبت ہو جاتے۔

پہلے پہل وہ بھی سویرا کی طرح دھاڑیں مار مار کر روتی تھی مگر یہ عادت ہوش سنبھالنے کے بعد ہچکیوں اور سسکیوں میں بدلتی چلی گئی۔

وہ سات برس کی تھی۔ جب سویرا کے تمام امور اسے سونپ دیے گئے تھے۔ کپڑے دھونا، نہلانا، دھلانا، کھانا کھلانا غرض سب ہی کام وہ کرنے لگی۔

جلد ہی نئے بہن بھائیوں کی آمد کا سلسلہ چل نکلا۔

اس کا بچپن ٹھٹھرتی سردی میں ان کے کپڑے دھوتے اور شدید گرمی میں گیس کی قلت کے باعث

کھانے سے انکاری ہو جاتے۔ ان کا پکڑایا ہوا پانی کا گلاس پینا ان پر گویا حرام ہوتا۔ مجبوراً ان کے امور کے لیے مہر النساء کو زحمت اٹھانی پڑتی۔

وہ دونوں اس عورت کی بیٹیاں تھیں جس کی وجہ سے وہ آج بھی زمانے سے نگاہیں نہ ملا پاتے تھے۔ اس عورت کا حوالہ ان دو وجودوں سے جڑا تھا۔

کبھی انہیں ان سے عجیب نفرت محسوس ہوتی۔ نادانستگی و لاشعوری طور پر شاید وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ صرف افشاں کی بیٹیاں ہیں۔ وہ ان کا اپنا بھی خون ہیں۔ یہ بات وہ یکسر فراموش کر بیٹھے تھے تب ہی نہ انہوں نے کبھی ان کے سر پر دست شفقت رکھا تھا اور نہ کبھی ان کی پیار بھری پکار انہیں نصیب ہوئی تھی۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی چہرے پر ناگوار تاثرات

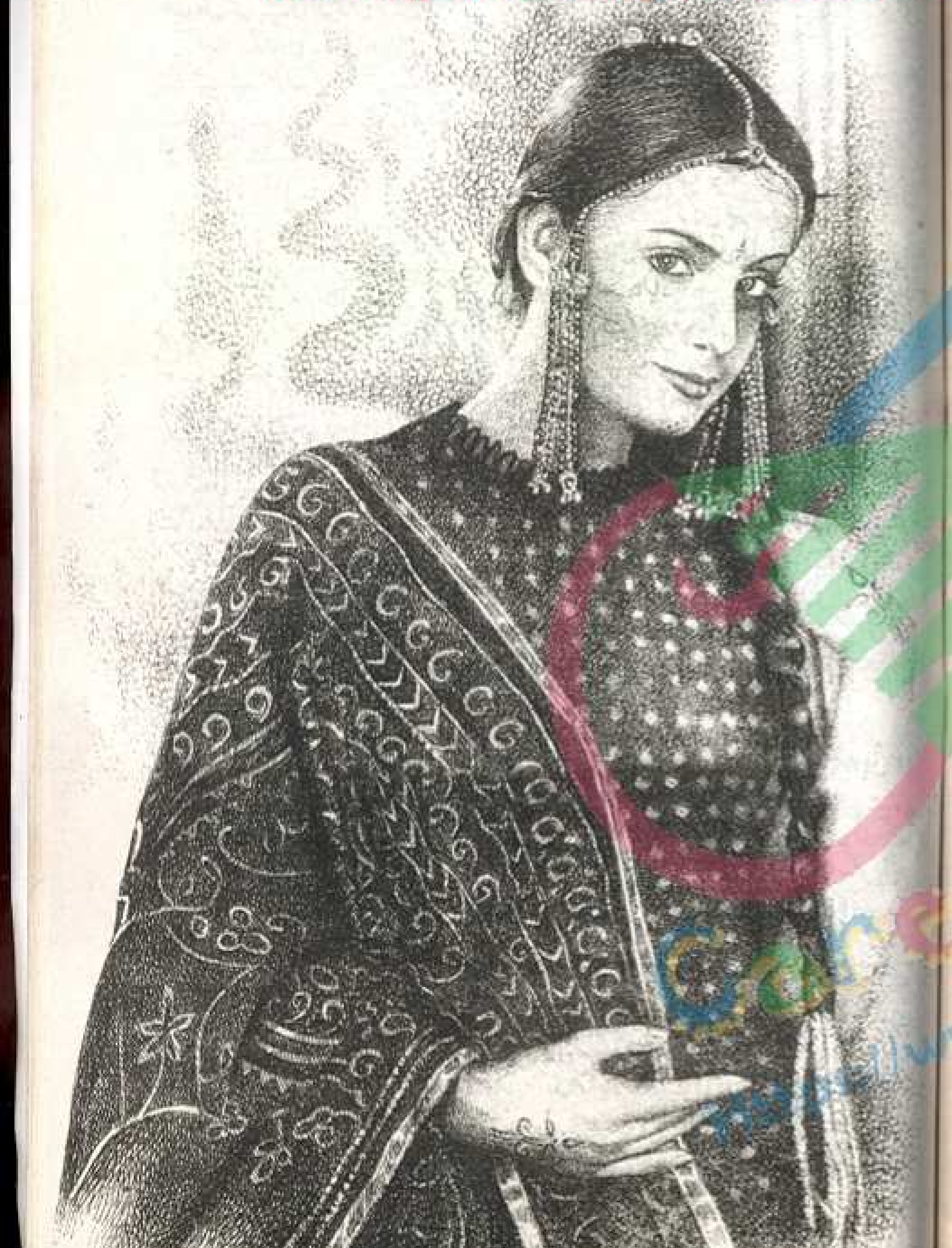

کھدروں میں چھپنے کی جگہ تلاش کرتیں۔

اجالا نے ابا کی بے رخی اور اماں کے طعنے سہتے سہتے جیسے تیسے میٹرک کیا اور اس کے بعد ابا نے سختی سے قدم گھر سے باہر نکالنے سے منع کر دیا۔ اس نے بھی آگے پڑھنے کے لیے حجت نہ کی۔

پھر آناً فاناً ابا نے اس کا رشتہ اپنے بھتیجے سے طے کر دیا اور ایک سوگوار سی شام وہ سویرا کو سسکتا چھوڑ کر رخصت بھی ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد سویرا اکیلی بولائی بولائی کام نمٹاتی پھرتی۔ کبھی غیر ارادی طور پر اسے پکار بیٹھتی تو دل بھر آتا۔ بیٹھ کر خوب آنسو بہاتی۔ جب تک کہ اماں کی پاٹ دار آواز کانوں میں نہ پڑتی۔

ابا نے اجالا کو کراچی سے پنڈی رخصت کیا تھا۔ شادی کے بعد ایک بار بھی وہ نہیں آئی۔ یہاں سے بھی کوئی ملنے نہ گیا۔

ابا کے سر سے ایک بوجھ سرک گیا تھا۔ ان کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا لہٰذا وہ مطمئن تھے۔

اس کے لیے تنہائی کاٹنا عذاب بن گیا تھا۔ ماں نہ ہو تو بڑی بہنوں میں ماں کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد وہ محسوس کر پائی تھی کہ وہ سنجیدہ سی لڑکی بھی اپنے دل میں اس کے لیے بے پایاں محبت رکھتی تھی۔ ہر امر میں اس کے لیے ڈھال بن جاتی۔ اب ہر پریشانی کی زد پر تنہا اس کی ذات کو آنا تھا۔ یہ سوچ ہی جان لیوا تھی۔

اماں ابا اور بہن بھائیوں سے موہوم سا اجنبیت بھرا تعلق تھا۔ اماں صرف کام کے وقت ہی پکارتیں۔

شادی کے تین ماہ بعد وہ میکے آئی تھی۔ دونوں بے قراری سے ملیں گویا برسوں کی بچھڑی ملی ہوں۔ سویرا کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ بار بار ہاتھ کی پشت پر زور سے چٹکی کاٹتی مبادا یہ کوئی خواب یا گمان نہ ہو مگر صد شکر کہ وہ نہ کوئی خواب ثابت ہوا، نہ گمان!

اسے دیکھ کر اماں کی تیوری پر بل آ گئے تھے۔ شادی کے بعد پہلی بار میکے آئی تھی۔ خاطر مدارات کی دنیا دکھاوے کے لیے ہی سہی مگر اسے خالی ہاتھ بھی رخصت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اجالا کا شوہر اسے ایک ماہ کے لیے چھوڑ گیا۔ سویرا کی خوشی سوا ہو گئی۔ ایک ماہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ وہ سویرا کو ڈھیروں پیار و التفات کا مظاہرہ اور اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر کے ایک بار پھر رخصت ہو گئی۔ وہ گھر یار آنکھوں سے اسے چپ چاپ جاتا دیکھتی رہ گئی۔

زندگی ایک بار پھر معمول پر لوٹ آئی۔ پڑھائی اور گھر کی مصروفیات میں وہ گھن چکر بن کر رہ گئی۔

اماں کو خوش کرنا بڑا دشوار امر تھا۔ اس کا کیا گیا ہر کام ان کی تیوریاں چڑھا دیتا۔

وقت دبے پاؤں اپنی رفتار ناپتا کھسکتا رہا۔ میٹرک میں شاندار کامیابی حاصل کرنے پر اسے گورنمنٹ کی جانب سے اچھا خاصا وظیفہ ملا تھا۔

لاشعوری طور پر زندگی کو جیتے جیتے وہ اپنا ہر امر عبادت سمجھ کر کرنے لگی تھی تب ہی یہ کامیابی مقدر بنی تھی جو کہ توقع سے بڑھ کر تھی کیونکہ اماں ابا کے ناروا سلوک نے جو احساس کمتری کا سیال اس کے اندر بھرا تھا۔ اس نے ہمیشہ خود کو دوسروں سے دو قدم پیچھے ہی پایا تھا۔

خود کو لاتعداد طلبہ و طالبات میں منفرد پا کر وہ ہیجان زدہ ہو گئی تھی۔ اتنی بڑی خوشی ملی تھی۔

کہ وہ تحیر و تعجب کی زد میں خوش بھی نہ ہو پائی۔ بس ایک ولولہ تھا کہ رگوں میں دوڑتے لہو کے ساتھ سرایت کرنے لگا تھا۔ وہ جذبہ آگے بڑھنے کا تھا۔

وہ زندگی میں پہلی بار ابا کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔ ابا اتنی آسانی سے اپنی کہی سے پیچھے ہٹنے والے نہ تھے۔ مگر حیرت انگیز طور پر اجالا نے فون پر نجانے کیا سحر پھونکا تھا کہ انہوں نے بے دلی سے ہی سہی مگر اجازت دے دی تھی۔

وہ کالج کی پڑھائی میں دل و جان سے مصروف ہو گئی۔ دن پر لگا کر اڑنے لگے۔ وہ پوری تندہی سے کامیابیاں سمیٹنے لگی۔

وہی اس کی [illegible] ابا شدید علیل ہو گئے۔ ان کا جنرل اسٹور روحان کے قبضے میں چلا گیا۔ عام حالات میں ابا اس پر کبھی بھروسا نہ کرتے تھے مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ ابا کی علالت سے گھر کے اخراجات میں کمی نہ ہوئی تھی بلکہ ان کی دوا کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔

روحان جس قدر آرام طلب طبیعت کا مالک تھا۔ اس سے کہیں زیادہ شاہ خرچ اور رنگین طبیعت کا مالک تھا۔ رفتہ رفتہ ابا کی سوجھ بوجھ اور دانش مندی سے اسٹور میں سینت سینت کر رکھا گیا سامان بڑھنے کے بجائے نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

ابا کا اسٹور اوباش لڑکوں کی ـــــ آماجگاہ بن گیا۔

اماں کو تو اپنے جوان بیٹے پر اعتبار، فخر، اعتماد، بھروسا، غرور بھی کچھ تھا۔ وہ ان ماؤں میں سے تھیں جنہیں اپنی اولاد کی خامیاں بھی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں۔

ابا بستر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ بڑھاپے پر بیماری مغلوب ہوئی تو وہ مزید نحیف دکھنے لگے۔

ایک روز روحان منہ لٹکائے گھر میں داخل ہوا۔ اماں کو بیٹے کی آمد کا احساس ہوا تو ابا کے پاس سے اٹھ کر باہر آ کر حسب معمول خوشامدانہ تاثرات چہرے پر سجائے گویا ہوئیں۔

''آ گیا میرا چاند...... میرا شہزادہ!'' مگر دوسری جانب پروا کسے تھی؟

اس کے چہرے پر بارہ بجے ہوئے تھے۔ وہ منہ لٹکائے برآمدے میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اماں کو اچنبھا ہوا۔ لاڈلے سپوت کے چہرے پر تفکر کے رنگ ذرا نہ جچتے تھے۔ ان کا دل ہولنے لگا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے فوراً اس کے قریب آ بیٹھیں۔

''پریشان لگ رہا ہے؟ میرے پتر کیا بات ہے؟''

لاڈلے سپوت نے جو گوہر افشانی کی تو اماں کے پیروں تلے صرف زمین نہیں کھسکی تھی بلکہ دن میں تارے بھی نظر آ گئے تھے۔

روحان کے لیے پانی کا گلاس لاتی سویرا کے ہاتھوں میں گلاس لرز [illegible] اور پانی چھلک پڑا۔ برآمدے سے ملحق کمرے میں انڈیا کے کسی ڈرامے پر تبصرے کے دوران ہنستی مہر النساء اور شاہ کی ہنسی کو بھی بریک لگی۔

''جوئے میں اسٹور چلا گیا ہے۔ اماں!'' یہ جملہ سن کر بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

اماں کے اوسان خطا ہو گئے۔ انہیں سمجھنے میں دشواری ہوئی کہ سینہ کوبی کریں یا ہمیشہ کی طرح شوہر کے سامنے اولاد کی برائی پر پردہ ڈالنے کے لیے کوئی تاویل پیش کریں۔

وہ اسٹور ابا کے روزگار کا واحد ذریعہ تھا۔ ان کی عمر بھر کی کمائی تھا۔ انہیں اس سے محبت بھی خوب تھی۔ ان کے علم میں بیٹے کا کارنامہ آیا تو انہیں اسٹور کھونے سے زیادہ روحان کے عمل سے تکلیف پہنچی۔

ایک دن وہ اسے جوئے کے اڈے سے گدی سے پکڑ کر لائے تھے۔ گھر آ کر خوب درگت بنائی تب اماں حمایت میں احتجاجاً بولیں۔

''میرے معصوم کو کیا خبر جوا کیا ہے؟ دوستوں کی باتوں میں آ کر یونہی چلا گیا ہوگا ورنہ میرا شہزادہ ایسا تھوڑی ہے۔''

انہوں نے فوراً ابا کی مزید مار سے اسے بچا کر سینے سے لگا لیا اور تب تک نہ چھوڑا جب تک کہ اسے خود اپنی معصومیت کا یقین نہ آ گیا۔ اس کی ہر برائی پر اماں یونہی پردہ ڈالتی تھیں۔ ان کی طرف داریوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ وہ من مانی کرنے کا عادی بنتا چلا گیا۔ اماں پھر بھی واری صدقے ہوتے نہ تھکتیں۔ ابا کی معمولی سختی سے بچانے کے لیے اکثر و بیشتر جھوٹے جواز پیش کرنے سے بھی نہ چوکتیں۔

اس واقعے کے بعد ابا مزید ڈھے گئے۔ ساتھ ہی تنگ دستی نے بھی چوکھٹ پکڑ لی۔ اماں کا کلمہ کہ میری اولاد کا کوئی عمل غلط نہیں ہو سکتا۔ پانچوں اولادوں کے اذہان میں پختہ ہو چکا تھا۔ خاص کر روحان کو جو انفرادیت اور لاڈ ملا تھا۔ اس کی بدولت وہ ہنوز خود کو سب سے منفرد گردانتا تھا۔ اسی انفرادیت

رو بنا دیا تھا۔

ایک شام جب وہ دو انگلیوں کے درمیان سگریٹ پھنسائے جھومتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر اماں کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اس کا دماغ ٹھکانے پر آیا تو باز پرس کے نتیجے میں وہ بھتیجے سے اکھڑ گیا اور اماں کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈانٹنے کا خمیازہ اماں کو اس طرح بھگتنا پڑا کہ وہ انہیں پوری طاقت سے دھکیل کر باہر نکل گیا۔

یہ تمام صورت حال دیکھ کر چارپائی پر پڑے نحیف و نزار ابا کی کیا مجال تھی کہ جوان سال بیٹے سے باز پرس کرتے۔ وہ تو یوں بھی اس کی گرج دار آواز سن کر سہم جاتے تھے۔ جب وہ اپنی بات منوانے کے لیے ماں، بہنوں پر چیخ چلا کر حکم چلاتا تھا۔

گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ حالات ابتر ہو گئے۔ اماں ہیجان زدہ دکھائی دینے لگیں۔ ابا پر دوائیں اور متوازن خوراک کی عدم فراہمی کے باعث بے ہوشی سی طاری رہنے لگی۔

اماں کی خالی نظریں کچھ سوال لیے اس کی جانب اٹھنے لگی تھیں۔ وہ جوان کی نظر میں بھی قابل اعتنا نہ تھی۔ ہمیشہ جس کا حصہ بنانا وہ دانستہ بھول جاتی تھیں۔ جس کے کام میں رتی بھر کوتاہی کو اس کی ماں کے کردار سے منسوب کر کے اسے اذیت و ندامت کی دلدل میں گھسیٹا جاتا تھا۔ مار مار کر جس کے گال دہکا کر بھی دل ہنوز بے کل ہی رہتا تھا۔

وہ اتنی سمجھ دار ضرور تھی کہ ان نگاہوں کا مفہوم سمجھ لیتی۔

"اماں! میں کئی جگہوں پر اپلائی کر چکی ہوں۔ دعا کریں، جلد کہیں سے بلاوا آ جائے۔"

اماں نے دعا کی تھی یا نہیں مگر اگلے ہی روز ایک میڈیسن کمپنی سے اپائنٹمنٹ لیٹر موصول ہو گیا تھا۔

اس دن سے گھر کا بار اس نے بنا احساس دلائے اپنے شانوں پر لے لیا تھا۔

ایک نئے کٹھن دور کا آغاز ہوا۔ وہ سورج طلوع ہونے ... سارا دن مشقت کی نذر ہو جاتا۔ لاکھوں کا کام ... والے مہینے کے آخر میں چند ہزار ہتھیلی پر رکھ کر بری الذمہ ہو جاتے۔ وہ جوں کی توں وہ رقم اماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتی۔ اپنے پاس بمشکل کرائے کے چند سو بچتے۔

گھر کے حالات نسبتاً سہل ہونے لگے تھے۔

دن ایک ہی رو میں گزر رہے تھے۔ اتوار کو بھی آدھے دن کے لیے کمپنی بلا لیا جاتا۔

اس بار اجالا دو سال بعد آئی تھی۔ اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ دیکھ کر بیمار گمان ہوتا تھا۔ جس عمر میں آنکھیں خواب سجاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت تھکن سمائی رہتی۔

اس کے پیروں میں گویا چکر فٹ تھا۔ بھاگتی دوڑتی کسی فرض شناس سربراہ کی مانند کام نپٹاتی پھرتی۔ اماں ابا اور بہنوں کا خیال رکھتی۔ خود اپنی ذات اس نے نجانے کہاں گم کر دی تھی؟

وہ جو بھی کھانا کھانے کے لیے بھی اجالا کی ہدایت کی منتظر ہوا کرتی تھی۔ اب ایسی اجنبیت اس کی ذات پر چھائی ہوئی تھی کہ کئی مرتبہ اس کی غیر موجودگی میں اجالا پھپک پھپک کر رو دی۔

وہ جس بہن کو چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ نجانے کب ماضی کا قصہ پارینہ بن گئی؟

یہ انجانے احساسات و جذبات سے عاری لڑکی تو کوئی اور ہی تھی۔ وہ ایک ماہ تک یہاں ٹھہری تھی اور ان تیس دنوں میں کوئی دن ایسا نہ تھا کہ اس نے گھر پر گزارا ہو۔ اس کی استفہامیہ نظروں کے جواب میں اس کے پاس ہزار جواز ہوتے یا شاید وہ اسی قدر مصروف رہنے لگی تھی۔

بہرکیف وہ بہن سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کے ارمان دل میں دبائے شکستہ دل، گھر لوٹ آئی۔

☆☆☆

زندگی میں تا حد نگاہ تنہائی پھیلی ہوئی تھی۔ تھکان زدہ جسم اور بوجھل ذہن کو کوئی سائبان میسر نہ تھا کہ جس کے سائے تلے چند پل راحت و فرحت بخش گئے۔ اس کی روح تک میں تھکن سما گئی۔

اس نے اپنا خیال رکھنا عرصہ ہوا چھوڑ رکھا تھا۔

کبھی کبھار دل باغی ہو جاتا اور زیست سے اپنے حصے کی خوشیاں کشید کرنے کا متمنی ہوتا۔ مگر یہ صرف لمحاتی کیفیت ہوتی۔ وہ اتنی کمزور ہرگز نہ تھی۔ چند لمحوں بعد وہ دل کی طرف سے کان لپیٹ لیتی۔

مگر انسان کے ہزار جھٹکنے اور جھٹلانے کے باوجود اس کا وجود جذبات کی زد میں آ ہی جاتا ہے۔ لاشعوری طور پر دل خوابوں کو پناہ دے کر چپکے سے اپنے اندر سمونے لگتا ہے۔

اس کا دل بھی بے خبری میں مارا گیا۔

اس کی ساکت پانی جیسی زندگی میں پہلا کنکر فرحان نے پھینک کر اس میں جنبش پیدا کی تھی۔

وہ اس کا کولیگ تھا۔ معمولی شناسائی کے علاوہ ان کے درمیان کچھ نہ تھا۔

مگر ایک روز ایک اتفاق نے اس معمولی شناسائی کو گہرے تعلق میں استوار کر دیا۔ جب وہ بائیک اڑائے اس کے سنگ اونچی اڑان بھر رہا تھا اور وہ بھی اس کے اتنا قریب بیٹھ کر اپنی اتھل پتھل دھڑکنوں کو قابو کرنے میں بے حال تھی۔

اس کے مضبوط شانے پر ٹکے اس کے نازک ہاتھ نے اس کے جسم میں برق دوڑا دی تھی۔

اس دن شہر میں دہشت گردی کے باعث پبلک ٹرانسپورٹ اچانک بند ہوئی تو وہ اسے اپنی بائیک پر بحفاظت گھر کے قریب اسٹاپ تک چھوڑ گیا تھا۔

وہیں سے ان کی انجانی سی چاہت کا آغاز ہوا۔ کچھ نرم گرم جذبات نے دل کے بند کواڑ غیر محسوس انداز میں وا کیے۔

فرحان کو بھی کم و بیش انہی حالات کا سامنا تھا۔ جن سے سویرا گزر رہی تھی۔

بے شمار ذمہ داریوں میں تنہا اس کا وجود پسا تھا۔ بیمار ماں اور تین جوان بہنوں کی ذمہ داری اسی کے شانوں پر تھی۔

فریق پر واضح کر دی تھی۔

جہاں جذبے صادق ہوں، وہاں دشوار حالات میں بھی سہل و موافق راہیں نکل آتی ہیں۔

جذبوں کی صداقت جہاں اعتماد بخشتی ہے، وہیں انسان کو باہمت بھی بناتی ہے۔

حرف آخر یہ کہ وہ دونوں ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے لیے تہہ دل سے راضی تھے۔

موسم گرما کی تعطیلات کے دوران اجالا بچوں کو لے کر میکے آ گئی۔ سویرا اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

اس بار اسے سویرا گزشتہ ملاقات سے خاصی مختلف دکھائی دی۔

اس کے پیلے رخساروں پر گلابیاں تھیں۔ شکن آلود پیشانی پر اطمینان تھا۔ بھینچے ہوئے ساکت لبوں پر پپڑی کی جگہ گلابی لپ گلوز نے لے لی تھی۔ جس پر ہمہ وقت دھیمی مسکان ڈیرہ جمائے رکھتی۔

یہ تبدیلی کیونکر رونما ہوئی تھی؟

ذہن میں چند خدشات نے سر ابھارا تھا مگر اس نے فوراً اپنے خیالات کو جھٹک دیا۔

اس بار اماں نے بھی اسے دیکھ کر خاصی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ابا کی طبیعت خاصی بہتر تھی۔

اماں کا مزاج اور رویہ بدل چکا تھا۔ روحان بھی کئی کئی روز گھر سے غائب رہتا تھا تب ہی گھر میں امن و امان کی فضا قائم تھی۔

اجالا کو پہلی مرتبہ گھر میں پرسکون لمحات میسر آئے تھے۔ وہ نہال ہو گئی۔

اسی دوران ایک غیر معمولی واقعے نے سب کو بری طرح چونکایا۔ اتوار کی شام سویرا جلدی گھر لوٹ آئی۔ مہر النساء کچن میں کام کر رہی تھی۔ وہ اماں، ابا اور اجالا کے پاس برآمدے میں آ بیٹھی۔ وہ تینوں کسی موضوع پر محو گفتگو تھے۔ وہ خاموشی سے سننے لگی۔ اسی سے دروازے پر دستک ہوئی۔ اماں نے ثناء کو پکار کر دروازہ کھولنے کی ہدایت کی۔

ثناء جو مارے باندھے رٹے لگانے میں

دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی چیخ سن کر مہرالنساء توے پر پڑی روٹی بھول کر سرعت سے باہر کی جانب لپکی۔ اجالا اور سویرا بھی غیر ارادی طور پر بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر بیرونی دروازے کی جانب لپکیں۔ اماں اپنے جوڑوں کے درد کی بدولت اٹھنے سے قاصر تھیں۔ وہ ابا کے ساتھ تحیر زدہ سی سینہ پکڑ کر رہ گئیں۔

جو وجود اندر داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر سب ہی کے ہوش اڑ گئے تھے۔

اس کے کریہہ چہرے پر پھیلے بدہیئت نقوش دیکھ کر کسی کے بھی اوسان خطا ہو سکتے تھے۔

وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

ثناء اسے بدروح سمجھ کر اندر بھاگ گئی تھی۔ مہرالنساء ہاتھ میں چمٹا تھامے اماں کی کمر میں گھسنے کی سعی کر رہی تھی۔

وہ سب اسے دیکھ کر گنگ رہ گئے تھے۔

شاید آنے والی کو ان کی ذہنی کیفیات کا اندازہ ہو گیا تھا تبھی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا گویا دعا مانگنے کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرتے سے ہٹانا بھول گئی ہو۔

سویرا کو ایسا محسوس ہوا تھا گویا سیاہ آسمان پر سفید چاند آن ٹھہرا ہو۔

اس کے ہاتھ روئی کے گالے کی مانند سفید تھے۔ بائیں ہاتھ کی پشت پر درمیانی انگلی کے عین وسط میں ویسا ہی سیاہ تل نمایاں تھا، جو سویرا کے ہاتھ کی سفید پشت پر دکھائی دیتا ہر لحظہ اس کی نظر اتارتا تھا۔

چارپائی پر دراز عبدالرحمٰن اس سیاہ تل کی بدولت ہی اسے پہچان پائے تھے۔ وہ تحیر زدہ رہ گئے۔ ذہن اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکاری تھا۔ مگر...... سچ وہی تھا جو دکھائی دے رہا تھا۔

وہ...... وہ عورت تھی۔ جس نے ان کی مردانگی پر کاری ضرب لگائی تھی۔ ان کی بے پایاں محبت کے بدلے ذلت کے ڈونگرے برسائے تھے۔ وہ ان کی انا

کو ہزار ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کی نظروں اور شانوں کو جھکا گئی تھی۔

اس عورت کی بدولت انہوں نے اپنی مکمل دتوانا شخصیت کے بت کو بھربھری ریت کی دیوار کی مانند ڈھلتے دیکھا تھا۔

اس دن کے بعد سے دنیا انہیں مجرم کی نگاہ سے دیکھتی آئی تھی۔ اور وہ ایسا لڑکھڑائے تھے کہ آج تک قدموں کو مضبوط نہ پایا تھا۔

غیر ارادی طور پر ان کی ذات کا غبار ان دو معصوم وجودوں پر نکلنے لگا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اپنی پھول سی بیٹیوں سے نفرت کر بیٹھے تھے اور وقت پڑنے پر اسی نازک کلی نے کیسے ان کے آشیانے کو گرم تھپیڑوں سے بچالیا تھا۔

ساری عمر جس بیٹے کی ناز برداریوں میں کسر نہیں اٹھائی تھی۔ آج وہ ان کی طرف سے بے خبر زمانے کی رنگینیوں میں مست تھا۔ مگر وہ تمام تر نفرتیں سہنے کے باوجود بیٹی ہونے کا حق ادا کر گئی تھی۔

''میری بیٹیاں کہاں ہیں؟ عبدالرحمٰن!'' افشاں کی آواز نے انہیں سوچوں کے گرداب سے نکالا۔

سویرا اور اجالا ششدر رہ گئیں۔

اس عورت کے سوال سے انہیں جو گمان گزرا تھا۔ جان لیوا تھا۔ وہ جو اپنی ان دیکھی ماں کے لیے بے پایاں نفرت دل میں رکھتی تھیں۔ اس عورت کو دیکھ کر وہ نفرت نجانے کہاں کھو گئی تھی۔ وہ عورت قابل رحم تھی۔ اس کا چہرہ عبرت ناک تھا۔

اس سے نفرت کرنا انسانیت کی توہین و تذلیل تھی اور وہ اتنی بے رحم ہرگز نہ تھیں۔

پھر وہ کیسے آگے بڑھ کر اسے جھنجوڑتیں؟

اس سے سوال و جواب کرتیں کہ آج کا دن اس کے لیے روز حشر بن جاتا، وہ دونوں اپنی جگہ ساکت کھڑی تھیں۔

ابا کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس عورت کو کیا جواب دیں؟ ایک زمانہ بیت جانے کے بعد جو پلٹ کر اپنی بیٹیوں کی خبر لینے آئی تھی۔ اس سے کیا سلوک برتا

یہ تمہاری بیٹی سویرا ہے اور یہ اجالا...... یہ اماں تھیں۔ جو تمام صورت حال جان چکی تھیں۔ انہوں نے نرمی سے ان کا تعارف کرایا۔ وہ ان سے لپٹی نہیں تھی۔ نہ ہی بے ساختہ ان کی جانب لپکی تھی۔ انہیں نہ چھوا، نہ مخاطب کیا۔

بس آنکھوں میں حسرت و یاس لیے وہیں کھڑی انہیں تکتی رہی۔ ایسے جیسے ہماری کوئی قیمتی شے ہم سے دور ہو رہی ہو اور ہم کف افسوس ملتے رہ جائیں۔ پورے تیقن کے ساتھ کہ اب تمام سعی لاحاصل ہے۔

''ماں سے ملو! سویرا...... اجالا!'' اماں نے بھی آج حیرتوں کے ریکارڈ قائم کرنے تھے۔

انہوں نے ایک دوسرے کی جانب بہت خالی نظروں سے دیکھا تھا۔ پر اماں کی ہدایت پا کر نہ چاہتے ہوئے بھی آگے بڑھ گئیں۔

اس عورت کس صبر کس پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑا۔ وہ انہیں خود سے لپٹائے رونے لگی۔

کچھ دیر بعد اماں نے انہیں جدا کر کے اسے چارپائی پر بٹھا کر پانی پلایا۔

☆☆☆

بعض اوقات زندگی میں بڑے بڑے دھوکے اتنے خوب صورت لبادے میں لپٹے ہماری جانب لپکتے ہیں کہ ان کی رعنائی اور ظاہری مصنوعی چمک سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

میں بھی اندھا دھند اس حسین دھوکے کی جانب لپکی تھی۔ وہ ہمارے گھر کے سامنے والے گھر میں رہائش پذیر تھا۔ تین بہنوں کا اکلوتا بجیلا بھائی تھا۔ لمبا چوڑا اور حسین اتنا کہ گزرنے والے پلٹ کر دیکھنے کی خواہش کرتے۔

محلے کی کئی لڑکیاں اس پر فریفتہ تھیں اور کبھی محفل سجتی تو موضوع گفتگو عمیر ہوتا۔ لڑکیاں محفل جمائے آپس میں اس کی باتیں کر کے خوشی محسوس کرتیں۔ بیک وقت وہ سبھی کا محبوب تھا۔ میرا بھی محلے کی لڑکیوں کے ساتھ خاصا میل جول تھا مگر میں نے بھی

چاہتی ہوں۔ اس کی ساحرانہ آنکھیں اتفاقاً بھی میری نگاہوں کے سامنے آتی ہیں تو میرا دل بھی بلیوں اچھلتا ہے۔

کئی لڑکیاں اسے دل میں بسائے بیٹھی تھیں مگر ان تمام باتوں سے قطع نظر اپنی سنجیدہ طبیعت اور محتاط رہنے کے باعث اس نے کسی بھی لڑکی کے ساتھ معاشقہ نہیں چلایا تھا۔ سب ہی لڑکیوں کا یک طرفہ عشق تھا اور وہ اسی میں نہال تھیں۔

وقت دبے پاؤں رخصت ہو رہا تھا چونکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی لہٰذا اماں اور ابا کی غیر موجودگی میں اکیلے ہی گھر پر ٹھہرنا پڑتا۔

ایک روز ابا کام پر گئے ہوئے تھے اور اماں خالہ کی عیادت کی غرض سے ان کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ میں پڑھائی سے فراغت پا کر سخت بوریت محسوس کرنے لگی۔

میں اپنی دوست ریحانہ کے ہاں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ہماری گلی میں ہی رہائش پذیر تھی۔

میں باہر نکل کر بیرونی دروازہ مقفل کرنے کی سعی کرنے لگی مگر تالا لگ کے نہیں دے رہا تھا۔ مجبوراً میں نے سامنے والے گیٹ کی بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد عمیر نے قدرے جھنجھلائے ہوئے انداز میں گیٹ کھولا تھا مگر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کی ساری بیزاری و جھلاہٹ کافور ہو گئی۔ چہرے پر قوس قزح سے رنگ بکھر گئے۔

میرا حال بھی مختلف نہ تھا۔ میں بھی چہرے پر دل فریب مسکراہٹ لیے مبہوت ہی تو رہ گئی تھی۔

اس نے چند ساعتوں میں میرا مسئلہ حل کر دیا تھا مگر اس مختصر سی ملاقات نے میرے ذہن پر ان مٹ نشان چھوڑ دیے تھے۔ نتیجتاً اگلے کئی روز تک وہ میرے ذہن سے لمحہ بھر کے لیے بھی محو نہ ہوا تھا۔

اس دن کے بعد اس سے سامنا ہونے پر میری نگاہیں خود بہ خود جھک جاتیں۔ اس کی لودیتی نظریں

دیتی۔

جلد ہی محبت ناموں کا تبادلہ ہونے لگا۔ جن میں بے قراریاں درج ہوتیں۔ بے تابیوں کے قصے بیان ہوتے۔ جنہیں پڑھ کر میرے بجز کتے جذبات کو مزید تقویت پہنچتی۔ میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی گردان بیٹھی تھی۔

سہیلیاں اور دیگر مشاغل سب اسی کے خیالوں میں کھو کر فراموش کر چکی تھی۔ حتیٰ کہ پڑھائی بھی طوعاً و کرہاً کرتی۔

میں نجانے کب تک اس کی محبت میں محو پرواز رہتی، اگر عبدالرحمٰن کا رشتہ رکاوٹ بن کر ہمارے راستے میں نہ آ کھڑا ہوتا۔

میں نے عمیر کو خط لکھ بھیجا تھا اور ایک حد تک مطمئن بھی ہو گئی تھی کہ میری چاہت میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والا عمیر کوئی راہ نکال لے گا۔ مگر میرے خیال کے برعکس اس نے تسلیوں، دلاسوں سے بھرپور پرچہ لکھ بھیجا۔ کوئی عملی پیش رفت نہ کی۔

ابا اپنے بھتیجے کے لیے رضامند تھے مگر اماں متذبذب تھیں۔ اسی وجہ سے یہ معاملہ التوا پذیر تھا۔

اس سے قبل کہ پانی سر سے اوپر جاتا اور وقت ہاتھ سے سرکتا۔ میں نے ایک بار پھر عمیر کو اپنی بات آگے پہنچانے کی تجویز لکھ بھیجی۔ جواباً اس نے اپنی مجبوریوں سے لبریز طویل سندیسہ لکھا۔ جس میں اس کی تمام تر شدتیں لفظوں کی صورت موجود تھیں مگر فی الوقت وہ مجھے اپنانے سے قاصر تھا۔ بڑی بہنوں کی موجودگی اور بے روزگاری کی صورت میں وہ گھر میں اپنی شادی کی بات چھیڑ کر کوئی طوفان نہیں لانا چاہتا۔ اس نے واضح لفظوں میں رقم کر ڈالا کہ میں چاہوں تو اس کا انتظار کروں اور اگر والدین کے فیصلے پر سر تسلیم کروں تب بھی وہ معترض نہ ہوگا۔

غرض اس نے تمام تر ڈوریں مجھے تھما دیں۔ اس کے وعدے وعید اور قسمیں سب دھری کی دھری رہ

غیر متوقع صورت حال دیکھ کر دل تھام کر رہ گئی۔

میں نے تو سوچا تھا کہ وہ وقت آنے پر مجھے اپنانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے مگر وہ تو اپنی ہی خود ساختہ مجبوریوں میں جکڑا بیٹھا تھا۔

میں جو اس بے نام تعلق کو چٹان کی مانند سمجھ بیٹھی تھی۔ بھربھری ریت کی دیوار سے بھی کمزور ثابت ہوا تھا۔ وہ مجھ سے دامن بچانے لگا تھا۔ میرے کئی سندیسوں میں اصرار کے بعد ایک مختصر پرچہ لکھ بھیجا۔ میں اس کے ہرجائی پن پر ٹوٹ کر رہ گئی۔

یکلخت زندگی سرخ مخمل سے کانٹے دار جھاڑی بن گئی اور پھر اس خاردار جھاڑی کو بھی آگ لگا دی گئی۔

شاید ان دنوں قسمت کے ستارے شدید قسم کی گردش کا شکار تھے کہ حالات کے گرم تھپیڑوں نے مجھے محبت و خواب کی آغوش سے کھینچ کر تلخ حالات کے مقابل لا پھینکا۔

میری کتابوں کی الماری میں قدرے پوشیدہ جگہ پر رکھے بکس پر اماں کا چھاپہ پڑ گیا تھا اور پھر اس میں موجود عمیر کے ڈھیروں محبت نامے ان کے ہاتھ لگ گئے۔ جنہیں پڑھ کر اماں سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ میں مجرم بنی سر جھکائے بیٹھی تھی کہ کیا سزا ملے مگر اماں تو گویا حواس ہی کھو بیٹھی تھیں۔

میں دل ہی دل میں شرمندگی کے سمندر میں تیر رہی تھی۔ عمیر کی وارفتگیوں سے لبریز محبت نامے اکثر و بیشتر بے باکی کو چھوتے ہوا کرتے تھے۔ جنہیں میں بڑے ناز اور فخر سے اس کی محبت گردانتے ہوئے پڑھ کر محظوظ کر لیا کرتی تھی مگر آج وہی الفاظ سانپ بچھو کا روپ دھارے پھن پھیلائے کھڑے تھے۔

شام کو ابا گھر میں داخل ہوئے تو اماں کی تمام تر خاموشیاں فنا ہو گئیں گویا منوں مٹی تلے جا سوئی ہوں۔ وہ ابا کے سامنے ضبط کھو بیٹھیں، سینہ کوبی کرتے ہوئے بلند آواز سے رونے لگیں۔

"نور محمد اٹھاؤ، اس دن کے لیے میں نے اس

محلے کے آوارہ گردوں کے ساتھ ماں کے سر میں خاک جھونکے...... ارے! کتنا ناز تھا مجھے اپنی تربیت پر مگر آج تھو ایسی اولاد پر! اس سے بہتر تھا کہ میں کوئی سنپنی پال لیتی۔ نجانے کب سے ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپ کر اس لفنگے کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہے۔ کلموہی، بدکردار، بدفعل!"

اماں کا اشتعال بڑھتا جا رہا تھا اور ابا بے یقین سی نظریں اور کندھے جھکائے بیٹھے تھے۔ یہاں تک کہ اماں نے خطوط کا ڈھیر ابا کے سامنے پھیلا دیا اور مغلظات بکتے مجھے بالوں سے گھسیٹ کر ان کے مقابل پیش کر دیا مگر ابا کا وجود خاموشی کی دبیز تہہ میں دب گیا تھا۔

اولاد خاص کر بیٹیاں اگر والدین کی عزت پر یوں شب خون ماریں تو صدمے سے یونہی ان کے اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔ خود سر اولاد کو جھیلنا دنیا کا سب سے بڑا کرب ہے۔ عمیر کے جانب سے اگر مجھے اطمینان بخش جواب ملتا تو ہو سکتا تھا کہ میں خاموشی کی حد سے تجاوز کر جاتی۔

بے راہ روی کی دلدل میں رکھا جانے والا قدم سب سے پہلے والدین سے بدظن کرتا ہے۔ پشیمانی نے نہایت مختصر دورانیے کے لیے میری ذات کا گھیراؤ کیا تھا۔ کچھ دیر بعد میرے دل نے ہزار تاویلیں اور جواز تراش کر مجھے معصوم قرار دے دیا تھا اور میں نے خود کو اس تمام معاملے سے بری تصور کر لیا تھا۔

ابھی میرے دل میں اسے کھونے کا ملال ہنوز پنجے گاڑے ہوئے تھا کہ ایک شور برپا ہوا اور اس سے قبل کہ وہ تھمتا میری زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔

ایک بار پھر پھپھو بیٹے کا رشتہ لے کر ابا کی دہلیز پر آئی تھیں۔ اس بار اماں کسی قسم کی تذبذب کا شکار ہوئیں، نہ عبدالرحمٰن کی سیاہ رنگت پر کوئی اعتراض اٹھایا اور نہ ہی اس کی اور میری عمروں کے واضح تضاد نے ابا کے فیصلے کی تردید کرنے کی سعی کی تھی بلکہ اپنے منکسرانہ انداز اور خوش دلی سے پھپھو کی مدارات

اس بار ان کی پیشانی پر شکن کی ایک لکیر بھی مجھے کھوجنے سے نہ ملی۔

زندگی ایک امتحان بن کر سامنے آئی تھی۔ ملال دامن گیر تھا۔ اماں اور ابا دونوں نے مجھ سے رخ پھیر رکھا تھا۔ اسی بے رخی و بے اعتنائی کے سائے تلے انہوں نے مجھے عبدالرحمٰن کے سنگ رخصت کر دیا۔ اس انداز میں کہ کسی کو شک تک نہ گزرا کہ ان کے دل میں میری جانب سے کوئی خفگی ہے۔

میں دل پر منوں بوجھ لیے پھپھو کی بہو بن کر ان کے گھر آ گئی۔ اماں اور ابا نے میرا بوجھ اتارنے کے لیے مجھے عبدالرحمٰن کے سر منڈھ دیا تھا۔ جو اپنی بدصورتی اور وارفتگیوں سمیت مجھے زہر لگتا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا التفات بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی محبت میں روز بہ روز اضافہ مجھے اس سے مزید متنفر کر رہا تھا۔ چونکہ وہ میرے حسن کا دلدادہ تھا لہٰذا میرے تنفر بھرے انداز کو نخرہ سمجھ کر ہنس کر ٹالتا۔

ان ہی حالات میں اجالا اور پھر سویرا کی پیدائش ہوئی۔ دونوں بیٹیوں نے میرا حسن و جمال چرایا تھا۔ عبدالرحمٰن کی ان میں جان تھی مگر میرا انداز ہنوز بے تاثر تھا۔

شادی کے چار برس بیت جانے کے بعد بھی عمیر میرے دل کے شاہی تخت پر پوری شان سے براجمان تھا اور میری ازدواجی زندگی کا کوئی دن اس کی یاد سے غافل نہ گزرتا تھا۔

میں کردار کی پستی کی انتہا پر تھی۔

ان ہی دنوں ابا کے انتقال کی خبر ملی تو میں میکے آ گئی۔ عبدالرحمٰن تعزیت کے دن پورے کر کے جلد گاؤں لوٹ گیا۔

سسرال کی کوئی ذمہ داری میرے سر نہ تھی لہٰذا میں نے ابا کی تمام آخری رسومات سے فراغت پا کر بھی یہیں قیام رکھا۔ اماں کی تنہائی کا احساس کر کے عبدالرحمٰن اور اس کی ماں نے واپسی کا تقاضا نہ کیا۔ باایں ہمہ کہ وہ میری تمام تر بے رخی کے باوجود

میں تنہائی پا کر ہر لمحہ اپنی کھوئی ہوئی محبت کی یاد میں بتا کر دلی تسکین حاصل کرتی رہتی۔ یہ گھر جس کے چپے چپے پر میری یادوں کے نشان تھے، ان سے پرانے مناظر کے عکس تازہ کر کے سرور حاصل کرتی تو روح میں اطمینان اتر جاتا۔

وہ جگہ جہاں رات گئے شمع روشن کیے میں اسے اپنے جذبات کی تمام تر سچائیاں رقم کر بھیجتی تھی۔ اب بھی گلاب کی مانند مہکتی محسوس ہوتی۔

میں اب بھی اسے سوچتی تو گھنٹوں اس کے سحر سے نہ نکل پاتی۔ میں اب تک حصار محبت میں مقید تھی اور یہ حصار مزید تنگ ہوتا جا رہا تھا گویا کسی سحر کا اثر ہو۔

اس دن غیر متوقع طور پر سر راہ اچانک میری اس سے ملاقات ہوگئی۔ وہ مجھے دیکھ کر رک گیا اور میں بھی بے خودی ٹھہر گئی۔

مجھے اس کی آنکھوں میں سالوں کا اضطراب ہلکورے لیتا نظر آیا تو میری آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

''افشاں! اتنی جلدی دامن چھڑا گئیں تم، محبت کا ناتا اتنی کچی ڈور سے تو نہیں جڑا ہوتا کہ ایک جھٹکے سے توڑ کر منزلیں جدا کرلی جائیں۔''

وہ مجھے موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ میں خاموش رہی۔

''میں نے کب تمہارا ساتھ نبھانے سے انکار کیا تھا؟ بس وقتی طور پر حالات سے مجبور تھا۔ میں تو آج بھی تمہاری یاد کو سینے سے لگائے تنہائی و یاسیت بھرے درناک پل کاٹ رہا ہوں کیونکہ اتنا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے کہ تمہیں دل میں بساتے ہوئے کسی اور کے ساتھ دوغلی و منافقت بھری زندگی بسر کروں، جیسا کہ تم کر رہی ہو۔'' اس نے مجھ پر بڑی گہری چوٹ کی تھی۔ دیکھا جائے تو اس نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو، میں دہری زندگی بسر کر رہی ہوں، بالکل اس طرح گویا کوئی شے خلاؤں میں معلق رہ جائے، جسے نہ زمین کا کنارہ نصیب ہو اور نہ آسمان

انداز میں اس کی بات سے اتفاق کیا۔

''تو تم کوئی کنارہ کیوں نہیں حاصل کر لیتیں؟ اپنی زندگی کے اختیارات دوسروں کو سونپنے والے یونہی نامراد و تشنہ رہ جاتے ہیں۔ چاہو تو میری زندگی میں پھر سے شامل ہو جاؤ۔ میرے انتظار کی باہیں اب بھی تمہارے لیے وا ہیں۔'' وہ میری سوچ کے نئے در وا کر کے چلا گیا تھا مگر جانے سے قبل دو دن بعد قریبی پارک میں ملنے کا وقت طے کر گیا تھا۔ جہاں مجھے اپنے فیصلے سے آگاہی دینی تھی۔

دو دن دو سالوں پر محیط ہو گئے تھے مگر میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔

قوت ارادی مضبوط ہو تو وہ فیصلہ جو سالوں میں نہیں ہو پاتا، لمحہ بھر میں ہو جاتا ہے، جیسے اس روز پارک میں داخل ہوتے وقت تک اور اس کے سنگ بیٹھنے تک میرا ذہن متذبذب تھا مگر جلد ہی سلسلہ وہیں سے جڑ گیا تھا، جہاں سے ختم ہوا تھا۔

آج بھی تیرے لیے دل میں چاہتیں باقی ہیں
تجھ سے جو کرنی تھیں وہ باتیں باقی ہیں
کیسے سوچ لیا تم نے ہمیں تیری طلب نہیں
دل میں اتر کے دیکھ اب بھی تیری آرزوئیں باقی ہیں
کبھی فرصتیں ملیں تو آ کر دیکھ میرے مکاں میں
آج بھی تیری خوشبو، تیری پرچھائیاں، تیری سرگوشیاں
تیری آہٹیں باقی ہیں
دیکھ میرا ظرف کہ میں ٹوٹ کر بھی بکھرا نہیں
آنکھ میں آنسو ہے مگر لب پر مسکراہٹ باقی ہے

اس کی آواز کے سوز اور لہجے کی اداسی نے کچھ اس طرح میرے دل کا گھیراؤ کیا تھا کہ میرے دل نے لمحہ بھر میں فیصلہ اس کے حق میں سنا دیا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جن کے دیپ یکدم جل اٹھے تھے۔ وہ جو چند لمحہ قبل مضمحل اور اداسی کی، غم کی تفسیر دکھائی دے رہا تھا۔ میرا فیصلہ سن کر کھل اٹھا۔

اس روز میری ذات پوری طرح خوش فہمی کی لپیٹ میں تھی۔ اس حد تک کہ میں اس کی بے پایاں مسرت کے پیچھے سانپ کی مانند کنڈلی مارے چھپا بیٹھا اس کا مفاد بھی نہ جان پائی تھی خیر وہ سب بھانپنا تو ناممکن ترین عمل تھا مگر میرے دل میں تو گمان تک بیدار نہ ہوا تھا۔ میں تو اس کے باطل لہجے، جھوٹے لفظوں اور چہرے کی بناوٹی تاثرات سے بری طرح دھوکا کھا بیٹھی تھی۔

ایسا دھوکا جس کا خمیازہ افشاں عبدالرحمٰن نے سالہا سال لمحہ لمحہ بھگتا...... اس حد تک کرب کہ جس کا تصور ہی کسی بھی عام جذبات کے حامل شخص کا دل دہلا کر رکھ دے۔

میں نے جو فیصلہ کیا تھا۔ اس نے میری ممتا اور گرہستی کو آگ لگا دی تھی۔ جس کا خیال ہی کسی ہوش مند عورت کے لیے سوہان روح ہوا کرتا ہے۔

مگر...... میرا دل نہیں لرزا تھا...... نہ تڑپا تھا۔

جانے میں کس مٹی کی بنی عورت تھی؟

قدرت رحم کھاتی ہے انسان پر۔

قدرت نے مجھے بھی سنبھلنے کے لیے ایک موقع فراہم کیا تھا مگر جو پٹی میری آنکھوں پر بندھی تھی اس نے میری حیثیت نابیناؤں سی کر دی تھی۔ ضروری نہیں کہ انسان آنکھوں سے معذور ہو تو نابینا کہلائے، کبھی کبھی بینا ہو کر بھی انسان نابینا ہوتا ہے۔

جس شب میرا ارادہ عمیر کے سنگ رخصت ہونے کا تھا۔ اسی روز صبح عبدالرحمٰن ہمیں لینے کے لیے آدھمکا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا منصوبہ چوپٹ ہوتا نظر آیا مگر جو عیاری میری شخصیت کا حصہ بن رہی تھی، چٹکی بجتے ہی میرا مسئلہ حل کر گئی۔

میں نے بڑے لاڈ سے عبدالرحمٰن سے اگلے روز گاؤں چلنے کی فرمائش کر ڈالی۔ وہ بخوشی مان گیا۔ شام کو میں اپنی سہیلی سے ملنے کا بہانا کر کے وہ گھر اور اپنی زندگی سے وابستہ قیمتی رشتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منہ موڑ کر طے کردہ مخصوص مقام پر پہنچ گئی۔

کچھ دیر بعد عمیر بھی وہیں موجود تھا اور یہی میری بدبختی کا آغاز تھا۔

☆☆☆

اس نے وعدہ کیا تھا کہ گھر سے نکلنے کے بعد وہ کورٹ کے ذریعے مجھے خلع دلوا کر جلد نکاح کرلے گا۔

اسی رات ہم ٹرین میں سوار ہو گئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مجھے شہر سے دور محفوظ مقام پر لے جا کر رکھے گا تاکہ کسی کو ہمارے وجود کی بھنک تک نہ پڑ سکے اور پھر جلد خلع کی کارروائی کا آغاز ہوگا۔ میں اس کی معاملہ فہمی کی قائل ہو گئی۔

ہم جس گاؤں اترے تھے۔ وہاں کے لوگوں کی پرمشقت، بدحال زندگی اور غربت و کسمپرسی پر نگاہ دوڑا کر میں دل تھام کر رہ گئی۔ یہاں قیام دشوار ترین امر تھا۔ میں نے عمیر سے اپنی گھبراہٹ کا ذکر کیا تو اس نے تسلی دی کہ ہماری رہائش قدرے مختلف مقام پر اور نہایت مختصر وقت کے لیے ہے۔ اس کے دوست کا گھر نسبتاً پرسہولت ہے۔ وہاں مجھے کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہ ہوگا۔ وہ لوگ مہمان نوازی میں بھی ثانی نہیں رکھتے۔

میری تشفی ہو گئی۔

کافی دیر کچے رستے پر پیدل سفر طے کرنے کے بعد دیگر مکانوں سے قدرے مختلف پکا سا مکان نظر آیا تو عمیر مجھے لیے اس جانب بڑھ گیا۔

دروازہ ایک نوجوان نے کھولا تھا۔ ہماری جانب دیکھ کر اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ ابھری تھی۔

''کون ہے......؟'' پیچھے سے کسی نے ہانک لگائی۔

''دلبر جی کے خاص مہمان ہیں جی!'' اس نے سعادت مندی سے جواب دے کر ہمیں اندر بلا لیا۔

ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ بڑا عجیب وغریب ماحول تھا۔ ناگوار سی بو نے پورے کمرے کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دو پرانے طرز کے صوفے اور ایک مسہری کے علاوہ کوئی سامان موجود نہ تھا۔ وہ لڑکا ہمیں یہاں بٹھا کر چلا گیا۔

دس منٹ تک کوئی ہمارے پاس نہ آیا تو عمیر

''دلبر معلوم نہیں کہاں رہ گیا ہے؟'' اس نے خود کلامی کی۔

''دو منٹ بیٹھو! میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔'' وہ مجھے ہدایت دیتا اٹھ کھڑا ہوا تو میں بھی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''ارے پاگل لڑکی! گھبراؤ نہیں۔ بیٹھو! میں دلبر کو دیکھ کر آتا ہوں۔'' میں سہم کر بیٹھ گئی تو وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں بلاوجہ کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ یہ کمرہ گھریلو ماحول پیش نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اچنبھا ہوا۔

کونے میں ایک بوتل رکھی دکھائی دی تھی۔ جس میں کوئی سیال موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایسی کوئی شے موجود نہ تھی جس سے اس گھر کے مکینوں کے رہن سہن کا اندازہ لگایا جا سکتا۔

میرا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ عمیر واپس نہ لوٹا تھا۔ میں اٹھ کر بیرونی جانب قدم بڑھانے لگی تھی کہ دفعتاً دو لمبے تڑنگے پہلوان نما مرد اندر داخل ہوئے جبکہ عمیر غائب تھا۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔

''سامان تو بڑا پیارا دے کر گیا ہے۔'' ایک شخص نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے دوسرے سے کہا۔ میرے حلق میں گولہ پھنس کر رہ گیا۔ تبھی ان میں سے ایک میری جانب بڑھا تھا۔ اس کے ناپاک عزائم اس کی آنکھوں سے عیاں تھے۔

میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی اور چلائی۔

''پیچھے ہٹو! میں ایک عزت دار لڑکی ہوں۔''

جواباً دونوں کے فلک شگاف قہقہے بلند ہو گئے۔

''ہاہا...... عزت دار! اس کا...... (گالی) بتا کر گیا ہے۔ شوہر اور دو بچوں کو چھوڑ کر اپنے...... کے ساتھ بھاگی ہے یہ عزت دار لڑکی...... ہاہا بڑی ہی عزت دار ہے۔'' وہ زور و شور سے قہقہے لگاتے، میرا تمسخر اڑاتے، میرا لہو منجمد کر گئے تھے۔

ان کے بے باک اور فحش جملے ہتھوڑا بن کر

''تو ذرا اس چھوکری کو دیکھ! تیڑھی کھیر لگتی ہے۔ میں بعد میں آؤں گا۔'' ایک سانڈ کہہ کر نکل گیا تو دوسرا اندر سے دروازہ بند کر کے بھوکے شیر کی مانند میری سمت لپکا مگر میں اچھل کر دور ہٹی۔

وہ مغلظات بکتا دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوا مگر یہ وار بھی ناکام گیا۔ وہ غضب ناک انداز میں میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس سے اپنا بھاری وجود سنبھالنا دوبھر ہو گیا۔ مارے اشتعال کے وہ بری طرح ہانپ گیا تھا۔

مسلسل ادھر ادھر اچھل کود کرنے سے میں بھی بے حال ہو چکی تھی جبکہ وہ ہنوز مجھ پر غلبہ پانے کے لیے سعی کر رہا تھا۔

مسہری سے چھلانگ لگاتے ہوئے میرا پاؤں کونے میں پڑی بوتل سے ٹکرایا اور میں اس سے الجھ کر گر پڑی۔ یہی موقع اس نے غنیمت جان لیا تھا اور بھوکے شکاری کی مانند اس نے مجھے بازو سے گھسیٹا چونکہ میرا دوسرا ہاتھ آزاد تھا لہٰذا میں نے بوتل اٹھائی اور پوری طاقت سے اس کے منہ پر دے ماری۔

اس نے شدید برہم ہو کر مجھے لات رسید کی اور مجھے چھوڑ کر بوتل پر جھپٹا اور تیزی سے اس کا ڈھکن کھول کر میرے چہرے پر وہ گھر ازرد سیال انڈیل دیا۔

میں نے سختی سے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔

اس قدر اذیت اور کرب کا سامنا تھا کہ گویا کسی نے دہکتے انگاروں پر میرا چہرہ سینک دیا ہو یا آگ کے الاؤ میں دھکا دیا ہو۔ بہتے سیال کے ساتھ مجھے اپنے چہرے کے نقوش بھی پگھلتے محسوس ہوئے تھے۔

سسکیاں اور چیخیں سب اندر ہی دم توڑ گئے۔

میں کرب کے مارے زمین پر لوٹنے لگی۔

جبکہ وہ ہنس رہا تھا۔ میرا تمسخر اڑا رہا تھا اور میں بے حال ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد کسی نے دروازہ دھڑ دھڑایا تھا۔ دروازہ کھلنے پر نو وارد ششدر رہ گیا تھا۔ میرے محسوسات پوری طرح بیدار تھے۔ اذیت سے روح تک چھلنی تھی۔ حیرت و استعجاب بھری آواز

''ابے...... یہ کیا کر دیا تو نے؟''

''بڑا ابدک رہی تھی سالی! آخ تھو!''

''پورے پانچ لاکھ دیے ہیں اس کے...... اس کی یہ صورت دیکھ کر کوئی خاک اس کی طرف آئے گا۔ مصیبت کی بچی تنگ کر رہی تھی تو دو لگا تار۔ میرا نقصان کیوں کر دیا...... میرے تو پانچ لاکھ ڈوب گئے...... چھوکرا ماں کے علاج کے لیے اسے دے کر پورے پانچ لاکھ لے کر گیا۔ میرے سے...... ہائے میرا سارا پیسہ ڈوب گیا۔'' وہ آواز ماتم کناں تھی۔

اذیت کے دوران سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔

''کوئی حل نکال لیں گے۔ دل چھوٹا نہ کر...... تیرے پنچ لکھ ضائع نہیں جائیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے...... نہ یہ کمینی اپنے چلتر دکھاتی اور نہ میں تیزاب اس کے منہ پر گراتا۔'' ایک لات رسید کرنے کے بعد وہ پے در پے گھونسے رسید کرنے لگا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہے۔

اس کے گلابی رخسار آنسوؤں سے تر بتر تھے۔ جو داستان وہ پڑھ رہی تھی۔ اسے اس عورت کی سزا اس کے جرم سے کہیں زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ خون کی کشش تھی یا وہ اسی قدر حساس دل رکھتی تھی کہ وہ خود کو لمحہ لمحہ ان ہی حالات کی اذیت سے دوچار محسوس کر رہی تھی۔ جن کا کبھی افشاں عبدالرحمٰن کو سامنا کرنا پڑا تھا۔

وہ جو ساری دنیا کی اذیتیں سہہ کر زیست کی مسافت عبور کر کے شوہر کی دہلیز پر قدم رکھنے کے فقط تین روز بعد دم توڑ گئی تھی۔ اسے اس کی بے بسی پر رونا آیا تھا یا نا عاقبت اندیشی پر۔ وہ بے آواز رونے لگی۔

☆☆☆

مگر زندگی اتنی جلدی اختتام پذیر نہیں ہوتی یہ ہمارے کردہ گناہوں کا حساب بے باق کر کے ہی ہمیں اپنی قید سے آزاد کرتی ہے۔

میرا ٹھکانا ایسے لوگوں میں بنایا کہ عام حالات میں جن کی طرف دیکھنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔

وہ خانہ بدوش لوگ تھے۔ پیشہ ور گداگر۔ گداگری جن کی تہذیب، ثقافت، ریاضت، وراثت الغرض سبھی کچھ تھی۔ جس سے ہٹ کر نہ وہ کچھ سوچ سکتے تھے، نہ کرنے کے متحمل تھے۔

میری قابل ترس، قابل رحم اور ہیبت ناک صورت کی پیش نظر کسی صدا کے بغیر ہی میرے پاس اتنا جمع ہو جاتا کہ دلبر کی تشفی کے لیے کافی ہوتا۔

زندگی سالہا سال اسی تسلسل سے رواں دواں تھی کہ یہ تسلسل تب ٹوٹا جب کسی فلاحی ادارے نے دلبر کو پولیس کی حراست میں دے کر بہت سے لوگوں کو اس کے چنگل سے خلاصی دلائی۔

یکدم ایسا محسوس ہوا گویا سر سے بہت بڑا طوفان ہٹا دیا گیا ہو یا پھر قید سے رہائی پالی ہو۔

اردگرد نظر دوڑائی تو ایک زمانہ بیت جانے کے بعد زندگی کا رخ ہی بدل چکا تھا۔ بھاگتی دوڑتی حیات میں بھاگتے دوڑتے لوگ اپنی زندگی کا سفر طے کرتے ہوئے کسی کے لیے نہیں ٹھہرتے۔

کچھ لوگ چہرہ دیکھ کر ٹھہرتے اور پھر چہرے پر دردناک، ترحم بھرے، ہتک آمیز یا اپنے مزاج و دانست کے مطابق تاثرات سجائے آگے بڑھ جاتے۔

کسی رحم دل نے مجھے اپنے گھر پناہ دے دی۔ پانچ برس سے اپنی زندگی کے دن یہیں کاٹ رہی ہوں۔

کبھی کبھار ان چہروں کا عکس یاد کی صورت دل و دماغ کے پردے پر جھلملا جاتا ہے۔ وہ چہرے قدرت نے جن سے اٹوٹ تعلق استوار کیا تھا۔ نجانے اب کیسے ہوں گے؟

زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے کہ انہیں دیکھوں۔ آنکھیں بند ہونے سے قبل ایک نظر ہی سہی مگر ان کا عکس آنکھوں میں بسا کر ان کی پیاس

بجھادوں۔ حالات وہ رخ اختیار کر چکے ہیں کہ میں اپنا ٹھکانہ بدلنے پر مجبور ہوں۔ جب اولاد کے ہاتھ گھر کے اختیارات آتے ہیں تو وہ بمشکل ہی کسی اضافی شخص کو برداشت کرتی ہے۔

اب تو سانسیں بھی روٹھی روٹھی محسوس ہونے لگی ہیں۔ لگتا ہے، اجالا اور سویرا کی دید کی پیاس بجھا کر ہی یہ آنکھیں پرسکون نیند سو پائیں گی۔

☆☆☆

ایک شعلہ بھڑکا تھا اور خلاؤں میں کہیں جا کر گم ہو گیا تھا۔ وہ آئی، ان کی زندگیوں پر جھلملائی اور منظر سے غائب ہو کر لمحوں میں آنکھیں موند گئی۔ مگر جاتے جاتے اپنے اندھیروں میں ڈوبی زندگی کے قصوں کی شاید اپنی واحد کنجی کو پلو سے نکال کر سویرا کے حوالے کر گئی تھی۔

گھسے پٹے صفحوں سے جڑی اور چپٹی اور چھوٹی سی ڈائری جس کے ورق ورق کو باہم جوڑنے کے لیے ہاتھ سے ٹانکے لگائے گئے تھے۔ سویرا نے متاع حیات سمجھ کر سینے میں بھینچ لی اور لگاتار آنسوؤں کی قطار اسے بھگونے لگی۔

☆☆☆

زندگی معمول پر لوٹ آئی۔ کسی رونق و مسرت سے مبرا وہی لگے بندھے دن گزرنے لگے۔

اجالا کندھوں پر منوں غم اور چھوٹی بہن کی فکریں سمیٹے اپنے گھر چلی گئی۔ فرحان اپنے گھر والوں سے اس کی فون پر بات کروا چکا تھا اور اب وہ لوگ جلد از جلد اس کے گھر آنے کے متمنی تھے۔

گھر کے حالات کی پیش نظر وہ چپ سادھے ہوئے تھی مگر اجالا کو تمام تر معاملے سے باخبر رکھا تھا۔

اپنی فکروں اور مصروفیات میں وہ جان ہی نہ سکی تھی کہ اس گھر میں ایک شخص ہے جو بہت گہرائی اور خاموشی سے حالات کے بارے میں متفکر اور مستقبل پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔

مہر النساء سے ایک سال چھوٹا عدنان بظاہر جس قدر لاابالی اور بے فکرا تھا، اسی قدر گہری سوچ کا مالک نکلا تھا۔

روحان کے بعد گھر میں اس کی حیثیت بدتر ہو گئی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوتا تو اماں کسی نہ کسی بات پر ڈانٹ پھٹکار کر زمانے بھر کا غصہ اس پر نکالتیں، اسے واپس باہر کی راہ دکھا دیتیں اور وہ ہنستا مسکراتا بے فکری کا مظاہرہ کرتا ساری پھٹکار سن کر مہر النساء، شاہ اور نایاب کو چھیڑ کر بھاگ جاتا۔

مہر النساء کبھی موڈ میں ہوتی تو کھانا دے دیتی ورنہ وہ خاموشی سے باورچی خانے کی تلاشی لیتا۔ کچھ ہاتھ لگتا تو کھا لیتا ورنہ چپ چاپ فرش پر چادر بچھاتا اور تکیہ رکھ کر لمحوں میں غافل ہو جاتا۔

اس روز سویرا ناسازی طبع کے باعث جلد گھر لوٹ آئی تھی۔ وہ اماں کو مطلع کر کے کمرے میں آ بیٹھی۔ وہ بھی کمرے میں موجود تھا۔

''باجی! تھک گئیں؟'' وہ شاذ و نادر ہی اسے مخاطب کرتا تھا۔

''ہوں! طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''روز تھکی ہوئی آتی ہو۔ اب تمہیں جاب چھوڑ دینی چاہیے۔'' جاب چھوڑنے کا تصور بھی محال تھا۔

اسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔

''کیوں؟'' اس کیوں میں نجانے کتنے سوال تھے۔ وہ سمجھ گیا۔

''تمہارا بھائی بہت قابل نہ سہی مگر اس لائق ضرور ہے کہ اب گھر کا بار اپنے کندھوں پر لے کر اپنی پیاری بہن کو وداع کر سکے۔''

اس کی بات سن کر وہ ششدر رہ گئی۔ اس قدر الفت آمیز مکالمے تو ان دونوں بہن بھائیوں کے درمیان کبھی نہ ہوئے تھے اور وہ چھوٹا سا لڑکا کیونکر یہ کر سکتا تھا جبکہ وہ ایک عرصے سے موٹر مکینک بننے کے مراحل میں تھا اور ان سب کے خیال سے اسے کمانے کے لیے عرصہ درکار تھا۔

''آپ بخیر و خوبی گھر چلا رہی تھیں تو میں ورکشاپ سے ملنے والی رقم محفوظ کر لیا کرتا تھا تاکہ

باجی! میری خواہش ہے کہ اس گھر کی ذمہ داری اٹھا سکوں۔ جس طرح ابا کی بیماری کے بعد آپ نے ہمیں سنبھالا ہے، اس کے لیے میرے پاس تشکر بھرا کوئی لفظ نہیں ہے۔ صرف یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ آپ کی ذمہ داریاں اب ختم ہو چکی ہیں۔ ابا اور روحان بھائی کے بعد بھائی ہونے کے ناتے میری آرزو ہے کہ آپ کو اپنے گھر میں ہنستا بستا دیکھوں۔''

اس وقت اپنا چھوٹا بھائی ذمہ دارانہ انداز میں بولتا بہت پیارا اور بڑا بڑا لگا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا تو وہ بھی مسکرا اٹھا۔

''اماں میری رقم پس انداز کرنے والی حرکت سے خائف ہوں گی مگر آپ انہیں سمجھا دیجیے گا کہ اگر میں گھر میں دیتا تو وہ کہیں نہ کہیں خرچ ہو جاتے۔''

اسے اس کی ذہانت پر جی بھر کر پیار آیا۔ طمانیت نے دل کا گھیراؤ کیا۔

☆☆☆

وہ فرحان کو پیش قدمی کے لیے کہنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اجالا اپنی ساس کے ہمراہ میکے آ گئی۔

پھپھو ایک خاص مقصد کے تحت آئی تھیں۔ اس مقصد کی سنگینی کا اندازہ اجالا کی یاسیت بھری خاموشی سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ سویرا کو ماحول میں غیر معمولی پن کا احساس چونکا گیا۔ اجالا سے استفسار کیا تو وہ غم کی مجسم تصویر بن گئی۔

''پھپھو رمیز کے لیے تمہارا رشتہ مانگنے آئی ہیں......'' وہ حیران ہوئی۔

''ابا نے کیا جواب دیا ہے؟''

''انکار ہی کیا ہے۔ مگر وہ کسی طور پیچھے نہیں ہٹ رہیں۔'' کچھ باتیں وہ دانستہ اس سے چھپا گئی۔ اس کا اندازہ اسے صبح پھپھو اور ابا کی گفت و شنید سے ہوا۔

''میں نے اجالا کو دوبارہ اسی مقصد کے تحت بھیجا مگر تم نے ایک بار بھی میرا بھرم نہ رکھا۔ مانا کہ رمیز ذرا لاپروا ہے، کام میں دھیان نہیں ہے مگر شادی کے بعد سر پر ذمہ داری پڑے گی تو خود ہی عقل ٹھکانے نے بٹھا کر کھلایا ہے جو تمہیں اس قدر لاحق ہے؟''

انہوں نے بیمار بھائی کا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے کھلے الفاظ میں بات کی۔

''تمہیں تو غنیمت جان کر سو شکرانے کے نفل ادا کرنے چاہئیں کہ میں تمہاری ایک بیٹی کو بھگتنے کے بعد دوسری کے لیے دست سوال دراز کر رہی ہوں۔ رشتے تو میرے رمیز کو ہزاروں مل جائیں گے میں بھی نہ آتی اگر دل میں بھائی کے لیے درد نہ چھپا ہوتا مگر یہاں بہن کی پرواہ کسے ہے؟ ارے! باہر جانے والی لڑکیوں کو تو کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے۔ تمہیں بستر پر پڑے پڑے کیا خبر باہر نکلنے والی لڑکیوں کے چھن کس قدر خراب ہیں اور سونے پر سہاگہ کہ ماں کا کردار بھی ایسا خوب تھا کہ......''

''بس کر جمیلہ! چپ ہو جا۔'' ابا نے بہن کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ ان پر رتی بھر اثر نہ ہوا۔

''لو میں نے کون سی غلط بات کہہ دی ہے؟ ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ بھائی! صاف سی بات ہے۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ اگر بیٹی بیاہ دی تو گھر کے اخراجات کون پورے کرے گا؟ تمہارا نالائق فرزند تو کسی کام کا نہیں۔ درست بات ہے کہ بیٹیوں کی کمائی منہ سے لگ جائے تو کہاں انہیں رخصت کرنے کو دل مانتا ہے...... میں ہی پاگل ہوں جو آنکھوں دیکھی مکھی ترس کھا کر نگل گئی اور اب دوبارہ منہ اٹھا کر بھائی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آ پڑی۔ دیکھو بھائی! تم بڑے ٹھہرے سو لحاظ کر رہی ہوں۔ آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہ رہا۔''

وہ باآواز بلند گوہر افشانیاں کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اپنی ترنگ میں یہ بھی نہ دیکھا کہ بوڑھے و لاغر سے ابا کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائیں اور وہ بے بسی سے اپنا سر تھام کر بیٹھ گئے تھے۔

اماں خاموش تماشائی بنی، کسی مصلحت کے تحت ضبط کے کڑے امتحان سے گزرتی باورچی خانے میں مصروف تھیں۔

نہیں دیتے کہ ہم سویرا کو رخصت کریں اور دوسری بات یہ ہے کہ ہماری بیٹی میں نہ کوئی عیب ہے، نہ کمی کہ تیرے رمیز سے اس کا بیاہ کر کے اسے ساری عمر کے لیے مشقت کی بھٹی میں جھونک دیں لہٰذا تو اپنا مدعا واپس لے کر بھول جا کہ کوئی بات بھی ہوئی تھی۔"

اماں کا لہجہ احتیاط کے باوجود درشتی اختیار کر گیا تھا۔ پھپھو کے تو پاؤں سر پر لگی تھی اور تلوؤں پر بجھی تھی۔ فوراً تیھے سے اکھڑ گئیں۔

"بیٹی دو پیسے ہاتھ پر کیا رکھنے لگی ہے، آسمان کا تارہ دکھنے لگی ہے۔ ارے! میرا رمیز بھی تو رمیز جیسی عادات و اطوار کا مالک تھا مگر بڑی بیٹی کو تو آنکھیں بند کر کے بیاہ دیا تھا کہ پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی۔ وہ تو ہماری رحم دلی تھی کہ باقاعدہ ملنے بھیجتے رہے۔ تمہاری کماؤ دھی رانی کو تو کوئی اعلا عہدے دار بیاہنے آئے گا۔ تم اپنی دونوں بیٹیوں کو اپنے پاس سنبھالے رکھو۔ میں تو اس تکرار سے عاجز آ گئی۔"

سب کے لاکھ روکنے کے باوجود وہ اپنا بیگ سنبھالے اکیلی ہی اجالا اور بچوں کو چھوڑ کر گھر روانہ ہو گئیں۔

یہی بات ان کے لیے باعث تشویش ثابت ہوئی تھی۔ اجالا نے شوہر سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی ماں کے فیصلے پر سر دھنے بیٹھا تھا کہ جب تک مطلوبہ جواب نہ پائیں گے وہ اور بچے وہیں رہیں گے۔ ماں کے کسی بھی فیصلے سے انحراف وہ نہیں کر سکتا تھا۔

مسئلہ بے حد گمبھیر ہو چکا تھا۔ سبھی چہروں پر پریشانیاں تھیں۔ بیاہی بیٹی گھر آ بیٹھے تو ماں باپ کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔

اجالا سب سے نظریں چرائے مجرم بنی رہتی۔ اماں کے لیے اوپر تلے کے پانچ بچوں کی ضروریات پوری کرنا مخصوص قلیل رقم میں، دو بھر ہو جاتا۔

باہمی سوچ بچار کے بعد اماں ابا نے اجالا سے بات کی تھی۔ ایک بیٹی کا گھر بچانے کے لیے دوسری کو قربان کرنے کا قصد باندھ چکے تھے مگر اجالا سن کر فوراً

"نہیں، میں اپنا گھر بچانے کے لیے سویرا کی زندگی داؤ پر نہیں لگاؤں گی۔" شاید وہ ان کے ارادے کو فیصلے میں بدل دیتی اگر سویرا کی دلی امنگ اور آرزو سے واقف نہ ہوتی۔ وہ کیونکر اپنی غرض کے لیے اپنی بہن کے ارمانوں پر پانی پھیر سکتی تھی۔

زندگی ایک بار پھر خاموشی کا لبادہ اوڑھے سرکنے لگی۔ دن، ہفتوں اور ہفتے مہینے کی چادر اوڑھنے لگے۔

☆☆☆

کئی مہینوں سے وہ اس کی بے رخی سہہ رہا تھا۔ وہ اسے اتنا تو جان ہی چکا تھا کہ وہ کسی ذہنی کشمکش کا شکار ہے۔

اوائل ایام وہ اس کے استفسار پر ٹال جایا کرتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اس سے گریز کرنے لگی تھی۔

اکثر اس کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھتیں تو کسی انہونی کا خوف اس کی کنپٹیاں سلگا دیتا۔ دل دہلتا اور وہ مضطرب سا بے قرار ہو اٹھتا۔ اس کا گریز بے وجہ ہرگز نہ تھا۔

☆☆☆

وہ کمرے میں اندھیرا کیے بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے متواتر آنسو جاری تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب وہ اپنے جیسے کی خوشیوں کے گلاب چن کر دامن میں سجا سکتی تھی۔ مگر یہ ایک ماضی کا خواب تھا، ایک خیال تھا۔ حال یکسر مختلف تھا۔

اپنی بہن کی آنکھوں کی یاسیت اس کے دل میں ہر لحظہ ہلچل مچائے رکھتی تھی۔ اس کے بچوں کی ویران صورت، ماحول کے بدلاؤ کے سبب چڑچڑاپن اور اپنا غبار نکالنے کے لیے اجالا کا بلاوجہ انہیں زدوکوب کرنا اسے ہیجان زدہ کر دیتا۔

فیصلہ تو وہ کر چکی تھی۔ یہ سوگواری تو اس ملال کی تھی جو دل میں درد کی صورت بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اپنی محبت سے دست برداری کا کرب آنکھوں کی چبھن بڑھا رہا تھا۔

وہ وقت کا تعین کیے بنا نجانے کب تک خاموش

☆☆☆

"سنو!" وہ آفس جانے کے لیے تیار کھڑی تھی کہ اجالا کی پکار پر پلٹی۔ استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"فرحان سے کہو اپنے گھر والوں کو بھیجے۔" وہ ٹھٹکی۔

"کیوں؟؟؟"

"تاکہ تمہیں اپنے گھر خوش و خرم دیکھ کر ہماری زندگیوں میں بھی مسرت کی لہر دوڑ سکے۔" بہت بودا جواز تھا۔

"کوئی کسی کی خوشیوں کی ضمانت دے سکتا ہے؟"

"امید تو رکھی جا سکتی ہے۔" امید کی ڈور تھامنی چاہی۔

"زندگی سے امید رکھنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔" دور کی نہیں تھی۔

اجالا اس کے لہجے میں تاسف، ملال، یاسیت کیا کچھ نہ محسوس کر پائی تھی۔ وہ ساکت رہ گئی۔

☆☆☆

"کس جرم کی سزا دے رہی ہو مجھے؟" اس دن اس نے اسے جا لیا تھا۔ لاتعداد میسجز کے جواب میں اس کی مسلسل خاموشی نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔

"میں تمہیں سزا دینے والی کون ہوتی ہوں؟" اجنبیت بھرا لہجہ، آنکھوں میں اجنبیت بھرے رنگ...... وہ تڑپ ہی تو اٹھا تھا۔

"اتنی اجنبیت کیوں برت رہی ہو؟ تعلق بے نام ہی سہی مگر اتنا گہرا ضرور ہے کہ تمہاری اس بے وجہ خاموشی اور گریز کی وجہ جان سکوں کیوں کہ تمہارے رویے نے وقت کو جیسے ساکت کر دیا ہے۔ ہر طرف تمہاری بے رخی ٹھہری ہوئی ہے۔ وقت آگے بڑھتا ہے اور نہ ہی منظر بدلتا ہے۔"

جواباً وہ خاموش رہی تھی۔ اس کے لہجے کا کرب، بے کلی، چبھن، بے قراری و خدشے وہ لحظہ بھر میں دور کر دینا چاہتی تھی۔

وہ اس لمحے میں کرب کی لکیر بھی عیاں ہونے کی متحمل نہ تھی اور اس وقت وہ کرب کی مکمل تفسیر

لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں اس قدر سرخ تھیں کہ ان سے برستے شعلوں نے اس کے گال دہکا دیے تھے۔ دھند ہر سو چھانے لگی تھی کہ دفعتاً اس نے بے وجہ کئی مرتبہ پلکیں جھپکا کر آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا۔

اس وقت وہ گویا قوت گویائی کھو بیٹھی تھی۔ وہ وہاں رکی نہیں تھی دو قدم پیچھے ہٹی، وہ کئی میل دوری کا فاصلہ طے کر گئی تھی۔

گھر آ کر اس نے اماں اور ابا کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

"آپ لوگ پھپھو سے کہہ دیجیے! ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔"

اجالا نے سنا تو آڑے ہاتھوں لیا۔

"جس بھٹی میں، میں چپ چاپ آٹھ سال جلی ہوں۔ تمہارے وہاں قدم نہیں پڑنے دوں گی۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"باپ کا گھر چاہے جیسا بھی ہو، بچے وہیں پروان چڑھتے، زندگی کو مکمل پاتے ہیں، ان کی آئندہ زندگی اور پر اعتماد شخصیت کو پروان چڑھانے کے لیے ہم دونوں کو ہی وہاں قدم رکھنا ہوگا۔"

اجالا گنگ اسے دیکھے گئی۔ وہ مضبوط لہجے میں پھر گویا ہوئی۔

"جو غلطی ہماری ماں نے کر کے ہماری اور اپنی زندگی میں خلیج پیدا کی تھی۔ کم از کم وہی غلطی تم مت دہراؤ۔ والدین کی باہمی سنگت ہی اولاد کو معاشرے میں قدم مضبوط رکھ کر چلنا سکھاتی ہے۔"

اجالا کی آنکھیں احساس تشکر سے جھلملا گئیں۔

کبھی کبھار اپنے احساسات، خواہشات اور جذبات قربان کر کے دوسروں کی خاطر مثبت فیصلہ ہی دلی اطمینان اور خوشنودی کا سبب بنتا ہے۔ وہ مطمئن انداز میں سوچتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆

ایک ایسی بات اس نے یوں کہی ہے
چھپانے سے جو ظاہر ہو رہی ہے!

جفاؤں کا ہے جس کو وہ نام دیتا
یہ کس کی آہ اس کو آ لگی ہے؟

میں اس کے سامنے بکھری نہیں ہوں
بہادر ہوں یا پھر یہ بزدلی ہے

گرم جوشی سے ملتا ہے بہت وہ
یہ کیسی دشمنی اس سے ہوئی ہے

میں جب سے زندگی جینے لگا ہوں
اسے مرنے کی چاہت ہو گئی ہے

بہت اچھی طرح سے وہ مجھ کو جانتا ہے
تو پھر کیوں بے اعتباری سی ہوئی ہے

میں اس کے مسکرانے کی وجہ ہوں
کیوں اس کی آنکھ میں اتنی نمی ہے؟

کرن حنا

محبت، عشق، چاہت صرف برباد
کرتے ہیں
محبت چھوڑ دو یارو
نہ لکھو شدھ چاہت کے، وفا اور جفا کو
تم نہ اپنے درمیاں لاؤ
زمانے کو ابھی اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھو تم
ابھی کچھ اور پرکھو تم
ابھی کچھ اور جانو تم
محبت بھی بھلا اپنے گھنے سائے کسی پہ وا
کرتی ہے
یہ ایسی آگ ہے جو ہنستے بستے آنگنوں کو
بھی برباد کرتی ہے
محبت کے عشق کے سفر میں بھی کوئی منزل
تلک پہنچا
یہ جذبے بھلا کب کسی کے دل کو شاد کرتے ہیں
یہ بس ناشاد کرتے ہیں
محبت عشق اور چاہت صرف برباد کرتے
ہیں

وقار احمد امر

اک پھول میرے پاس تھا، اک شمع میرے ساتھ تھی
باہر خزاں کا زور تھا، اندر اندھیری رات تھی

کچھ تو کہو تم نے کہاں کیسے گزارے روز و شب!
اپنے نہ ملنے کا سبب تو گردشِ حالات تھی

اک خامشی تھی تربتر دیوار و در گاں سے ادھر
پہنچا ہوا پیغام تھا، برسی ہوئی برسات تھی

سب پھول دروازوں میں تھے سب رنگ آوازوں میں تھے
اک شہر دیکھا تھا کبھی، اس شہر کی کیا بات تھی

یہ ہیں تنے لوگوں کے گھر سچ ہے اب ان کو کیا خبر
دل بھی کسی کا نام تھا، غم بھی کسی کی ذات تھی

احمد مشتاق

وہ نہیں تو ڈستا ہے، بام و در کا سناٹا
اُف یہ دل کی ویرانی، یہ نظر کا سناٹا

خوش خیال لوگوں کو، بدگماں نہ کر ڈالے
کچھ ادھر کی خاموشی، کچھ اُدھر کا سناٹا

کاش کوئی پڑھ سکتا، کاش کوئی سن سکتا
شام کی شفق میں تھا رات بھر کا سناٹا

دوستی بڑی نازک چیز ہے زمانے میں
دے گیا ہے اک لمحہ، عمر بھر کا سناٹا

جن کی کھڑکیوں میں کل ماہتاب ہنستے تھے
اب ان ہی مکانوں میں ہے کھنڈر کا سناٹا

دل کو کیسے سمجھاؤں، بھولتا نہیں دانش
اک سفر کی کچھ باتیں، اک سفر کا سناٹا

احسان دانش

نئی لیلیٰ، نیا مجنوں

دادا اور دادی نے اپنی جوانی کے یادگار دنوں کو پھر سے تازہ کرنے کا سوچا۔ انہوں نے پروگرام بنایا کہ ہم ماضی کی طرح دریا کے کنارے ملیں گے۔ دادا جان خوب بن سنور کر اور ہاتھ میں پھول لے کر دریا کنارے چلے گئے۔ انہوں نے ٹھنڈی ہواؤں میں دادی کا انتظار شروع کر دیا۔ انہوں نے بہت انتظار کیا مگر دادی کو نہ آنا تھا، وہ نہ آئیں۔ دادا جان کو بہت غصہ آیا۔ جب وہ سخت ناراضی کے عالم میں گھر پہنچے تو دادی کرسی پر بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔

دادا نے پوچھا۔ ”تم آئی کیوں نہیں؟“

دادی نے دوپٹے کا کونا مروڑتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ ”کیا کروں، میں بڑی مجبور تھی۔ امی نے آنے کی اجازت نہیں دی۔“

دودھ کا جلا

حوالدار نے تھانیدار کو فون کیا۔ ”جناب عالی! ادھر ہمارے علاقے میں قتل کا جرم ہوا ہے۔ ایک عورت نے اپنے خاوند کو بیلن مار مار کر قتل کر دیا ہے۔“

تھانیدار نے دریافت کیا۔ ”ایسی کیا وجہ تھی؟“

حوالدار نے بتایا: ”جناب عالی، ملزمہ نے فرش کو تازہ تازہ صاف کیا تھا اور فرش ابھی گیلا تھا کہ اسی اثناء میں اس کا خاوند جوتوں سمیت کچن کے اندر آ گیا۔“

تھانیدار نے پوچھا۔ ”مجرمہ کو گرفتار کر لیا ہے؟“

حوالدار نے کہا۔ ”نہیں جناب! وہ ابھی تک کچن میں موجود ہے۔“

تھانیدار نے غصے سے کہا۔ ”مگر کیوں؟“

حوالدار نے جواب دیا۔ ”جناب! ہم انتظار کر رہے ہیں کہ پہلے کچن کا فرش خشک ہو جائے۔“

پیش بندی

ایک خوب صورت عورت ایک مرد کے ساتھ مہنگے ہوٹل میں کینڈل لائٹ ڈنر کر رہی تھی کہ اچانک ویٹر کے دیکھتے ہی دیکھتے آدمی نے بڑی آہستگی سے کرسی کھسکائی اور میز کے نیچے گھس گیا مگر عورت بے نیازی سے اپنی کرسی پر بیٹھی رہی۔ ویٹر نے گھبرا کر عورت سے کہا۔ ”میڈم آپ کے شوہر میز کے نیچے چلے گئے ہیں۔“

خاتون نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”نہیں میرا شوہر تو سامنے سے آ رہا ہے۔“

ڈراپ سین

ہڈیوں کے دو بڑے ڈاکٹر حسب معمول شام کو ٹہلنے کے لیے نکلے۔ انہیں دور سے ایک آدمی لنگڑاتا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر ایک ڈاکٹر بولا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ اس کے گھٹنے کی ہڈی متاثر ہے۔“

دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔ ”میرے تجربے کے مطابق اس کے ٹخنے میں بری طرح موچ آئی ہے۔“ اتنے میں وہ آدمی قریب آ گیا تو ایک ڈاکٹر نے اسے روک کر پوچھا۔

”کیوں جناب! آپ کے لنگڑانے کا سبب گھٹنے کی تکلیف ہے یا ٹخنے کی موچ؟“ وہ آدمی پریشان ہو کر بولا۔ ”معاف کیجیے گا۔ نہ میرے گھٹنے میں تکلیف ہے اور نہ ٹخنے میں موچ آئی ہے۔ دراصل میری چپل ٹوٹی ہوئی ہے۔“

عینی گواہ

ایک عدالت میں طلاق کا مقدمہ پیش ہوا۔ عدالت نے گواہ سے پوچھا۔ ”جب میاں بیوی کا جھگڑا ہو رہا تھا تو اس وقت آپ کہاں تھے؟“

گواہ نے جواب دیا۔ ”جناب! میں عین موقع واردات پر موجود تھا۔“

جج نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

”جناب میں پنڈت ہوں اور اس وقت شادی کی رسومات انجام دے رہا تھا۔“

نتیجہ

ایک لڑکا شاپنگ مال کی پارکنگ میں سگریٹ پی رہا تھا کہ ایک لڑکی نے اس سے پوچھا۔ ”ایک دن میں کتنے سگریٹ پی لیتے ہو؟“

”کیوں، کیا بات ہے؟“ لڑکے نے ناگواری سے پوچھا۔

”اگر اب تک زندگی میں سگریٹ پر خرچ کیے ہوئے پیسے بچا لیتے تو سامنے کھڑی BMW تمہاری ہوتی۔“ لڑکی نے اک ادائے ناز سے کہا۔

”آپ سگریٹ پیتی ہیں؟“ لڑکے نے سوال کیا۔

”نہیں!“ لڑکی نے اعتراف کیا۔

”تو کیا وہ گاڑی آپ کی ہے۔“ لڑکے نے پوچھا۔

”نہیں!“ لڑکی نے شرمندگی سے جواب دیا۔

”مشورہ دینے کا شکریہ، میں سگریٹ بھی پیتا ہوں اور وہ گاڑی بھی میری ہے۔“ لڑکے نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنز سے کہا۔

(نتیجہ: زیادہ لیکچر دینے سے بے عزتی ہو جاتی ہے حالانکہ لڑکا بعد میں چنگ چی میں بیٹھ کر گیا تھا۔)

تربیت

بچوں کی تربیت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انہیں بھوتوں سے ڈرائیے تاکہ وہ بڑوں سے ڈرنا سیکھیں۔ انہیں عقل نہ سکھائیے کہ عموماً بے وقوف ہی ذہین ہوتے ہیں۔ اگر بچے سوال پوچھیں تو جواب اس انداز میں دیں کہ وہ دوبارہ سوال نہ کر سکیں۔ انہیں سب کے سامنے مت ڈانٹیں بلکہ علیحدگی میں ان کی خوب مرمت کریں۔ انہیں ضرورت سے زیادہ نہیں چلنا چاہیے۔ ورنہ وہ بہت موٹے ہو کر دوسروں کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ اگر بچے ضد کریں تو آپ بھی ضد کرنا شروع کر دیں۔ وہ شرمندہ ہو جائیں گے۔ بچے دس بارہ ہونے چاہئیں تاکہ کوئی بھی لاڈلہ نہ ہو سکے۔ چوں کہ آخری اور سب سے چھوٹا بچہ لاڈلہ ہوتا ہے اور عموماً بگڑ بھی جاتا ہے اس لیے آخری بچہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ (شفیق الرحمن)

موبائل کا نشہ

خدارا اپنے آپ کو موبائل کے زائد استعمال جیسے نشے سے محفوظ رکھیں۔

کل میں واٹس ایپ استعمال کرتا، کرتا ہمسائیوں کے گھر داخل ہو گیا اور ٹی وی لاؤنج میں جا کر بیٹھا تو پتا چلا یہ اپنا گھر نہیں ہے۔ ہمسائے کی بیوی نے بھی موبائل فون استعمال کرتے کرتے پہلے مجھے پانی دیا اور پھر چائے بھی دے دی۔ ساتھ یہ بھی سوال کر ڈالا کہ آج جلدی کیسے؟

میں ابھی اسی وقت میں گم تھا کہ ہمسایہ بھی فون استعمال کرتا داخل ہوا جسے دیکھ کر میں پریشان ہو گیا کہ وہ مجھے اپنے گھر پا کر کیا سوچے گا؟

لیکن جیسے ہی ہمسائے نے مجھے ٹی وی لاؤنج میں چائے پیتے دیکھا فوراً مجھے سوری بولا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جسے کسی جانب سے (کسی پیشے، علاقے، ملازمت وغیرہ سے) کچھ (رزق) ملے تو اسے چاہیے کہ اس (پیشے وغیرہ) کو اختیار کیے رکھے۔"

صلاحیت،

منقول ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رض نے حضرت رافع سے فرمایا۔ (حضرت رافع صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے غلام تھے جنہیں آپ نے آزاد فرمایا تھا۔)
"حکومت قبول نہ کرنا خواہ وہ دو شخصوں پر ہی کیوں نہ ہو۔"

جب حضرت ابوبکر صدیق رض منصب خلافت پر فائز ہوئے تو حضرت رافع رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا۔
"آپ نے مجھے تو حکومت قبول کرنے سے منع فرمایا تھا اور اب آپ نے خود قبول فرمالی۔"
آپ رض نے فرمایا۔ "میں تجھے اب بھی منع کرتا ہوں، اللہ کی لعنت ہو اس حاکم پر جو عادل نہ ہو۔"

ریاکاری،

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، فرمایا۔
"یہ شخص دراصل یہ چاہتا ہے کہ لوگ اسے پہچانیں اور اس کی شخصیت کو دیکھیں۔"
ایک شخص نے حضرت عمر رض سے ہر روز نماز کے بعد لوگوں کو وعظ و نصیحت کی اجازت چاہی، آپ نے اسے اجازت نہ دی۔
اس شخص نے کہا۔ "آپ وعظ و نصیحت سے روکتے ہیں؟"
فرمایا۔ "ہاں! کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اس طرح تو تکبر و غرور میں مبتلا ہو جائے اور اپنے آپ کو تحت الثریٰ میں گرا دے۔"

مصائب،

مصائب گناہوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور گناہ گار کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مصیبتوں کے نزول کے وقت واویلا کرے۔

(امام ابوحنیفہ)

فاخرہ بتول۔ موڑہ دھمیال

توفیق الٰہی،

منقول ہے کہ جب حضرت داؤد نے حق تعالیٰ سے کہا۔
"بارِ الٰہا! میری اولاد میں سے ہر ایک فرد تمام رات نماز پڑھتا ہے اور دن میں ہر ایک روزہ رکھتا ہے۔"
تب وحی نازل ہوئی۔ "اس کی توفیق میں نے ان کو دی ہے جب وہ ایسا کرتے ہیں۔ اب میں ایک لحظہ کے لیے تجھ کو تیری رائے پر چھوڑتا ہوں۔"
چنانچہ حضرت داؤد کو ان کی رائے پر چھوڑ دیا گیا اور ان سے ایسی تقصیر ہو گئی کہ انہوں نے تمام عمر حسرت و پشیمانی میں بسر کی۔

محبت،

☆ جھوٹی محبت کسی بھی لمحے نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
(ٹینی سن)
☆ جس نے بھی محبت کی، اس نے پہلی نظر میں ہی کی۔
(کرسٹوفر مارلو)
☆ محبت اور شک ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔
(خلیل جبران)
☆ دل ایک کانچ کی مانند ہے اس کا ٹوٹ کر جڑنا ناممکن ہے۔
(خلیل جبران)

فریا گل پاکستانی

خیر خواہی،

شیخ عبداللہ خیاط ایک بڑے بزرگ شخص تھے۔ ایک آتش پرست ان سے کپڑے سلواتا اور ہر بار اجرت میں کھوٹا درہم ان کو دے دیتا اور وہ اس کو لے لیتے۔ ایک بار یہ بزرگ کہیں گئے ہوئے تھے۔ شاگرد نے آتش پرست سے کھوٹا درہم نہ لیا جب عبداللہ خیاط واپس آئے اور ان کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے شاگرد سے کہا۔
"تم نے کھوٹا درہم کیوں نہ لیا۔ کئی سال سے وہ مجھے کھوٹی نقدی دیتا ہے اور میں خاموشی سے لے لیتا ہوں تاکہ وہ یہ کھوٹا سکہ کسی دوسرے مسلمان کو نہ دے۔"

بردباری،

احنف بن قیس کو ایک شخص گالیاں دیتا ہوا ان کے ساتھ ہو گیا اور وہ بالکل خاموش رہے۔ جب یہ اپنے محلے کے قریب پہنچے تو رک گئے اور اس شخص سے کہا۔
"اگر کوئی گالی باقی ہے تو وہ بھی دے لو کیونکہ جب میرے متعلقین سنیں گے تو وہ تم کو ایذا دیں گے۔"

منکسر المزاجی،

شیخ ابوعثمان رحمتہ اللہ علیہ کو ایک دعوت میں بلایا گیا تاکہ ان کے تحمل کی آزمائش کی جائے۔ چنانچہ جب وہ صاحب خانہ کے یہاں پہنچے تو اس نے ان کو اندر نہیں جانے دیا اور کہا۔
"کھانا ختم ہو چکا ہے۔"
یہ سن کر آپ واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے ابھی کچھ راستہ طے کیا تھا کہ صاحب خانہ آپ کے پیچھے پہنچا اور آپ کو واپس لے آیا لیکن پھر لوٹا دیا۔ اسی طرح کئی بار آپ کو بلایا اور واپس کر دیا۔ آخر کار صاحب خانہ نے کہا۔
"آپ واقعی ایک عظیم جواں مرد ہیں۔"
آپ نے اس شخص سے کہا۔
"یہ جو کچھ تم نے دیکھا، یہ کتے کی عادت ہے کہ جب اس کو بلاتے ہیں وہ بلانے پر آجاتا ہے اور جب اس کو دھتکارتے ہیں تو واپس ہو جاتا ہے۔ پس یہ کوئی قابلِ قدر بات تو نہیں۔"

عظیم دانشوروں کی خوبصورت باتیں،

- کسی سے اپنی ناراضی کو اتنا طول مت دو کہ وہ تمہارے بغیر ہی جینا سیکھ لے۔
(حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)
- ہر بلا و مصیبت کے پس منظر میں رحمت و نصیحت ہے۔
(حضرت امام حسین رض)
- جس چیز کا علم نہیں اسے مت کہو، جس چیز کی ضرورت نہیں اس کی جستجو نہ کرو، جو راستہ معلوم نہ ہو اس پر سفر نہ کرو۔
(سقراط)
- شیر کا بچہ شیر ہی بنے گا خواہ اس کی تربیت کہیں بھی ہو۔
(فردوسی)
- برے کام اس لیے مضر نہیں کہ وہ ممنوع ہیں، بلکہ اس لیے ہیں کہ وہ مضر ہیں۔
(فرینکلن)
- جب محبت کامل ہوتی ہے تو ادب کی شرط ختم ہو جاتی ہے۔
(جنید بغدادی رح)
- لوہے کا کلہاڑا لکڑی کے جنگل سے ایک چھلکا تک نہیں اتار سکتا، جب تک خود اس کے ساتھ لکڑی کا دستہ شامل نہ ہو۔
(حضرت لقمان ع)
- سچائی کی مشعل جہاں جلتی ہوئی نظر آئے، اس کی روشنی سے فائدہ اٹھاؤ، یہ نہ دیکھو کہ مشعل بردار کون ہے؟
(حکمائے عرب)
- تشکر وہ قرض ہے جس کا ادا کرنا ہم سب کے لیے ضروری ہے۔ لیکن ہمیں دوسروں سے اس

کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔
بالعموم شکوہ دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے۔
اور شکریہ نوکِ زباں سے۔
(انگریزی ادب سے)

کنول شاہین قیصر۔ تلہ گنگ

لوگوں سے میل جول رکھنا،

منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بہت بڑا دانا آدمی تھا جس نے حکمت اور دانائی کی باتوں کی تین سو ساٹھ کتابیں لکھی تھیں۔ آخر کار اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ میرا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بہت بڑا درجہ ہے۔

اس زمانے کے پیغمبر پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ اس سے کہہ دو کہ تو نے روئے زمین پر اپنی شہرت کروا دی ہے۔ میں تیری کسی بھی بات کو قبول نہیں کرتا۔"

اس کے دل میں اللہ کا خوف پیدا ہوا اور اس خیال سے تو بہ کی اور ایک الگ کرتے میں جا بیٹھا اور کہا۔

"اب اللہ تعالیٰ مجھ سے خوش ہو گیا؟"

پھر وحی آئی۔ "میں اس سے خوش نہیں ہوں۔"

تو وہ اپنے حجرے سے باہر آیا اور بازاروں میں جانا اور لوگوں سے میل جول کرنا شروع کر دیا اور ان کے ساتھ نشست و برخاست اور کھانا پینا شروع کر دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی۔

"اب میں تجھ سے خوش ہوں اور تو نے مجھے پا لیا ہے۔"

سنہری باتیں،

☆ اپنے ہمسفر سے اپنے جیسا ہونے کی امید مت کیجیے کیونکہ آپ کسی کا سیدھا ہاتھ، اپنے سیدھے ہاتھ میں پکڑ کر اس کے ساتھ نہیں چل سکتے۔
☆ اگر کبھی مقصد میں ناکامی ہو جائے تو مایوس مت ہوں کیونکہ کسی بھی کتاب میں نہیں لکھا کہ پیروں میں قیمتی جوتے نہ ہوں تو آپ چلنا چھوڑ دیں۔
☆ دنیا کے ہر میدان میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے

لیکن اخلاق میں ہار اور تکبر میں جیت کبھی نہیں ہو سکتی۔

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

اخلاق،

حضرت بایزید بسطامیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک رات آپ قبرستان سے واپس آ رہے تھے اور شہر کے اشراف زادوں میں سے ایک لڑکا "بربط" بجاتا ہوا جا رہا تھا۔

جب وہ آپ کے پاس پہنچا تو آپ نے "لاحول" پڑھی۔ اس نے "بربط" آپ کے سر پر دے مارا۔ "بربط" ٹوٹ گیا اور آپ کا سر پھٹ گیا۔ اس لڑکے کو مدہوشی میں یہ بھی نہ پتا چلا کہ یہ کون ہیں۔

حضرت بایزید جب اپنے گھر چلے آئے۔ صبح ہوئی تو اپنے ایک مرید کو بلا کر "بربط" کی قیمت معلوم کی اور اسے ایک کپڑے میں لپیٹ کر حلوے کی ایک تھالی کے ساتھ اس لڑکے کے پاس بھیج دیا۔ آپ نے مرید سے کہا۔

"اس جوان سے کہنا کہ بایزید معذرت خواہ ہے اور عرض گزار ہے کہ کل جو تمہارا بربط ٹوٹ گیا تھا اس کے بدلے یہ رقم لے لو۔ اور حلوہ کھا کر بربط کے ٹوٹنے سے جو تمہیں رنج ہوا تھا اسے اپنے دل سے نکال دو۔"

جوان کو پتا چلا تو وہ آپ کے پاس آیا اور آپ سے معافی مانگی اور توبہ کی۔ اس کے ساتھ مزید چند جوان بھی تائب ہو گئے۔

شازیہ ہاشم میواتی۔ کھڈیاں خاص قصور

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	عالیہ خان
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

خالد جیلانی

عائشہ اکبر ڈھلو ____ بھکر لیوالی
تم کو دن رات یاد کرتے ہیں
تیرے آنے کی دعا کرتے ہیں۔
کب تم لوٹ کر آؤ گے
یہی ہم انتظار کرتے ہیں

نجیبہ اکرم ____ گاؤں گو لیکی
ایسا گیا کہ پھر نہیں آئی کوئی خبر
دل سے کہا تھا عشق کا حاصل کہیں سے لا

ریحانہ چوہدری ____ مدوکے
انہیں یہ ضد ہے کہ چمن پر مسلط رہے گی خزاں
ہمیں یہ جنوں ہے کہ بہار لا کے چھوڑیں گے

تسنیم کوثر ____ کراچی
ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اس پہ یہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

نمرہ، اقرأ ____ کراچی
اب یہ حالت ہے کہ کہانی میں مجھ کو
میرا کردار دھوکا دے رہا ہے

خدیجہ سارنگ ہراج ____ داؤد والا
اک رات وہ گیا تھا جہاں بات روک کے
اب تک رکا ہوا ہوں وہیں رات روک کے

اقصیٰ ناصر، فضا ناصر ____ گلستانِ جوہر
نہ بات پوری ہوئی تھی کہ رات ٹوٹ گئی
ادھورے خواب کی آدھی سزا میں بیٹھے ہیں

ناہید اسماعیل ____ کراچی
وہ جو کہتا تھا، کچھ نہیں ہوتا
اب وہ روتا ہے، چپ نہیں ہوتا

مسرت الطاف احمد ____ کراچی
کبھی تو شام ڈھلے اپنے گھر گئے ہوتے
کسی کی آنکھ میں رہ کر سنور گئے ہوتے

فوزیہ تمریٹ ____ گجرات
ترے سنگ چاک پہ نرم ہے مری خاک نم، اسے چھوڑنا
کسی ایک شکل میں ڈھال کے مجھے چاک سے نہ اتارنا
مجھے گوندھتے میں جو گم ہوئے ترے ہاتھ، ان کا بدل کہاں
کبھی دستِ غیر کے واسطے، مجھے چاک سے نہ اتارنا

حسنیٰ اقبال ____ منڈی بہاؤالدین
چاہت ہو، خوشی ہو، ادا ہو، تیرے لفظوں میں
مہکی ہوئی ایک شام تیری سالگرہ ہو

فائزہ بھٹی ____ پتوکی
لگتا ہے کئی رات سے جاگا ہے مصور
تصویر کی آنکھوں سے تھکن جھانک رہی ہے

صدف عمران ____ کے ڈی اے سوسائٹی
تو نام کا دریا ہے روانی نہیں رکھتا
بادل ہے وہ بے فیض جو پانی نہیں رکھتا
اپنا آخری خط، آخری تصویر بھی لے جا
میں بھولنے والوں کی نشانی نہیں رکھتا

ثمرہ حبیب ____ گاؤں گو لیکی
بے نور ہو چکی ہے بہت شہر کی فضا
تاریک راستوں میں کہیں کھو نہ جائیں ہم
اُس کے بغیر آج بہت جی اُداس ہے
جالب چلو کہیں سے اُسے ڈھونڈ لائیں ہم

انجل ____ ڈہرکی
وقت ازالہ نہ کر سکا جن کا
لوگ ایسے بھی ہم نے کھوئے ہیں

حافظہ اقرأ جاوید ____ پدھراڑ
لاکھ تجربے کنگال ہو صاحب
واسطہ پڑنے پر ہی کردار کھلتے ہیں

آپ سے جانیں

واصفہ سہیل

تبدیلی

آمنہ شیخ ماڈلنگ اور اداکاری کے علاوہ بچوں اور خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم میں بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ وہ اس وقت پاکستان الائنس فار گرلز ایجوکیشن کی سفیر بھی ہیں۔ جس کا مقصد لڑکیوں کو تعلیم کی فراہمی ہے۔

آمنہ شیخ بچیوں کی تعلیم کے حوالے سے کہتی ہیں کہ...... وہ تعلیم کے حوالے سے سامنے نظر آنے والے اعداد و شمار کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہتیں۔ (پر کیوں......؟) وہ بچیوں کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی تعلیم فراہم کرنا چاہتی ہیں۔ (تو......؟ رکاوٹ کیا ہے بھئی......؟) وہ چاہتی ہیں کہ ملک کا ہر بچہ تعلیم حاصل کرے (خواہش کا اظہار تو سب کرتے ہیں مگر عملی طور پر تو......؟) ان کا کہنا ہے کہ ہم صرف بچیوں کی تعلیم کی بات کرتے ہیں، بچوں پر توجہ کیوں نہیں دیتے (تو اب آپ دیں ناں)

آمنہ شیخ کا کہنا ہے کہ اگر آج ہم بچوں کو تعلیم فراہم کر کے ان کا ذہن تبدیل کریں گے تو آگے جا کر یہی بچے اپنی بہن بیٹیوں کو تعلیم دلوانے کے لیے خود ہی آگے بڑھیں گے۔ (آپ اپنے تعلیمی نظام سے ناواقف ہیں؟ جو یہ بات کہہ رہی ہیں۔) اور آنے والے وقت میں کوئی بچیوں کی تعلیم پر قدغن نہ لگا سکے۔ (اس کے لیے پہلے اپنے نظام تعلیم کو بدلنا ہوگا ورنہ......؟)

اعتماد

ہمایوں سعید اپنی فلم "جوانی پھر نہیں آنی تو" میں اپنے کردار کے بارے میں کہتے ہیں کہ "میرے اندر موجود نوجوان لڑکا (نو...... جوان یعنی......؟) جب تک زندہ ہے تب تک میں ایسے کردار ادا کرتا رہوں گا اور لوگ اسے پسند کریں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں میرا کام پسند نہیں۔ (اس عمر میں آپ کا یہ کام پسند نہیں) لیکن مجھے کوئی فکر نہیں ہے کیوں کہ وہ میری جگہ نہیں ہیں۔ (ہو بھی نہیں سکتے کیوں کہ سب کی اپنی اپنی جگہ ہے)

ہمایوں کا کہنا ہے کہ شاہ رخ خان مجھ سے دس سال بڑے ہیں (ہیں جی...... کیا جی...... اچھا جی!!!) ساٹھ سال کی عمر میں وہ ہیرو آرہے ہیں تو میں تو ان کے سامنے ابھی بچہ ہوں (آہم آہم...... اب ہم کیا کہیں کہ الفاظ کہیں گم ہو گئے ہیں۔) ہمایوں سعید کا مزید کہنا ہے کہ ہر فلم کے ساتھ ہم پر ذمہ داری بھی بڑھتی جارہی ہے۔ میں اپنی پچھلی کامیابی بھول جاتا ہوں اور ہر [illegible] کے بعد پھر سے زیرو [illegible] ہوں۔

شعور

ثنا جاوید کا کہنا ہے کہ "میں نے ہمیشہ وہ کردار منتخب کیے جن میں عورت کو مضبوط اور بااختیار دکھایا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹی وی ایک بہت طاقت ور میڈیم ہے اور ہم اس کے ذریعے عوام کا شعور اجاگر کر سکتے ہیں۔ (آج کل مختلف ٹی وی چینلز پر دکھائے جانے والے ڈرامے کیا عوام میں شعور پیدا کر رہے ہیں؟) یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ عورت کوئی موم کی گڑیا نہیں بلکہ اپنا حق لینا جانتی ہے۔ (کون سا حق ثنا!) وہ مضبوط اور آزاد ہے (کہاں پہ ثنا!)

ثنا نے مزید کہا کہ میں اپنے ڈراموں میں (کون سے ڈراموں میں) ادا کیے گئے کرداروں کے ذریعے خواتین کو یہی پیغام دینا چاہتی ہوں کہ ہمیں اپنے حقوق کے لیے لڑنا ہوگا اور ناانصافی کے خلاف آواز بھی اٹھانا ہوگی (ویسے ثنا! خیالی دنیا سے باہر آجائیں کیوں کہ آپ کے ڈرامے واقعی ڈراما ہیں......)

خواہش

فیصل قریشی کا کہنا ہے کہ وہ اپنی کامیابی پر خوش ہوتے ہیں (اس میں کیا نئی بات ہے جناب) لیکن ناکامی پر مایوس نہیں ہوتے۔ فیصل قریشی کے مطابق انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ انہیں اتنی کامیابیاں ملیں گی۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان کسی بھی شعبے سے وابستہ ہو اگر دل لگا کر محنت کرے تو اسے اس کی محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔ (تو پھر......؟)

فیصل قریشی کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے کیریر کے دوران بے شمار کردار نبھائے ہیں جو آج بھی لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہیں۔ (مثلاً! بھئی آپ کو کتنے کردار یاد ہیں اپنے) لیکن اب بھی ان کے دل میں یہی خواہش ہے کہ وہ ایسا کام کر جائیں جسے لوگ مدتوں تک یاد رکھیں۔

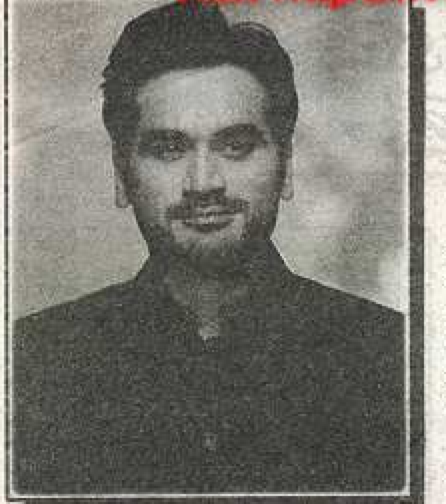

کچھ ادھر ادھر سے

روز محشر ان سوداگروں سے بھی سوال ہوگا جنھوں نے قوم کی بیٹیوں کے سودے کیے اور عافیہ کے ساتھ ساتھ ہم بھی منتظر ہیں اس عدالت کے...... جس کی جیوری نہ بکنے والی ہوگی نہ دبنے والی۔

(افشاں نوید...... نوید فکر)

وزیراعظم ہاؤس کی نیلام کی جانے والی بھینسوں کی اتنی تشہیر کی گئی کہ یہ مذاق ہی بن گیا۔ سرکاری ٹی وی نے پروپیگنڈے کے لیے اور نجی چینلز نے لوگوں کی تفریح طبع کے لیے خوب خوب استعمال کیا۔ بات پاکستانی ذرائع ابلاغ تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ غیر ملکی نشریاتی اداروں نے بھی اس کی خوب منظر کشی کی۔

(سیاست پارے...... فاروق اقدس)

دستک دستک دستک

شاہین رشید

فضیلہ قیصر

"کیا حال ہیں جی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کیا مصروفیات ہیں؟"

"میری مصروفیات تو آپ کو پتا ہی ہیں۔ گھر داری ہے اور شوبز...... اور بچوں کے ساتھ اور میاں صاحب کے ساتھ ٹریولنگ...... کہ کام کر کے تھکاوٹ ہو جاتی ہے اور دل چاہتا ہے تھوڑا آرام کرنے کو، لائف انجوائے کرنے کو۔"

"بالکل دل چاہتا ہے لیکن ملک سے باہر ہی کیوں؟ اپنے ہی ملک میں کیوں نہیں؟"

"بہت اچھی بات تم نے پوچھی۔ اپنے ملک کو تو ہم ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں اور ہر محب وطن پاکستانی کو اپنے ہی ملک کو اہمیت دینی چاہیے۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں "ایشوز" بہت ہیں۔ بے شک ہمارا ملک بے انتہا خوب صورت ہے مگر ان خوب صورت مقامات تک پہنچنا اور پھر وہاں جا کر رہنا بہت مشکل ہے کیونکہ ہماری گورنمنٹ کا سسٹم بہت خراب ہے۔ سڑکیں خطرناک اور ٹوٹی پھوٹی، پھر کھانے پینے اور خالص چیزیں ملنے کا ایشو۔

پہلے حالات خراب تھے۔ حالات صحیح ہوئے تو راستے خطرناک ہیں اور رہائش کا مسئلہ اور پھر ہمارے لوگوں میں، میں نے خاص طور پر یہ بات نوٹ کی ہے کہ جیسے ہی ٹورسٹ کے آنے کا موسم شروع ہوتا ہے ہر چیز کے پیسے بڑھا دیے جاتے ہیں...... تو پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ جائیں کہ یا نہ جائیں۔ جب کہ دیگر ممالک میں وہاں کی حکومتیں سیاحوں کے لیے آسانیاں پیدا کرتی ہیں۔ آپ کے بجٹ میں، آپ کو ہر چیز مل جاتی ہے۔ آپ کو چیزیں جا کر ڈھونڈنی نہیں پڑتیں بلکہ چیزیں خود آپ کے سامنے آ رہی ہوتی ہیں کہ ایسا کریں، یوں کریں۔ مطلب آفرز اتنی پرکشش ہوتی ہیں اور ٹورسٹ کی رینج میں ہوتی ہیں۔

یقین کرو کہ مجھے فیری میڈوز جانے کا بہت شوق ہے، مگر قیصر بتاتے ہیں کہ وہاں کے راستے انتہائی خطرناک ہیں۔ وہ راستہ اس طرح کا ہے کہ ایک ٹریک ہے، ایک گاڑی آتی ہے تو دوسری کو انتہائی کنارے پر بڑا رسک لے کر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف خطرناک کھائیاں ہیں تو دوسری طرف پہاڑیاں ہیں۔ باقاعدہ روڈ نہیں ہے بلکہ کچا راستہ ہے۔

"بہت دل چاہتا ہے اپنے ملک کی خوب صورت وادیاں دیکھنے کو، خوب صورت مقامات دیکھنے کو، مگر لوگوں کے لیے ہر چیز کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔ باہر والے ٹورسٹ کو ویلکم کرتے ہیں جب ہی تو لوگ باہر گھومنے جاتے ہیں۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہماری کسی بھی حکومت نے سیاحت کے شعبے پر توجہ نہیں دی، ورنہ اپنا ملک بھی بہت خوب صورت ہے۔"

"ہمارا ہر شعبہ سیاست کی نذر ہو رہا ہے، اپنے ملک کی سیاست کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟"

"ہمارے ملک کو شروع سے ہی ہمارے لیڈروں نے لسانیت کی بنیاد پر بانٹ دیا ہے۔ لوگوں سے ہماری دوستیاں اور تعلقات زبان کی بنیاد پر نہیں ہیں، بلکہ محبت کی بنیاد پر ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہم ووٹ پارٹی کی بنیاد پر اور زبان کی بنیاد پر دیتے ہیں، ہم کبھی بھی انسان کو دیکھ کر ووٹ نہیں دیتے۔ کبھی بھی کسی بھی نمائندے کو اس کی قابلیت کی بنیاد پر ووٹ نہیں دیتے کیونکہ ہم میں یہ شعور اجاگر ہی نہیں کیا گیا ہے۔ کسی نے روٹی کپڑا مکان کا نعرہ لگایا تو کسی نے پنجاب کا۔ کوئی تبدیلی لانے کی باتیں کرتا ہے تو کوئی سہانے خواب دکھاتا ہے۔ ہر پارٹی نے عوام کو ــــ استعمال کیا ہے تو بس اللہ ہم پر رحم کرے۔"

"ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا ہے میں امریکہ سے واپس آئی ہوں اور یہاں میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ مہنگائی کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ میں نے اپنی اب تک کی زندگی میں اتنی زیادہ مہنگائی نہیں دیکھی۔ ہر چیز پر کئی سو بڑھ گئے ہیں۔ کبھی اتنی تیزی سے مہنگائی ہوتے ہوئے میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ لوگوں میں یہ شعور آنا چاہیے کہ اچھے انسان کو ووٹ دیں، پارٹی کی بنیاد پر یا خواب دکھانے والوں کو ووٹ نہ دیں۔"

"اچھا...... ایک بات تو بتاؤ۔ آج کل ہر جگہ ایوارڈز کی تقریبات ہوتی ہیں، بڑے بڑے چینلز ایوارڈ کی تقریبات کا انعقاد کرتے ہیں۔ آپ ایک بہترین پرفارمر ہیں، کیا وجہ ہے کہ ایوارڈ حاصل کرنا تو دور کی بات ہے۔ نامزدگی میں بھی آپ کا نام نہیں ہوتا؟"

"ایمان داری سے بتاؤں تو مجھے خود نہیں پتا کہ ایسا کیوں ہے۔ آپ صحافی ہیں اور دیگر صحافی، آپ لوگ ہی معلومات کر سکتے ہیں کہ ایوارڈز میں بہت سے سینئرز اور اچھے اور آپ کے پسندیدہ فنکاروں کو ایوارڈ کیوں نہیں ملتے۔

میں تو کام میں اپنا سو فیصد دیتی ہوں، پھر بھی میں بہت حیران و پریشان ہوتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ ہو سکتا ہے کہ مجھ میں ہی کوئی کمی ہو یا میری پرفارمنس میں کوئی کمی ہو گی۔ دوسرے لوگ مجھ سے زیادہ بہتر کام کرتے ہوں، آپ لوگ جو میری پرفارمنس کو پسند کرتے ہیں، مجھے بتائیں کہ کہاں میری پرفارمنس صحیح نہیں ہوتی تاکہ میں اس کمی کو پورا کروں۔"

"مجھے اگر کمی نظر آ رہی ہوتی تو شاید میں یہ سوال نہ کرتی اور ایوارڈ ملنا تو دور کی بات ہے، تم تو تقریب میں نظر بھی نہیں آتیں؟"

"واہ بھئی آپ تو بڑے غور سے پروگرام دیکھتی

مجھے دیکھنا چاہتے ہیں اور میں ان ہی کے لیے کام بھی کرتی ہوں۔ کچھ عرصہ قبل میں امریکہ میں تھی، تم یقین کرو کہ لوگوں نے اتنا زیادہ پیار اور عزت دی کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ وہاں کے لوگوں کو میرا ہر ڈراما، ہر کردار یاد تھا۔ اس سے بڑا اور کون سا ایوارڈ ہوگا میرے لیے۔ خیر میں ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتی، بس اللہ تعالیٰ صحت و تندرستی دے، رزق حلال کمانے کی توفیق دیے رکھے۔ میرے بچوں اور میرے میاں کو سلامت رکھے اور صحت والی لمبی زندگی دے، اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔ اللہ کا ہاتھ ہم پر ہو اور وہ زندگی میں کوئی پریشانی نہ دے، سوائے اپنے کسی کا محتاج نہ کرے، آمین۔"

او کے فضیلہ! ان شاء اللہ پھر بات کرتے ہیں۔

عجب گل

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
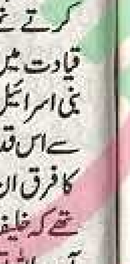
Herbal
سوہنی شیمپو
SOHNI SHAMPOO
اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
قیمت -/120 روپے
رجسٹری سے منگوانے پر اور منی آرڈر سے منگوانے والے
دو بوتلیں -/300 روپے تین بوتلیں -/400 روپے
اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔
بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ
بوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔
دستی خریدنے کے لیے:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

دیکھا آپ کو، ہمیشہ کی طرح پرفارمنس لاجواب تھی۔ آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"ایک آرٹسٹ کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں، وہی ہماری مصروفیات ہیں۔"

"پھر بھی؟"

"پھر بھی یہ کہ ڈرامے بھی چل رہے ہیں، فلمیں بھی چل رہی ہیں۔ 2018ء سے ہم نے پشتو فلمیں بنانے کا آغاز بھی کر دیا ہے، ان ہی میں مصروف ہیں۔"

"اب تو ہمارے اپنے ملک میں بھی بہت اچھی فلمیں بننے لگی ہیں، آپ نے دیکھی ہیں تو آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ہاں، سنا ہے کہ بہت اچھی فلمیں بن رہی ہیں اور سینما کا ریوائیول ہوا ہے، مگر سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے ان فلموں میں سے کوئی ایک فلم بھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔"

"اچھا...... مگر کیوں؟"

"ٹائم ہی نہیں ہے۔ میں تو اپنی فلمیں نہیں دیکھتا تو دوسروں کی کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ اپنی فلمیں دیکھنے کا ٹائم نہیں ملتا۔"

"حیرت ہے؟ پھر آپ کو کیسے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی فلمیں اچھی ہیں یا بری اور لوگ آپ کو پسند کر رہے ہیں یا نہیں؟"

"یہ کون سا مشکل کام ہے، جس طرح ہر رائٹر کو پتا ہوتا ہے کہ وہ کیا لکھ رہا ہے، کیسا لکھ رہا ہے۔ اسی طرح مجھے بھی معلوم ہو جاتا ہے اور پھر جو لوگ مجھے فلموں میں دیکھتے ہیں، مجھے پسند کرتے ہیں، وہ مجھے بتا دیتے ہیں کہ فلم کیسی تھی اور آپ کا کام کیسا تھا۔"

"ہوں...... یہ تو ہے، چلیں پھر بات کریں گے۔"

آج ہم آپ لوگوں کو ایک بالکل سچا قصہ سناتے ہیں۔ یہ قصہ ہے تابوت سکینہ کا یعنی وہ صندوق جس سے یہودی سکون حاصل کرتے تھے اور اسے اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ اس صندوق کو بنی اسرائیل (عہد کا صندوق) بھی کہتے تھے۔ اس صندوق کا ذکر سورۃ بقرہ رکوع نمبر ۳۲ میں موجود ہے۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے یہودیوں پر قوم عمالقہ نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے۔ انہوں نے فلسطین کے اکثر علاقے ان سے چھین لیے۔ سموئیل نبی اس زمانے میں بنی اسرائیل پر حکومت کرتے تھے مگر وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔

سرداران یہود یا بنی اسرائیل یہ ضرورت محسوس کرتے تھے کہ کوئی اور شخص ان کا سربراہ ہو جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں لیکن افسوس کہ اس وقت بنی اسرائیل اس قدر جاہل ہو چکے تھے اور غیر مسلموں سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق ان کے دلوں سے نکل چکا تھا۔ وہ بھول چکے تھے کہ خلیفہ تو اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے اور بادشاہ خود آپ اللہ تعالیٰ ہے۔

سو انہوں نے دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی خلیفہ کے بجائے ایک بادشاہ کی فرمائش کی۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ بات یعنی ایک بادشاہ کی حکومت مانگنا پسند نہ آیا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ بات مان لی۔

جب انہوں نے حضرت سموئیل سے ایک بادشاہ کی درخواست کی اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں اس بادشاہ کے ساتھ مل کر ہم دشمنوں سے جنگ کریں تو نبی نے فرمایا "ایسا ہو سکتا ہے کہ تم پر جنگ کرنا اللہ تعالیٰ فرض کر دے اور تم لڑنے سے انکار کر دو۔" تو انہوں نے جواب دیا آخر ہم کیوں نہیں لڑیں گے۔ ہم گھروں سے نکال دیے گئے اور ہمیں ہمارے بیٹوں سے جدا کر دیا گیا یعنی بیٹے قتل کر دیے یا قیدی بنا لیے گئے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کا کہنا مان کر حضرت طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کر دیا تو تھوڑوں کے سوا اکثر نے لڑنے سے انکار کر دیا۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ حضرت سموئیل نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تم پر بادشاہ مقرر فرما دیا ہے تو وہ کہنے لگے طالوت کیسے بادشاہ ہو سکتا ہے وہ تو ایک غریب شخص ہے، ہم مال دار لوگ بادشاہت کے اس سے زیادہ حق دار ہیں۔ ان کے خیال میں بادشاہت بڑے لوگوں کا حق ہے۔ نبی نے ان کو سمجھایا حکومت کے لیے دولت نہیں بلکہ علم اور طاقت کی ضرورت ہے اور ویسے بھی اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکومت دے۔

طالوت علیہ السلام قبیلہ یمن کے ایک تیس سالہ جوان تھے۔ بنی اسرائیل میں ان سے زیادہ خوب صورت کوئی نہ تھا۔ اتنے قد آور کہ لوگ ان کے کندھوں تک آتے تھے۔ اپنے باپ کے گمشدہ گدھے ڈھونڈنے نکلے تھے۔ جب حضرت سموئیل کی قیام گاہ کے قریب پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہت کے لیے منتخب کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بنی اسرائیل کو اکٹھا کر کے ان کی حکومت کا اعلان کر دیا۔ پھر جب بنی اسرائیل نے ان کی حکومت پر اعتراض کیا تو نبی نے فرمایا اس کی حکومت کی نشانی یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس وہ تابوت لائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکون قلب ہے اور جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں۔ یہ صندوق جسے عہد کا

بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے مشرکین اسے جس شہر میں رکھتے وہاں وبائیں پھوٹ پڑتیں۔ آخر کار خوف کے مارے انہوں نے اس صندوق کو ایک بیل گاڑی پر رکھ کر بیلوں کو ہانک دیا۔ وہ صندوق فرشتوں کی حفاظت میں تھا اور بغیر گاڑی بان کے وہ صندوق طالوت علیہ السلام کے گھر پہنچ گیا۔

اس صندوق میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات سے مراد پتھر کی وہ تختیاں تھیں جو طور سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ تورات کا اصل نسخہ تھا جس کو حضرت موسیٰ نے خود لکھوا کر بنی لاوی کے سپرد کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بوتل میں ''من'' بھروا کر رکھ دیا گیا تھا تاکہ آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کریں جو اس نے صحرا میں ان کے باپ دادا پر کیا تھا۔ کیونکہ صحرائے سینا میں جہاں کھانے پینے کو کچھ نہ تھا آسمان سے ''من'' برستا تھا جسے وہ کھا لیتے اور ''سلویٰ'' یعنی خاص پرندے جوان کے لیے بھیجے جاتے اور وہ بھون کر کھا لیتے تھے اور پانی کے لیے بارہ چشمے پتھر سے جاری کر دیے گئے تھے۔ غالباً اس صندوق میں حضرت موسیٰ کا عصا بھی تھا۔

اب حضرت طالوت علیہ السلام لشکر کو لے کر چلے لیکن انہوں نے مناسب سمجھا کہ کھرا کھوٹا الگ کر لیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اس قوم میں اخلاقی اور نفسانی ضبط کم ہے۔ لڑائی کے لیے بہت صبر اور ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ قوم پہلے بھی قوم عمالقہ سے شکست کھا چکی تھی۔ انہوں نے لشکر سے کہا آگے ایک نہر آ رہی ہے جو اس کا پانی پی لے گا وہ میرا ساتھی نہیں رہے گا اور جو پانی نہیں پیے گا مگر ہاتھ کا چلو بھر کر پی سکتا ہے وہ میرے ساتھ دشمنوں سے لڑ سکے گا کیونکہ جو شخص پیاس تک برداشت نہ کر سکے وہ جنگ کی دوسری سختیاں کیسے برداشت کرے گا اور یہ آزمائش انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی رکھی تھی۔

اب جیسے ہی یہ لشکر نہر پر پہنچا جو شاید دریائے ... لوگ ہی پیاس برداشت کر سکے۔ اب جب جالوت اور اس کے لشکر سے سامنا ہوا تو اکثر نے چلانا شروع کر دیا کہ ہم میں آج کے دن جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں۔

پھر ان لوگوں نے جن کا خیال تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ یہ کہا کہ کتنی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ چھوٹی جماعت اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آئی ہے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔

پھر جب طالوت اور اس کے لشکر کا ان مومنین سے جن کی تعداد اصحاب بدر کی طرح ۳۱۳ بتائی گئی ہے۔ سامنا ہوا تو انہوں نے عاجزی سے دعا کی۔

''اے رب ہمیں صبر کے ساتھ ثابت قدم رکھ اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔''

پس اللہ تعالیٰ نے جالوت کے لشکر کو شکست دی اور حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا۔ حضرت داؤد اس وقت کمسن جوان تھے۔ اتفاق سے اس وقت لشکر میں پہنچے جب جالوت بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لڑنے کی دعوت دے رہا تھا مگر بنی اسرائیل میں سے کوئی اس کا مقابلہ کرنے کو تیار نہ تھا۔ حضرت داؤد یہ رنگ دیکھ کر فوراً اس کے مقابلے کو نکلے اور اسے قتل کر دیا۔ اس بہادری نے انہیں اسرائیلیوں کا محبوب بنا دیا۔

طالوت علیہ السلام نے اپنی بیٹی کی شادی حضرت داؤد کے ساتھ کر دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنا پیغمبر اور بنی اسرائیل کا حکمران بنا دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو حکومت بخشی اور عقل مندی عطا کی اور اس کو وہ سکھایا جو چاہا۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کا دور حکومت بنی اسرائیل کا بہترین دور حکومت تھا۔

آمنہ بلوچ
(بہ شکریہ عفت)

☆☆

[illegible]
تین بچوں سمیت علیحدہ ہو گئے۔

س: میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟

ج: میکے میں تیز مرچ مسالے والے کھانے کھائے جاتے تھے جبکہ سسرال میں کم، اور میرے لحاظ سے سسرال کا کھانا پھیکا ہوتا تھا کیونکہ مجھے تیز مرچ والے کھانے کھانے کی عادت تھی۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے خود کو ان ہی کے رنگ میں رنگ لیا۔ میرے تین دیور اور دو نندیں تھیں۔ ایک کی شادی میرے آنے کے چار سال بعد ہوئی پھر کھانا بنانے کی مکمل ذمہ داری مجھ پر آ گئی۔ تو میں ساس، سسر کی بیماریوں کی وجہ سے ان کی صحت کے مطابق کھانا پکانے لگی۔ کھانوں میں ایک جیسی بات یہ تھی کہ کھانا میکے اور سسرال میں سادہ ہی پکتا تھا۔

س: سسرال والوں نے وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟

ج: بڑی بہو ہونے کے ناتے تو میرے حق بھی بہت تھے اور ذمہ داریاں بھی۔ اگر یہ حق ادا کرتے تو میں بھی ذمہ داریاں پوری کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ مگر یہاں مجھے سرے سے اپنی کوئی اہمیت ہی نہ نظر آئی اگر دیور، نندوں کے رشتوں کی بات کروں تو جب میں میکے رہنے کے لیے جاتی تو پیچھے سے دیور یا نند کا رشتہ طے کر دیا جاتا۔ مجھ سے پوچھنے یا ساتھ لے جانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی جاتی، سب کے رشتے یونہی میری غیر موجودگی میں طے ہوئے۔ مجھے اپنی پرواہ نہیں تھی۔ مجھے بس اپنے بچوں کا حق چاہیے تھا۔ جو خاموش رہنے سے ہرگز نہ ملنے والا تھا۔

یہاں سسرال میں اتنے جانور تھے کہ بچے دودھ سیر ہو کر پی سکتے تھے مگر یہاں بھی ساسو ماں نے اپنی کنجوسی کی عادت کو برقرار رکھا۔

''اماں! بیچنے سے پہلے بچوں کے لیے تھوڑا دودھ نکال لیا کریں۔'' میں کہتی۔

بقیہ ناتا جوڑا ہے

بیوی ہو۔ میرے سسرال والوں نے جانور بھی کافی تعداد میں رکھے ہوئے تھے جبکہ میں ان کاموں کی عادی نہ تھی۔ لیکن اب اپنے شوہر کی مدد سے کافی حد تک ایسے کام بھی کر لیتی ہوں۔

س: شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج: کام تو تین چار ماہ بعد سنبھالا جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ میری ساس کنجوس تھیں (اللہ انہیں جنت نصیب کرے) وہ مجھ سے کام اس لیے نہ لیتی تھیں کہ کہیں میں چیزیں ضرورت سے زیادہ استعمال نہ کر لوں، کہیں ہنڈیا میں گھی زیادہ نہ ڈال دوں۔ اگر میں کوئی کام کر بھی لیتی تو نندوں کو پسند نہ آتا۔ وہ میری صاف کی ہوئی چیزوں کی دوبارہ صفائی کرنے لگ جاتیں۔ پھر بس میں صرف اپنے اور اپنے شوہر کے کپڑے ہی خود دھونے لگی اور اپنے کمرے کی صفائی کر لیتی۔ یہ نہ تھا کہ میری ساس ہلاکو خان ٹائپ تھیں۔ بس ان کی کنجوسی کی عادت کبھی نہ چھٹ پائی تھی۔ کنجوسی کا تو یہ حال تھا کہ اگر کوئی مہمان آ جاتا تو ایک نوالہ فالتو نہ بنتا اور اگر قسمت سے بچ بھی جاتا تو خود کھاتیں یا بیٹیوں کو کھلا دیا جاتا۔ جبکہ میرے بچے دادی سے امیدیں لگائے رہ جاتے۔

ہمارے گھر لیموں کے درخت لگے ہوئے تھے جن پر میری ساس کا چوبیس گھنٹے پہرا رہتا کہ کہیں میرا بچے لیموں توڑ کر شکنجبین نہ بنا لیں۔ جس کے لیے مزید چینی کا خرچا بھی ہو گا۔ اتنی کنجوسی تو اللہ تعالیٰ کو بھی پسند نہیں۔ جب میں یہ ساری باتیں اماں جان کو بتاتی تو وہ کہتیں ''بیٹا صبر کرو۔'' اور مجھے سسرال واپس آتے ہوئے بہت سی چیزیں باندھ دیتیں کہ بیٹا جب دل چاہے چپکے سے خود بھی اور بچوں کو بھی کھلا دیا کرنا۔ مگر یہ کہاں چھپ سکتا تھا۔

ساس نندوں کو پتا چلتا تو انہیں اس پر بھی اعتراض ہوتا کہ ہمیں کیوں نہیں دیا۔

"میرے بار بار کہنے پر بچے کے لیے دودھ نکال لیا جاتا اور باقی کے دودھ میں گھڑا پانی کا ڈال دیا جاتا کہ لو بی بی جتنا چاہو مرضی پلاؤ۔"

شوہر تو کبھی بھی ماں کے آگے سر نہ اٹھاتے تھے مگر بچوں کے لیے تو کچھ بولتے...... مگر نہ جی......

بالآخر میں نے تنگ آ کر ہمت کی اور علیحدگی کی بات کر ڈالی کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ بچوں کی دیکھ بھال چھوڑ دی، کھانا کھانا چھوڑ دیا، سب کی طرح طرح کی باتیں سنیں۔ مگر اپنی بات سے ایک انچ نہ ہٹی۔ میاں جی کو سب کچھ منظور تھا سوائے میری ناراضی کے۔ انہوں نے ساتھ دیا اور ہم الگ ہو گئے۔

س: سسرالیوں سے وابستہ توقعات؟

ج: توقعات بس یہ تھیں کہ زمین دار ہیں۔ مالی طور پر کوئی مسئلے مسائل نہ ہوں گے۔ اور جب میں بیاہ کر آئی تھی تو ماشاء اللہ سے ضرورت کی ہر چیز میسر تھی مگر انہیں کسی چیز کو ڈھنگ سے استعمال کرنے کا طریقہ نہ تھا۔ بچت تو بہت کرتے تھے مگر بچت کر کے کچھ بنا نہ سکے۔

س: پہلے بچے کی پیدائش کب ہوئی؟

ج: پہلے بچے کی پیدائش شادی کے دو سال بعد ہوئی میری پہلی بیٹی تھی۔ روایتی سسرالیوں کی طرح میرے ساس سسر بھی اپنی حیثیت کے مطابق بہت کچھ لائے تھے۔ جیسا کہ دیہاتوں میں ہوتا ہے۔ دیسی گھی، شکر، پنیری، کپڑے پیسے وغیرہ اور میں اس بات پر بہت خوش تھی کہ پہلی دفعہ بیٹی ہونے پر سب بہت خوش تھے جبکہ اکثر جاہل لوگ پہلی بار میں بیٹی کو بیٹے پر ترجیح نہیں دیتے۔

س: جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ رہنا؟

ج: وقت اور حالات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ میری طرح ہر انسان ہی اپنی دھن میں خود کو عقل کل سمجھتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یقیناً میں بھی سسرالیوں کو خطا وار لگتی ہوں گی۔ خیر اگر گھر کے ماحول میں ہر فرد کو اس کے حقوق، احساس، اہمیت نہ ملے تو جھگڑوں سے بچنے کے لیے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے علیحدہ ہو جانا بہتر ہے۔ علیحدہ رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنی ذمے داریوں کا احساس ہوتا ہے۔ جو ہر حال میں اسے ہی نبھانی ہوتی ہیں۔ دوسروں کا سہارا کب تک لیا جا سکتا ہے۔

س: سسرال کے ماحول کو تبدیل کرنے کی کوشش؟

ج: ہر طرح سے کوشش کی مگر وہ کہتے ہیں نا جس کو آپ سے ازلی بیر ہو جائے وہ آپ کے ہر کام میں کیڑے نکال ہی لیتا ہے میرے کام میں بھی یوں ہی کیڑے نکلتے رہتے تھے۔ پھر ساس وفات پا گئیں۔ سسر موجود ہیں (اللہ انہیں صحت دے آمین) اب میرے ماشاء اللہ سے آٹھ بچے ہیں۔ سب کو تعلیم بھی دلوائی ہے۔ بڑے بیٹے (سوتیلا) کی شادی بھی کر دی۔ اس سے چھوٹی دو بیٹیوں کی منگنیاں ہو چکی ہیں۔ باقی سب زیر تعلیم ہیں۔ میرے سسرال والے آج تک یہ طعنہ دیتے ہیں کہ سب میری وجہ سے علیحدہ ہوئے ہیں۔ اگر میں علیحدہ نہ ہوتی تو چھوٹے دیور بھی یہ ڈیمانڈ نہ کرتے۔

نافہم لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اسی میں سب کی بہتری تھی۔ لیکن مجھے ان فضول باتوں کی پروا نہیں اور نہ ہی اپنے کیے پر افسوس ہے۔ میری نصیحت ہے کہ عورت چاہے پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ اگر اسے اس کا حق نہیں مل رہا تو اسے اپنے حق کی خاطر آخر تک جدوجہد کرنی چاہیے۔ اور یہ جدوجہد بھی شوہر کے ساتھ دینے سے ممکن ہے۔ ورنہ بے کار، شوہر کا ساتھ دینا ہی اصل زندگی ہوتی ہے۔

میں علیحدہ ہونے کے بعد بھی اپنے ساس سسر کا اتنا ہی خیال رکھتی تھی جتنا کہ پہلے۔ کیونکہ میرے شوہر نے پہلی شرط ہی یہ رکھی تھی کہ میرے ماں باپ کی خدمت اور عزت میں کمی نہیں آنی چاہیے۔ چاہے وہ اخلاق کے جیسے بھی ہوں......" اور مجھے یہ شرط بخوشی قبول تھی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

سرسوں کا ساگ

اجزاء:۔

سرسوں کا ساگ	ایک کلو
پالک	آدھا کلو
بتھوا کا ساگ	ایک پاؤ
سبز مرچیں	چھ عدد
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
پانی	دو کپ

ترکیب:۔

ساگ، پالک اور بتھوا اچھی طرح دھو کر کسی چھلنی میں ڈال کر رکھ دیں تاکہ سارا پانی نکل جائے۔ تمام سبزیوں کو باریک کاٹ لیں۔ کسی بڑے پین میں دو کپ پانی ڈال کر ابال لیں۔ جب پانی ابلنے لگے تو ایک چائے کا چمچہ تیل، سرسوں کا ساگ، پالک، بتھوا، سبز مرچیں اور ادرک ڈال کر اچھی طرح پکائیں۔ اس تمام وقت میں پتیلے کو ڈھکنا نہیں ہے ورنہ سبزیاں اپنی رنگت کھو دیں گی۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو ساگ کو اچھی طرح گھوٹ لیں یا چاہیں تو گرائنڈر میں ہلکا سا پیس لیں۔ جب ساگ اچھی طرح گھٹ جائے تو اس پر لہسن کا بگھار لگا دیں۔ مکئی کی روٹی یا گرما گرم نان کے ساتھ تناول فرمائیں۔

بلوچی سجی

اجزاء:۔

سالم مرغی	ایک عدد
دہی	آدھا کپ
لہسن کے جوے	چار سے چھ عدد
پودینے کے پتے	آدھا کپ
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
ہری مرچیں	چار سے پانچ عدد
زیرہ (بھنا، کٹا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا (بھنا، کٹا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
چاول	ایک کپ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

لہسن کے جوے، پودینہ، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، زیرہ، ثابت دھنیا، نمک اور تھوڑا پانی ڈال کر پیس لیں۔ مرغی کو دھو کر اس پر گہرے کٹ لگا لیں۔ اب ایک پیالے میں دہی، لیموں کا رس، نمک اور پسا ہوا مسالا ڈال کر ملا لیں مسالے کو اچھی طرح مرغی پر لگا کر تقریباً دو گھنٹے کے لیے فریج میں میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ اب مرغی کے پیٹ میں ـــــ چاول بھر کر مرغی کو پہلے سے گرم اوون میں ایک سو پچاس ڈگری پر رکھ کر چالیس سے پچاس منٹ تک بیک کر لیں۔ سلاد اور ٹماٹو کیچپ کے ساتھ مہمانوں کو گرما گرم سرو کریں۔ اوون نہ ہو تو ایک بڑے پتیلے میں ایک کھانے کا چمچہ تیل ڈال کر اس میں مرغی کو رکھ کر اچھی طرح ڈھک کر پکائیں تھوڑی دیر بعد پلٹ دیں ـــــ جب گل جائے تو اتار لیں۔

عرق گلاب کا استعمال

خوبصورتی صرف گورا دکھنا ہی نہیں بلکہ اس کے لیے جلد کا تروتازہ ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔ جبکہ تیز دھوپ اور گرمی کی شدت جلد کی شگفتگی پر بہت تیزی سے اثر انداز ہوتی ہے۔ ایسے میں عرق گلاب چہرے کی جلد کے لیے بے حد مفید ہے۔ یہ جلد کی خشکی دور کر کے جلد کی نمی کو برقرار رکھتا ہے۔ عرق گلاب کا استعمال صدیوں سے چلا آرہا ہے اور آج بھی کئی مصنوعات میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے باقاعدہ استعمال سے چہرے پھٹنے والی جھریوں کا خاتمہ بھی ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں انفیکشن سے بچاؤ اور اینٹی آکسیڈنٹ کی خصوصیات موجود ہیں، لہٰذا یہ ہر قسم کی جلد کے لیے کارآمد ہے۔ عرق گلاب کے چند قطرے کسی بھی کلینزر اور موئسچرائزر میں شامل کر کے استعمال کرنے سے آپ نا صرف اپنی جلد تروتازہ محسوس کریں گی بلکہ اس کے باقاعدہ استعمال سے چہرے کی جلد نرم و ملائم ہو جاتی ہے۔

ملتانی مٹی

ملتانی مٹی بھی۔ ہر قسم کی جلد کے لیے انتہائی مفید ہے۔ اس کے مسلسل استعمال سے رنگت میں نکھار اور چمک پیدا ہوتی ہے۔ عام طور پر ملتانی مٹی سے مختلف ماسک تیار کیے جاتے ہیں۔ جو چہرے کی شگفتگی کو بحال کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ملتانی مٹی چہرے کی اضافی چکنائی دور کرنے کے ساتھ دانوں اور کیل مہاسوں سے بھی نجات دلاتی ہے۔ جبکہ جھریوں کے خاتمے کے لیے بھی ملتانی مٹی مہنگی کریموں اور لوشنز کا ایک بہترین متبادل ہے۔

ملتانی مٹی کو باریک پیس کر اس میں ایک چمچ شہد اور آدھا چمچ پیاز کا رس ملا کر آمیزہ بنالیں اور چہرے پر ماسک کی طرح لگالیں اور خشک ہونے پر نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔ آپ واضح فرق محسوس کریں گی...... اس کے علاوہ سو گرام ملتانی مٹی میں پچاس گرام صندل کی لکڑی کا برادہ اور پچاس گرام کینو کے خشک چھلکے لے کر الگ الگ باریک پیس لیں۔ پھر انہیں یکجا کر کے کسی جار یا پلاسٹک کی تھیلی میں محفوظ کریں۔ ہفتے میں ایک بار یہ سفوف پانی میں ملا کر چہرے پر لگائیں۔ خشک ہونے پر کسی صاف کپڑے کو پانی میں بھگو کر اس سے آہستہ آہستہ چہرہ صاف کریں۔ یہ ماسک جلد کی اندرونی سطح تک پہنچ کر جلد کو تروتازہ اور خوبصورت بنا دیتا ہے۔

گردن کی خوبصورتی

شخصیت میں نکھار کے لیے جہاں چہرے کی خوبصورتی انتہائی اہم ہے وہیں چہرے کے ساتھ ساتھ گردن کی صفائی کا خیال رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔ گردن اور چہرے کی رنگت ہمیشہ ایک جیسی ہونی چاہیے۔ آپ کے چہرے کی رنگت صاف ہونے کے باوجود اگر آپ کی گردن سیاہی مائل ہے یا اس پر نشانات ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ روزانہ اپنی گردن ضرور صاف کریں۔ اگر گردن نہ دھوسکیں تو نہانے سے پہلے چند قطرے ناریل کا تیل لے کر گردن پر مساج کریں۔ اس سے نہ صرف گردن کے گرد جمع میل صاف ہوگا بلکہ گردن کی سیاہی بھی دور ہو جائے گی جبکہ فیشل یا پیچ کا استعمال گردن پر بھی کریں۔ اس سے آپ کے چہرے اور گردن کا رنگ ایک جیسا محسوس ہوگا۔ اس کے علاوہ باہر یا کسی دعوت وغیرہ میں جاتے وقت جب میک اپ کریں تو بیس لگاتے ہوئے اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ بیس کو نیچے گردن تک لگائیں اور (کپڑوں کی مناسبت سے) جہاں تک گردن نظر آرہی ہو وہاں تک بیس اس طرح لگائیں کہ چہرے اور گردن کی رنگت الگ محسوس نہ ہو۔ اگر بالوں کا جوڑا بنانے سے گردن کا پچھلا حصہ نمایاں ہو رہا ہو تو وہاں بھی بیس ضرور لگائیں۔